Scanned with CamScanner

آگے
پیچھے

(دو ناولٹ)

رام لعل

۹۲۲ - کوچہ روہیلا - ترا ہا بہرام
دریا گنج - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

ISBN : 81-85786-75-5

قیمت : ایک سو ساٹھ روپے -/۱۶۰
اشاعت : ۱۹۹۴ء
کتابت : عبدالفتاح بستوی
طباعت : انیس آفسیٹ پرنٹرز۔ نئی دہلی۔ ۲

ناشر : نریندر ناتھ سوز

سیمانت پرکاشن
۹۲۲۔ کوچہ روہیلا۔ ترا ہا بہرام
دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

AAGE PEECHHEY
NOVELETS (1994)

RAMLAL
Rs. 160.00

Seemant Prakashan
(Publishers, Distributors & Exporters)
922, Kucha Rohella Khan, Tiraha Behram
Darya Ganj, New Delhi-110002 (India)

Scanned with CamScanner

پروفیسر آل احمد سرور کے نام۔

آگے

مجھے ایک ضروری کام سے مالیر کوٹلہ جانا تھا۔ بمبئی سے دہلی تک ہوائی جہاز سے۔ وہاں سے آگے کمپنی کی کار سے، جس کا انتظام دہلی آفس نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ مالیر کوٹلہ میں ایک عرصہ سے ایک کیمیکل فیکٹری لگانے کی بات چیت چل رہی تھی۔ حکومت پنجاب کے ساتھ، جو وہاں فیکٹری ایریا میں زمین دینے کے لئے راضی ہو گئی تھی۔ لیکن ریاستی حکومت نے اپنے طور پر جن دو کسانوں کی زمین خرید کر ہمیں دینے کا وعدہ کیا تھا ان میں سے ایک کسان کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اب اس کام میں کچھ قانونی اڑچن پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے اُسی سلسلے میں تازہ صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے مالیر کوٹلہ جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

جب میں ایر پورٹ جانے کے لئے پٹیل ہاؤس کی بیس منزلہ بلڈنگ سے نیچے اُترا تو اُسی وقت میرے پیچھے پیچھے نیرا گپتے ایک اور لفٹ سے باہر آئی اور مجھے پکارتی ہوئی میری طرف جلدی جلدی بڑھی۔

"نندا صاحب! سنیئے ذرا۔"

وہ ہماری کمپنی کے اسٹیبلشمنٹ آفیسر بٹ کی پرسنل اسسٹنٹ تھی۔ میں نے سمجھا اُسے بھی کہیں جانا ہو گا۔ چاہتی ہو گی، اُسے راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔ میری گاڑی میں کبھی کبھی وہ لفٹ مانگ لیتی تھی۔ اور میں اُسے کبھی مایوس نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی کئی کمزوریوں کے باوجود ایک خوش مزاج لڑکی تھی۔ باتونی بھی، دوسروں کو فلرٹ، کر لینا بھی اُسے خوب آتا تھا۔ مجھے کچھ دیر کے لئے اُس کا ساتھ کبھی نہیں کھلتا تھا۔ جب کبھی چپکنے کی کوشش کرتی تو پھر مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ اُسے صاف کہہ دیتا — "تم نے اب بور کرنا شروع کر دیا!"

میں نے اُس کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا — "آؤ، آؤ مس گپتے! کہاں تک جانا ہے تمہیں؟"

لیکن وہ کار کے باہر ہی کھڑی بولی۔ "آپ کو بٹ صاحب نے بُلایا ہے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے دہلی کا بھی۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہونٹوں پر ایک مدھر مسکان چپکا لی۔ آنکھوں میں ایک مسرور چمک بھی بھر لی۔ یہ دونوں باتیں اُس کی شخصیت کی خصوصیات میں شامل تھیں۔

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا — "اوہ گاڈ! پلین پکڑنے میں اب ٹائم ہی کتنا رہ گیا ہے!"

نیرا گپتے پھر بولی۔ "یقیناً کوئی بہت ارجنٹ کام ہوگا۔ جلدی سے جا کر مل لیجئے۔"

میں فوراً باہر آگیا۔ اب ہم دونوں لفٹ میں تھے۔ دسویں فلور پر جا رہے تھے۔ مجھے گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ مسکرائے چلی جا رہی تھی۔ وہ میری ہی اور ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ میں اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میرے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کہیں بٹ صاحب میرا ریزرویشن کینسل کرانے کے لئے نہ کہہ دیں۔ میرا دہلی میں ایک ذاتی کام بھی تھا جس کے لئے فون پر اطلاع دے چکا تھا۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو نیرا گپتے کے ساتھ کچھ جملے بازی ضرور ہو جاتی۔ جب ذہنی طور پر آزاد ہوتا تو میں بھی اسے خوب چھیڑتا تھا۔ وہ بھی چھیڑے جانے پر خوش ہوتی تھی۔

جب میں اوپر جا کر بٹ صاحب کے کیبن کی طرف بڑھا تو وہ خود ہی کیبن سے باہر آتے ہوئے دکھائی دے گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

"مسٹر نند! یہ لیجئے۔۔ اسے بھی لیتے جائیے۔۔۔ دہلی میں ایک انکوائری کر لیجئے گا۔ وہاں تو آپ کو کئی گھنٹے رکنا ہے نا۔۔ یہ کیس بھی ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ میں نے اس میں پوری ہدایات لکھ دی ہیں۔۔۔ راستے میں پڑھ لیجئے گا۔ اب جائیے نہیں تو فلائیٹ مس ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ کیبن میں واپس چلے گئے۔

میں جلدی سے لفٹ کی طرف مڑا تو اسے لفٹ کا بٹن دبا کر روکے ہوئے دیکھا۔

"جلدی سے آجائیے۔۔۔" وہ ہنس رہی تھی۔

لفٹ کے نیچے اترنے کے دوران میں اس نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنے لمبے سفر میں مجھے بھی ساتھ لے لیتے تو کتنا اچھا ہوتا!"

میں اس کے ساتھ اب باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لیکن یہ ضرور سوچا بمبئی کی ساری فلرٹ لڑکیوں کی ادائیں ایک سی ہوتی ہیں۔ وہ بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے اپنے افسروں کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ نیرا گپتے کے بارے میں تو مشہور تھا کہ وہ تین چار افسروں کے ساتھ بہت ہی بے تکلف تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اسے کلبوں اور بڑے ہوٹلوں میں لے جاتے تھے۔ جو ایسا نہیں کرتے تھے لیکن ان کے فلرٹ کرنے پر منہ بنا لیتے تھے انہیں تو وہ کبھی معاف نہیں کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں فرضی قصے مشہور کرتی رہتی تھیں۔

میں اسے لفٹ ہی میں چھوڑ کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور سے کہا،

"اب جلدی سے پہنچا دو بھئی! راستے میں کہیں بھی نہیں رکنا۔"

میں نے وہی فائل ابھی گھٹنوں پر ہی رکھی ہوئی تھی جو بٹ صاحب نے مجھے تھما دی تھی۔ میرا بریف کیس ڈکی میں میرے سوٹ کیس کے ساتھ بند پڑا تھا۔ لیکن میرے اندر ایک کڑھن سی پیدا ہو گئی۔

"کیا مصیبت ہے! ہمارے آفس میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ کسی ایک ضروری کام سے نکلو تو چار کام اور بھی سر پر ڈال دیتے ہیں۔ پہلا کام چاہے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو! اسی وجہ سے ضروری کام پر توجہ کم ہو جاتی

ہے۔ اُس پر پیچھے پیچھے ٹیلی فون کی رسّی اسی طرح دراز رہے گی۔ پوچھا جاتا رہے گا، کام ہوگیا کہ نہیں؟ کب لوٹ رہے ہو؟ وہاں سے سیدھے احمد آباد چلے جاؤ۔ ایک اور ارجنٹ فائیل کوریئر سروس سے بھجوا دی گئی ہے"!

اگرچہ میں نے اسی طرح ٹور کرنے کی جاب از خود لے رکھی تھی۔ مجھے گھومنا پھرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن کام کا غیر متوقع اتفاقی بوجھ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا تھا۔ ایک بار جب میں پورا منصوبہ بنا کر دفتر سے نکل جاتا تھا تو پھر اُسی کے مطابق کام کرنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہیں سے میری ذاتی آزادی کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔ اگر کسی دوسرے شہر کے ذیلی آفس میں میرے باس کا فون آجاتا تو مجھے ایسا لگتا، میری آزادی میں بے جا مداخلت کی جا رہی ہے۔ خدا جانے، اس فائیل میں میرے لئے کیا کیا لکھ دیا گیا ہے!

اچانک میں نے کڑھنا بند کر دیا اور اسی فائیل کو دیکھنے لگا۔

فائیل کے اندر ایک صاف ستھری ٹائپ شدہ درخواست پر کلپ سے ایک خوبصورت و باوقار عورت کی فوٹو لگی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔ وہ وِبھا تھی۔ فوٹو کے نیچے بھی یہی لکھا تھا —— وِبھا پنڈت لیکن مجھے حیرانی بھی ہوئی۔ یقین نہ آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ وہی ہو!

میں اچانک پیش آنے والے ایسے واقعات میں یقین نہیں رکھتا جو صرف ہندوستانی فلموں ہی میں ممکن ہو سکتے ہیں، لیکن مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اب تو یقین کرنا ہی پڑے گا۔

میں کتنی دیر تک اُس فوٹو کو دیکھتا رہا —— وہی کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، کالے گھنے بالوں کے ہالے میں پورا چہرہ اور اُس کے چہرے کا سب سے خوبصورت حصّہ —— اس کی ستواں ناک اور خوبصورت ہونٹ! جو بے حد سینشوئل تھے۔ وہ ایک زندہ وینس کی مورتی تھی۔

وِبھا کو میں اس کے چہرے کی انہی ساری خصوصیات کے ساتھ جانتا تھا۔ اور اسے لِوِنگ وینس، ہی کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ اس سال پہلے ہم نے دہلی یونیورسٹی کے ایک ہی ہال میں بیٹھ کر بی ایس سی کا فائنل ایگزام دیا تھا۔ اگرچہ ہم مختلف کالجوں سے وہاں گئے تھے۔ راجدھانی کے سارے کالج دہلی یونیورسٹی کے ساتھ یعنی ابھی لی ایٹڈ تھے۔ امتحان دینے والے سارے اسٹوڈنٹس ایک ہی سنٹر پر جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے بلا تکلف متعارف بھی ہو جاتے ہیں۔ پہلے ہی وہ ایک دوسرے کا پتہ ٹھکانہ نہ جانتے ہوں یا ایک دوسرے سے آئندہ ملنے کے لئے ایسی کوئی بات پوچھیں لیکن پیپر شروع ہونے سے پہلے اور پیپر ختم ہو جانے کے بعد وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل کر تبادلہ خیالات کرتے ہیں، جیسے ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے ہوں۔

وِبھا کی سیٹ میرے عین آگے ہوتی تھی —— وہ اتنی دلکش تھی کہ امتحان کے دوران بھی میں کتنی کتنی دیر تک اُس کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھتا سا رہ جاتا تھا۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔ ہاتھ بھر موٹی لمبی چوٹی اُس کے کولہوں کے نیچے تک پہنچتی تھی اور اس کا تندرست سڈول بدن جس میں کئی پیچ و خم تھے۔ کئی نشیب و فراز اور اُس کے کانوں میں ہر دم چمکتی، جھولتی ہوئی سونے کی بڑی بڑی جپسی بالیاں اُس کے چہرے پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں —— پتہ نہیں کیوں، بڑی بڑی جپسی بالیاں پہننے والی لڑکیوں کے بارے میں میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ جنسی طور پر بہت بھوکی ہوتی ہیں۔ بے حد ہوسناک لیکن میرے دل میں اس کی

طرف سے کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ ایک دلچسپی ہی تھی۔

جب ہم آخری پیپر دے کر ہال سے باہر نکلے تو میرے دل میں بے اختیار اُس سے یہ پوچھنے کی خواہش اُبھری کہ وہ بی ایس سی کر لینے کے بعد کیا کرے گی؟ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ کبھی کبھی بہت ہی معمولی، بالکل بے ضرر سا سوال پوچھتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور آدمی گھبرا جاتا ہے۔ چاہنے پر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

اُس روز ہم نے اپنے آخری ایگزام کے بارے میں بھی ایک دوسرے سے کچھ نہ پوچھا۔ نہ جانے کیوں؟ پہلے تو ہر روز ہال سے باہر آتے ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے اپنے جوابات ایک دوسرے کے ساتھ ملانے لگتے تھے۔ کسی کسی سوال کے غیر متوقع طور پر پیپر میں شامل کر دیئے جانے پر یا اُس کے حد درجہ مشکل ہونے کی وجہ سے ایک ساتھ، ایک سی ناپسندیدگی یا برہمی دکھایا کرتے تھے۔ اُس کے بعد یونیورسٹی کے کیمپس سے نکل کر الگ الگ سمت کو جانے والی بسوں کے اسٹینڈ کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ جو سڑک کے آر پار بنے ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ ۲۰۔ اے نمبر کی بس سے جاتی تھی اور میں ١٦ نمبر کی بس سے۔ لیکن میں تب تک اپنی بس میں سوار نہیں ہوتا تھا جب تک کہ وہ اپنی بس میں نہیں بیٹھ جاتی تھی۔ اس میں کبھی کبھی میری بس چھوٹ بھی جاتی تھی اور پھر اُس سمت کو جانے والی اگلی بس آدھ گھنٹے کے بعد ہی ملتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایک گھنٹے کے بعد ۔۔۔ میں سڑک کے پار اپنے بس اسٹینڈ پہ خاموش کھڑا اُس کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بھی اپنی طرف کے اسٹینڈ پر کھڑی میری طرف ایک ٹک دیکھتی رہتی تھی۔ ہم ایسا نہیں بھی کرنا چاہتے یعنی ایک دوسرے پر اپنی اپنی اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے تو دم بھر کے لئے منہ پھیر لیتے تھے لیکن اگلے ہی لمحے جب نظر اُٹھاتے تو خود کو ایک دوسرے ہی کی طرف دیکھتا ہوا پاتے تھے۔

اُس وقت مجھے بہت عجیب سا لگتا ۔۔۔ شرم بھی آتی ۔۔۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ لیکن آخری روز ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہو پا رہی تھی۔ گیٹ کے باہر آ کر ہم ایک دوسرے کو ابھی گڈ بائی، کہنے کے لئے بھی تیار نظر نہیں آتے تھے۔ سڑک پر دونوں طرف بے شمار بسیں آ جا رہی تھیں۔ بسوں کے اسٹینڈ خالی ہو جاتے۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر بھر جاتے تھے۔

ہم اس طرح کب تک کھڑے رہیں گے؟

جیسے اس سوال کا جواب ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے پوچھنا چاہتے ہوں۔ اور کوئی بھی یہ نہیں جانتا ہو۔ جانتا بھی ہو تو اسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں رکھتا ہو۔ ہم ایک دوسرے سے چند ہی روز کے لئے اچانک مل گئے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ صرف تعلیمی باتیں کی تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا یہ کافی نہیں تھا۔ ہمیں اور بھی بہت کچھ کہنا سننا چاہیئے تھا۔ اگر پہلے ایسا نہیں کر سکے تو اب کر سکتے ہیں۔ ابھی اسی وقت۔ اور اس کے لئے ہم تیار بھی نظر آتے ہیں؟ لیکن پہل کون کرے؟

میں تو ہمیشہ سے دبُّو رہا ہوں ڈرپوک اور بیوقوف ۔ لڑکیوں کی صحبت چاہتے ہوئے بھی اُن سے دُور بھاگتا رہا ہوں۔ انہیں دور سے، دُزدیدہ نظروں سے یا چھپ کر ہی دیکھنا مجھے اچھا لگا ہے۔ ایسا کر کے بھی دل زور زور سے دھڑکتا تو ہے ہی۔ لیکن اس کے ساتھ بڑی ہیجان انگیزی اور مسرّت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایک بار ایک لڑکی نے مجھ سے بیزار ہو کر مجھے کہا تھا ۔ تم بُدّھو ہو ۔ ہمیشہ بُدّھو ہی رہو گے۔

دو

تب میں دسویں درجے میں پڑھتا تھا۔ انگریزی میں بہت کمزور تھا۔ میری والدہ نے ہمارے پڑوس میں رہنے والے جیل کے ایک ڈاکٹر کی بیٹی سے کہہ کر میری ٹیوشن رکھوا دی تھی۔ وہ بی۔اے کر لینے کے بعد ایم۔اے کی تیاری کر رہی تھی۔ انگریزی ہی کے مضمون کی۔ میں اُس کے پاس ہر روز دن میں کسی بھی وقت پڑھنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ صبح، دوپہر یا شام کو وہ جب بھی خالی ہوتی چھت پر سے آواز دے کر مجھے بُلا لیتی تھی۔

سنتوش پانڈے کا پڑھانے کا طریقہ بہت ہی نرالا تھا۔ ایک تو وہ مجھ سے ہمیشہ انگریزی میں گفتگو کرتی تھی۔ اور مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔ چاہے میں کیسی ہی غلط سلط یا ٹوٹی پھوٹی ہی انگریزی بولوں۔ اس پر وہ میرا کبھی مذاق نہیں اڑاتی تھی۔ بلکہ بہت پیار سے مجھے میری غلطیاں بتا دیتی تھی جو مجھے ذہن نشین ہو جاتی تھیں۔ دوسرے وہ جیل کے اپنے ڈاکٹر باپ سے قیدیوں کے بارے میں سُنے ہوئے عجیب و غریب قصّے بھی سُنایا کرتی تھی۔ ایسا ہر قصّہ میرے لئے بہت دلچسپ اور انوکھا ہوتا تھا۔ میرے لئے قیدی کا تصوّر محض ہی حیران کن ہوتا تھا۔ اور میں سوچتا رہ جاتا تھا وہ کس مٹی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں؟ وہ چوری یا قتل کیسے کرتے ہوں گے؟ جب اُنہیں جیل میں بند کر کے مارا پیٹا جاتا ہوگا یا اُنہیں پھانسی پر لٹکایا جاتا ہوگا تو وہ اپنے دل میں کس طرح محسوس کرتے ہوں گے؟

جیسا کہ سنتوش پانڈے نے بتایا تھا، ایک قیدی بڑا خونخوار تھا۔ اس نے چار ڈاکے ڈالے تھے۔ ابھی ایک قتل کے مقدمے میں اُس کی اپیل ہائیکورٹ میں چل رہی تھی۔ جیل میں کھانے پر جھگڑا کر کے اُس نے ایک وارڈن کو بُری طرح پیٹ ڈالا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اُسے سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر زور سے پٹخ کر مار ہی ڈالتا کہ جیل کے ایک پہریدار نے اُس پر گولی چلا دی تھی۔ گولی اُس کے پیٹ میں لگی تھی۔ جس کے آپریشن کے لئے وہ جیل کے اندر رہتے ہوئے اسپتال میں بھرتی کیا گیا تھا۔ اُسی دوران اُس کی اپیل ہائیکورٹ نے خارج کر دی تھی۔ اور اُس کو پھانسی دینے کی سزا بحال رکھی گئی تھی۔ لیکن اُسے پھانسی پر چڑھانے سے پہلے مہینوں تک اُس کا پیٹ کے زخم کی وجہ سے علاج کیا گیا۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا تھا ــــ "جب وہ اُسے پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ کر ہی چکے تھے تو اُس کا علاج کرانے کی کیا ضرورت تھی ؟"

سنتوش پانڈے نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا ــــ "انسانیت کے نقطۂ نظر سے بیمار آدمی کو صحت یابی سے پہلے پھانسی پر نہیں لٹکایا جاتا۔ یہی ساری دنیا کی حکومتوں کا قانون ہے۔"

"کیا دنیا میں صرف مرد ہی مجرم ہوتے ہیں؟ عورتیں کبھی قانون کو نہیں توڑتیں ؟" میرے من میں جو سوال اچانک پیدا ہوا اُسے میں نے سنتوش کو سُنا دیا۔

"ہوتی ہیں ــــ میرے ڈیڈی کہتے ہیں وہ دکانوں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھانے سے لے کر بعض اوقات قتل بھی کر بیٹھتی ہیں۔ لیکن انہیں پھانسی پر نہیں لٹکایا جاتا۔ عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

میں سنتوش کی طرف بڑی حیرانی سے ایک ٹک دیکھ رہا تھا ــــ اور وہ میری طرف بڑی مسرور آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی باتیں سن کر میرے سامنے جیسے ایک ان دیکھی دنیا کے دروازے کھل جاتے تھے۔ جو ناقابلِ یقین بھی ہوتی لیکن چونکہ مجھے سنتوش پانڈے پر پورا اعتبار تھا اس لئے میں اُس کی کسی بات کو غلط نہیں سمجھتا تھا۔

اُس نے میرے گال پر بڑے پیار سے تھپتھپا لگایا اور بولی ــــ ایک قصّہ اور بھی سناؤں ؟ لیکن تم پڑھو گے کب؟"

میں نے مچل کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ــــ "بس ایک قصّہ اور ــــ اُس کے بعد پڑھائی شروع !"

کچھ دیر تک اُس نے مجھے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے نہیں کھینچنے دیا۔ اور آنکھیں بند کر کے سوچتی رہی ــــ

"ذرا ٹھہرو، میں یاد کر لوں۔"

مجھے ایسا لگا اس نے جان بوجھ کر دیر لگا دی ہے ــــ اُس کے آنکھیں میچ کر سوچنے کے انداز میں ایک شرارت جھلکتی تھی ــــ میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرتی ہوئی دلچسپی کو دبا نہیں سکا ــــ اُس کے ہاتھ کو ذرا سختی سے دبا کر پوچھا ــــ "یاد آیا؟"

"میرے ڈیڈی بتاتے ہیں ایک قیدی عورت بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے بال بھی بہت لمبے تھے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی پیٹھ پر پڑی ہوئی لمبی چوٹی سر کو جھٹکا دے کر آگے گرا لی اور بالکل انجانے میں اُس کی گرہیں کھولنے لگی۔ اس کے لمبے بالوں کو میں اکثر کھلا ہوا دیکھ چکا تھا۔ جب کبھی وہ انہیں دھونے کے بعد سُکھانے کے لئے چھت پر آ بیٹھتی تھی۔

میں نے پوچھا ــــ "اس قیدی عورت کے بال تمہارے بالوں سے بھی لمبے ہوں گے؟ یقین نہیں آتا۔"

یہ سُن کر وہ ایک دلکش ادا سے ہنس پڑی۔ اس کا چہرہ بالکل گلنار ہو گیا جو پہلے ہی کافی سُرخ و سپید تھا۔ اس کی لمبی مخروطی انگلیاں اُس کے بالوں کے پیچ و خم میں پھنسی رہ گئیں۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی سی بولی۔

"میری دادی چاہتی تھیں، میرے بال خوب لمبے ہوں۔ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے ان میں تیل ڈالتیں ــــ اپنے آگے گھٹنوں میں بٹھا کر زور زور سے ملتیں ــــ چٹاک چٹاک میرے سر پر چپتیں بھی لگاتی رہتیں اور اتنے زور سے کس کس کر چوٹی گوندھتیں کہ میرے تو بھئی چیخیں نکل جاتی تھیں ــــ مجھے روتا دیکھ کر میری ماں آ کر

کہتیں ــــ "لڑکی کی جان ہی نکال لو گی اماں!" لیکن دادی کب ماننے والی تھیں ــــ مجھے پیار کرتی ہوئی کہتیں ــــ لڑکیوں کے بال لمبے ہونے چاہئیں یہی ان کا اصلی زیور ہوتے ہیں ــــ عورت کی زلفوں میں اس کا مرد ایک بار پھنس گیا تو پھر مرتے دم تک اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اُس نے اپنے بال کھول کر پشت پر پھینک دیے ــــ اور بولی ــــ "اب اُس قیدی عورت کا قصّہ آگے سُنو۔"

"جی ــــ" میں پھر ہمہ تن گوش بن گیا۔

وہ مرد بھی جس کی اُس عورت کے ساتھ شادی ہو گئی تھی اُس کے بالوں کا بڑا دلدادہ تھا۔ لیکن وہ اُس کی اسی دلکشی کی وجہ سے اُس کا حاسد بھی بن گیا ــــ اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اُس کے بالوں کی وجہ سے کئی اور لوگ بھی اُس کے عاشق بنے ہوئے ہیں۔ اُسے ایک نظر دیکھنے کے لئے اس کے گھر میں تانک جھانک کیا کرتے ہیں۔ وہ گھر سے باہر نکلتی ہے۔ تو وہ لوگ اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ اسی لئے اُس نے اپنی بیوی کو گھر سے نکلنے سے منع کر دیا۔ اس پابندی کو وہ برداشت نہیں کرتی تھی۔ اس بات پر دونوں کے درمیان بہت جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ اُس کا مرد اُسے بڑی بے دردی سے مارتا پیٹتا تھا۔ اُسے اُس کے بالوں سے ہی پکڑ کر آنگن میں گھسیٹتا پھرتا۔ اُسے انہی بالوں کے ساتھ چارپائی کے ساتھ جکڑ کر لٹا دیتا تھا۔ وہ چیختی، چلاتی، فریاد کرتی مگر اُس آدمی کے دل میں ذرا رحم نہیں پیدا ہوتا۔ ایک روز اُس نے طیش میں آکر قینچی اٹھائی اور اپنی عورت کے خوب صورت بال کاٹ ڈالے۔ اُس کی ساری دلکشی ہی ختم کر دی۔ جس سے اس عورت کو بے حد صدمہ پہنچا۔ وہ دن بھر زمین پر اُلٹی پڑی لیٹی رہی اور سسکتی رہی۔ رات کو جب اُس کا مرد سو گیا تو اُس نے اُسی قینچی سے اپنے مرد کی گردن کی شہ رگ ہی کاٹ دی۔"

"کیا واقعی! ایک عورت ہو کر وہ ایسا کیونکر کر سکی؟" میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

"کیوں، عورت ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ وہ اتنی کمزور نہیں ہے۔ اگر اسکے ساتھ ظلم ہو گا تو وہ بھی بدلہ ضرور لے گی۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟"

"اُس نے عدالت میں اپنے جرم کو قبول کر لیا۔ اُسے دس سال کی سزا سنائی گئی۔"

اُس دن میں ٹیوشن نہیں پڑھ سکا۔ پڑھنے میں من ہی نہ لگا۔ بالکل سراسیمہ سا ہو کر بیٹھا رہ گیا۔ سنتوش پانڈے نے میری ڈھارس بندھانے کے لئے بہت سی باتیں کیں ــــ مجھے پیار بھی کیا ــــ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا ــــ

میرے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا تھا کہ کہیں اُسے بھی قیدی عورت کے خاوند جیسا مرد نہ مل جائے! لیکن میں اُس کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار نہ کر سکا۔ کہیں میرے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ نہ ہو جائے۔! یا میری بات سُن کر وہ مجھ سے خفا نہ ہو جائے۔ اور پھر مجھے پڑھانے کیلئے کبھی اپنے پاس نہ آنے دے۔!

جن دنوں میرے سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ میں کئی کئی گھنٹے اُس کے پاس بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا۔

وہ مجھے بہت ہی اچھا پڑھاتی تھی۔ اُس کا بنایا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن نشین ہو جاتا تھا ــــ اُس کا میرے ساتھ بہت اچھا سلوک تھا ــــ اپنے گھٹنے سے لگا کر مجھے بٹھاتی اور کبھی کبھی کسی غلطی پر ہلکی سی چپت بھی لگا دیتی تھی۔ جس میں غصّہ کم اور پیار زیادہ ہوتا تھا۔ میں اُس کے پیار کے سامنے بالکل بے بس ہو جاتا تھا۔ اُس کے پیار میں کبھی کبھی میرا سر اپنی گود میں ڈال کر میرے بالوں میں کنگھی کرنا بھی شامل تھا۔ جس سے مجھے پریشانی بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک اُلجھن سی ــــ جس کا اظہار میں نہیں کر پاتا تھا۔ چونکہ اُسے معلوم تھا مجھے اُس کے بال بہت پسند تھے، اس لئے وہ کبھی کبھی میرے اوپر اپنے بال جھٹک جھٹک کر کوئی منتر پڑھنے لگتی تھی اور پھر مجھے بتاتی تھی ــــ میں نے تیرے لئے دعا مانگی ہے۔ تمہیں لمبے بالوں والی ہی دُلہن نصیب ہو گی ــــ!"

کبھی کبھی کہہ اُٹھتی ــــ "جب تو آگے پڑھنے کے لئے لاہور چلا جائے گا تو میں اپنے بال کاٹ کر تیرے ساتھ کر دوں گی۔ اس طرح تو مجھے ہمیشہ یاد رکھے گا۔ مجھے کبھی بھولے گا نہیں۔"

میں بڑی معصومیت سے جواب دیتا ــــ یہ تو میرے لئے بہت بڑا تحفہ ہو گا۔ لیکن آپ بالوں کے بغیر کیا کریں گی، بُرا نہیں لگے گا؟"

"کیوں بُرا کیوں لگے گا؟ یہ تو پھر اُگ آئیں گے۔ یہ تو اپنے گھر کی کھیتی ہے۔"

لیکن میں اُسے ایسا نہیں کرنے دے سکتا تھا۔ شاید وہ بھی مذاق ہی میں ایسا کہہ دیتی تھی۔

جس روز میں آخری پیپر دے کر آیا، سیدھا اُسی کے پاس چلا گیا۔ میں اُس کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا کہ آج میں نے پیپر بہت اچھا کیا ہے۔ اُس میں مجھے سو فی صدی نمبر ملنے کی اُمیّد ہے۔ جس سے میرا ڈویژن بھی اچھا ہو جائے گا۔

وہ چھت پر دُھوپ میں ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ خلافِ معمول وہ صاف ستھرے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بشرے سے لگتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ میں وہاں جاتے ہی اُس کے پاس گھس کر بیٹھنے لگا تو وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی ــــ مجھے ڈانٹ کر بولی،

"دُور رہنا مجھ سے! دُور دُور!! آج مجھے مت چھونا!"

میں بالکل ہونق بنا اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" میں نے اُس سے الگ کھڑے ہو کر پوچھا۔

وہ کچھ لمحوں تک مجھے گھور گھور کر دیکھتی رہی پھر مجھے سمجھانے کے انداز میں دھیمی آواز میں بولی،

"آج مجھے چھو لیا تو ناپاک ہو جاؤ گے۔ سمجھے؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو پھر پوچھا ــــ وہ کیوں؟"

وہ بھی مجھے فوراً کچھ نہ سمجھا سکی۔ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے لگی۔

"آج میرا پاؤں ایک ہڈّی پر آ گیا تھا ــــ اُسی وجہ سے میں ناپاک ہو گئی ہوں ــــ اب میں تین دن تک اسی

طرح پڑی رہوں گی ــــ اپنے گھر والوں سے بھی الگ تھلگ ــــ کھانا بھی الگ برتن میں مجھے ملے گا۔ یہ دادی کا حکم ہے۔"
میں نے کچھ سوچ کر کہا ــــ "مگر میرے پاؤں کے نیچے تو کئی بار ہڈی آجاتی ہے۔" اور میں اُسے ٹھوکر مار کر کہیں سے کہیں پھینک دیتا ہوں ــــ اور کبھی ناپاک نہیں ہوتا۔"
"تمہاری بات اور ہے پگلے! تم مرد ہو ــــ یہ پابندی صرف عورتوں پر لگائی جاتی ہے۔"
مجھے اُس کی بات کا یقین نہیں آیا ــــ جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہو۔
"کیا یہ بھی آپ کی دادی کا فرمان ہے؟"
اُس گھر میں اُس کی دادی پردھان تھی۔ ہر بات میں اُسی کا حکم چلتا تھا۔ لیکن وہ میرے لہجے کا طنز محسوس کر کے بولی ــــ "دادی ہمارے بھلے کے لئے ہی کہتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے لڑکی کو کھڑے ہو کر نہیں نہانا چاہیئے بیٹھ کر ایسا کرنا چاہیئے تو ضرور اس میں کوئی بھلائی ہو گی۔ وہ تو شام کو جب دو وقت مل رہے ہوتے ہیں مجھے سر کھول کر چھت پر آنے سے بھی منع کرتی ہے۔ کہتی ہے اُس وقت جن بھوت سفر میں ہوتے ہیں اگر کسی لڑکی کے کھلے ہوئے بال دیکھتے ہیں تو وہیں اُتر جاتے ہیں۔"
"پھر بھی کبھی نہ کبھی تو آپ انجانے میں اس حالت میں چھت پر چلی آتی ہوں گی۔ آپ پر کوئی جن بھوت عاشق ہوا؟"
اُس نے مجھے گھور کر دیکھا ــــ پھر ہنس کر بولی ــــ "تجھ سے بڑا جن تو ابھی تک نہیں ملا۔"
میں نے بھی ہنس کر کہا ــــ "اگر میں واقعی جن ہوں تو آپ کو مجھ سے ڈر کیوں نہیں لگتا؟" یہ کہہ کر میں نے اُس کی مرجھائی ہوئی چوٹی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا ــــ
لیکن وہ چارپائی سے کود کر الگ جا کھڑی ہوئی ــــ بولی ــــ "تو بالکل بدھو ہے! ذرا نہیں سمجھتا۔ جا، اب اپنے گھر چلا جا ــــ پر کسی سے میرے بارے میں کچھ مت بتانا!"

اچانک ایک اور ۲۰۰ اے بس آتی دکھائی دی تو وبھانے بھاگ کر سڑک پار کرلی۔ میں نے اُس کا پورا سراپا لہراتا ہوا دیکھا۔ اُس کی لمبی کالی چوٹی بھی ... اور پھر وہ بس کے رکتے ہی ـــ اُس کے پیچھے غائب ہوگئی۔ اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا ـــ جیسے فیصلہ کرچکی ہو! اس کے بعد پھر کبھی نہیں ملنا ہے۔ جب واقعی نہیں ملنا ہے تو پھر ایک دوسرے کی طرف آخری بار دیکھنا بھی کیسا! جب ہم ایک دوسرے کے کوئی بھی نہیں لگتے ـــ ایک دوسرے کے کوئی بھی نہیں ہوسکے ـــ اس بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جبھی کہ ہم کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے۔

کسی کو یاد رکھنا کتنا آسان ہوجاتا ہے۔ لیکن اُسے پوری طرح سے جان لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا احساس میں بہت بعد میں کرسکا۔ جب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ جب آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ بس ایک یاد تھی۔ ایک تصوّر تھا۔ ایک احساس محرومی کہ جسے میں قریب لاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا ـــ نہیں کرسکا ـــ ڈرپوک ہونے کی وجہ سے۔ یا واقعی بدّھو ہونے کی وجہ سے جیسا کہ کئی سال پہلے سنتوش پانڈے نے بھی کہا تھا۔

پھر میں نے ایم ایس سی کرلیا۔ ایک سال ناکام رہ کر ـــ کیونکہ مجھے یرقان ہوگیا تھا۔ ایک سال اور محنت کر کے پاس تو ہوگیا لیکن تھرڈ کلاس میں ـــ کیریئر ایسے تھوڑی ہی بنتے ہیں! یہ تو بس سے چھوٹ جانے والی بات ہوئی۔ اب سوچا ایک ڈپلوما بزنس مینجمنٹ کا کر ڈالوں۔ شاید قسمت یاوری کردے ـــ جب انسان کے اندر کام کرنے اور کچھ سیکھنے کی لگن ہو تو کبھی نہ کبھی کامیابی مل ہی جاتی ہے۔ میرے سامنے ایک شاندار یا معقول مستقبل کا منصوبہ یقیناً تھا۔ ترقی کا خواہشمند تھا۔ اچھی پوسٹوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا ـــ مجھے اپنے اندر لگن پیدا کرنی ہی ہوگی۔!

بزنس مینجمنٹ کا ڈپلوما تو میں نے حاصل کرلیا۔ لیکن ایک سخت مقابلے میں سے گذرنے کے بعد پھر مجھے نانا بھائی پٹیل اینڈ کمپنی میں ایک سروس بھی مل گئی۔ تنخواہ بہت زیادہ نہیں تھی لیکن دوسری مراعات کافی

تھیں۔ سیل کمیشن، سالانہ بونس، بمبئی جیسے بڑے شہر میں ایک فلیٹ بھی اور آفس تک آنے جانے کے لئے کمپنی کی گاڑی بھی۔

اس سارے عرصے میں کبھی کبھی اُس لڑکی کی یاد تو یقیناً آئی ــــ جب کوئی اور اُسی لڑکی جیسی خوشنما نظر آئی ــــ خوشنما اور متأثر کرنے والی ــــ لیکن اُس کا ہیولا ویران آسمان کے کسی کونے میں سفید بدلی کے ایک معمولی سے ٹکڑے ہی جیسا تھا ــــ جو نہ حاوی ہو سکتا ہو نہ برس سکتا ہو ــــ اُس سے پھر کبھی ملنے کی اُمید ہی کیسے کی جا سکتی تھی ــــ جس کا اتا پتا تک معلوم نہیں کیا ہو۔ پھر یہ دُنیا کتنی بڑی ہے ــــ اس میں کتنی زیادہ بھیڑ ہے۔ آدمی ایک بار بچھڑ جائے تو پھر ملنا ناممکن ہو جاتا ہے ــــ جی بہلانے کے لئے آدمی لاکھ سپنے دیکھتا رہے۔ یہ تو ایک فرار محض ہے۔ حقیقت سے بھاگنے کی ایک کیفیت ــــ لیکن جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، وہ بھی ایک حقیقت ہے ــــ ایک سچائی ــــ چاہے یہ غیر متوقع طور پر ہی سامنے آگئی ہے۔ اس پر تو میں یقین کر سکتا ہوں۔ اپنے پچھلے تصوّرات سے دست بردار ہو کر اور کچھ نئے تصورات کو قبول کر کے۔

فائیل میں لگا ہوا دیبھا پنڈت کا فوٹو دیکھ کر مجھے زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ واقعی وہی ہے۔ اگرچہ بدلی ہوئی سی ــــ لیکن پہلے سے کہیں زیادہ دلکش ہو گئی ہے۔ بعض لڑکیاں جو پہلے چھوٹی موٹی سی ہوتی ہیں بعد میں بہت بدل بھی جاتی ہیں۔ جوانی کی سرحد پار کر کے وہ کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔ تب ان کے سراپے میں ان کی معصوم نوعمری ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شادی ہو جائے تو وہ اور بھی بدل جاتی ہیں ــــ جیسے غنچہ کھل کر پورا پھول بن گیا ہو۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کی شادی ہو چکی ہو گی۔

میں اُس کی درخواست پڑھنے لگا۔ وہ چاہتی کیا ہے؟ ہماری فرم میں کوئی ملازمت؟ ہمارے یہاں تو بہت سی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ کرسچین، پارسی، یہودی، مہاراشٹرین، گجراتی، کونکنی وغیرہ۔ جب کبھی کوئی جگہ خالی ہوتی ہم فوراً اخبارات میں اشتہارات چھپوا دیتے تھے۔ اور تاریخ مقررہ پر سینکڑوں با صلاحیت لڑکیاں اپنے اپنے سارٹیفکیٹ لے کر حاضر ہو جاتی تھیں۔ لیکن ادھر تو ہم نے کوئی اشتہار نہیں چھپوایا تھا ــــ پھر بھی دل ہی دل میں کچھ خوشی سی محسوس کر کے دیبھا پنڈت کی درخواست پڑھنے لگا۔ اسے ایک ہی سانس میں پڑھ گیا۔ پھر جیسے ایک صدمے کا شکار ہو کر، سر پکڑ کر رہ گیا۔ فائیل بند کر کے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ میں اُس کے فوٹو کو نگاہ جما کر دیکھ سکتا۔ ڈرائیور کار کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔

میں دیبھا پنڈت کے فوٹو کو پہلے جیسی کیفیت کے ساتھ دیکھنے کی ہمّت جمع کر بھی لیتا تو اُس کی خوبصورتی کو اب اس طرح نہیں سراہ سکتا تھا۔ یہ ناممکن سا ہو گیا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اُس بات کو بھلا دینے کی کوشش کی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے ــــ اب میں کچھ اور دیکھ رہا تھا۔ کار کی کھڑکی سے باہر چوڑی سرمئی سڑک کتنی تیزی سے پیچھے کو سرکتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کی ملٹی اسٹوریڈ عمارتیں کتنی اونچی ہو گئی ہیں! کوئی کوئی عمارت تو اتنی اونچی ہے کہ بالکل آسمان کے سینے میں گڑی ہوئی سی لگتی ہے ــــ جگہ جگہ سڑک پر بنے ہوئے پُل اور فلائی اوور پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں۔ کوئی ہمارے نیچے سے کوئی اوپر اوپر سے ــــ ان کے اندر سے گذرتے ہی ہم جیسے ایک نئی فضا میں پہنچ جاتے ہیں ــــ نئی عمارتیں، نئی سڑکیں، نئے نئے پارک اور ریلوے کے لمبے لمبے ٹریک۔ کچھ ہی لمحوں کے

بعد پھر سارا کچھ ویسے کا ویسا دکھائی دینے لگتا ہے۔ وہی چوڑی سرمئی سڑک پیچھے کی جانب تیزی سے سرکتی ہوئی اور فلک بوس عمارتوں کے فلیٹ، ان کی بالکونیاں اور کہیں کہیں دھوپ میں لہراتی ہوئی رنگ برنگی دھوتیاں اور اُن میں بکھرے ہوئے ہزاروں لوگ، سامنے سے آتی ہوئی کاریں جو سڑ سے پاس سے نکل جاتی ہیں۔ تیزی سے بدلتے ہوئے کانٹوں پر سے ہو کر برق رفتاری سے بھاگتی ہوئیں لوکل ٹرینیں، اُن کے ہر ایک دروازے کے ساتھ لٹک کر جاتی ہوئی بے شمار زندگیاں اور اُن سب کے اوپر اوپر ہو کر اُڑتا، بل کھاتا، بکھرتا اور پھسلتا ہوا اور ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا۔ کارخانوں کی چمنیوں میں سے نکلتا ہوا گاڑھا گاڑھا دھواں! ●●●

جب میں ایئر پورٹ پر پہنچا تو اُس وقت بھی میرے ذہن سے صدمے کے آثار دُور نہیں ہوئے تھے۔ وہ صدمہ جو مجھے وبھا پنڈت کی درخواست پڑھ کر ہوا تھا۔ بمبئی سے دہلی تک کی پرواز کے دوران میں اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ دس سال پہلے میرے ساتھ بی ایس سی۔ کے ایگزام میں بیٹھنے والی لڑکی شادی شدہ ہو چکی ہے، ایک بچّے کی ماں بھی بن گئی ہے اور اُس کے بعد بیوہ بھی ہو گئی ہے۔ اور اب ہماری کمپنی کے کسی بھی برانچ آفس میں ترس کی بنیاد پر سروس مانگ رہی ہے۔ اُس کا شوہر سوشیل پنڈت جو ہماری ہی کمپنی کی چنڈی گڑھ کی برانچ میں اسسٹنٹ مینجر تھا۔ ایک سال پہلے اچانک چل بسا تھا۔

کسی کسی کی زندگی میں کسقدر تھوڑی سی مدّت کے لئے بہار آتی ہے۔ ایک وقتی سہاونے جھونکے کیطرح ۔۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے لُو کی تپش ملنے لگتی ہے اکومل نازک بدن کو جھلسا دینے والی اور چہرے کی ساری تازگی اور خوشگواری پر چھاپہ مارنے والی لُو۔ اُس نے تو ابھی اپنے شوہر سے جی بھر کے پیار بھی نہیں پایا ہو گا۔ خوشگوار ازدواجی زندگی میں دس سال کی مدّت تو پلک جھپکتے گذر گئی ہو گی!

سوشیل پنڈت اور میں ایک ہی دن اس کمپنی کی ملازمت میں آئے تھے۔ جب ہم بمبئی کے ہیڈ آفس میں زیرِ تربیت تھے تو ایک ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں تین ماہ تک مقیم رہے تھے۔ وہ بہت ہی محبّت کرنے والا اور خوش مزاج نوجوان تھا ۔۔ نہ سگریٹ پیتا تھا نہ ہی شراب۔ اُس نے میری تمبّاکو نوشی پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ جبکہ میری ہی وجہ سے ہمارا کرائے پر لیا ہوا ہوٹل کا کمرہ تمبّاکو کی بدبو سے بھرا رہتا تھا۔

جب اُس کی شادی ہوئی تو میں احمد آباد کے آفس میں کام کیا کرتا تھا۔ اُس نے مجھے دعوت نامہ بھجوایا تھا۔ میں نے بھی ٹیلی گرام کے ذریعے اُسے مبارکباد بھجوا دی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اُسی وِبھا سے شادی کر رہا ہے جو میرے سپنوں میں بے اختیار چلی آتی تھی، جسے اب تک مجھے بھول جانا چاہیئے تھا۔

ایک بار مجھے چنڈی گڑھ جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ لیکن صرف ایک دن کے لئے واپسی کے لئے شام کی فلائٹ میرے لئے پہلے سے بُک کرائی جا چکی تھی۔ دن میں میرا سارا وقت اُسی کے آفس میں گذر گیا۔ سوشیل میرے ساتھ ساتھ رہا۔ دوپہر کا کھانا اُس نے گھر سے آفس ہی میں منگوا لیا تھا۔ وہ رات کا کھانا مجھے اپنے

گھر لے جا کر کھلانا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی سے بھی ملانا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن وقت پر اختیار نہیں ہونے کی وجہ سے مجھے معذرت کرنی پڑی۔ یہ وعدہ کر کے کہ اگلی بار زیادہ وقت لے کر آؤں گا۔ اُس کی بیوی سے بھی ملوں گا۔ اُس کے لئے بمبئی سے کوئی تحفہ بھی لے کر آؤں گا۔ اُس نے میری معذرت قبول کر لی تھی۔ اور وہ مجھے ایر پورٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا، وِبھا سے ملنے کا یہ دوسرا موقعہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ وہ بھی میری پہنچ سے بہت دُور جا چکی تھی لیکن اُسے اچانک اپنے ایک پرانے ساتھی کے گھر میں دیکھ کر مجھے جو خوشی حاصل ہو جاتی اُس سے بھی میں محروم ہو گیا تھا۔

ایر ہوسٹس میرے لئے کافی لے کر آئی تو میں اس کا گھونٹ حلق کے نیچے اُتارتے ہوئے وبھا کی فائیل کو پھر سے پڑھنے لگا۔ اس نے کمپنی میں کوئی جواب دیے جانے کی جو درخواست دی تھی وہ اُس نے اپنے شوہر کے انتقال کے ایک مہینے کے اندر بھجوا دی تھی۔ ہماری کمپنی نے بھی اُس پر ہمدردانہ رویہ اپنا کر اُسے چنڈی گڑھ میں ریٹ پشنسنٹ کی پوسٹ آفر کر دی تھی۔ لیکن وبھا نے اس پیش کش کا کوئی جواب نہیں بھجوایا تھا۔ کمپنی نے اسی سلسلے میں اُسے دو اور خط لکھے تھے۔ اُن کا بھی کوئی جواب ابھی تک نہیں ملا تھا۔ اسی لئے ہمارے اسٹیبلشمنٹ آفیسر غلام نبی بٹ صاحب نے مجھے یہ فائیل دے دی تھی۔ ان کی تحریری ہدایات کے مطابق مجھے اب پہلے دہلی جا کر وبھا بنڈرت سے ملنا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اُسے جو پوسٹ چنڈی گڑھ میں پیش کی گئی ہے وہ اُسے منظور ہے کہ نہیں! وبھا اب دہلی میں رہتی تھی۔

اب میں دہلی جاتے ہی پہلے اُسی سے ملوں گا۔ غالباً وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گی؟ لیکن وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی؟ میں اُس کے ماضی کا وہی گونگا لڑکا ہوں جس نے دس برس پہلے اُس کے ساتھ بی ایس۔ سی کا امتحان دیا تھا۔ لیکن میں نے یونیورسٹی کے ماحول میں چار روز تک اُس کے ساتھ رہ کر بھی اُس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اگرچہ اُس کی نظر میں میرے لئے کافی التفات تھا۔ کم سے کم یہ کیفیت تو ضرور تھی کہ وہ میری کسی دوستانہ پیش کش کو مسترد نہیں کر سکتی تھی۔ میں ہی جھجک کا شکار ہو گیا تھا۔

انسان کتنا ہی اہم کیوں نہ بن جائے اُس کے اندر اُس کے ماضی کا ایک امیج ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔ وہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ وہ کتنا ہی کم عمر کیوں نہ ہو، جذباتی بھی کتنا بڑا کیوں نہ ہو۔ اُس کے دل میں چھپا ہوا یہ امیج ہی دراصل اُس کی جذباتیت کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ بہت زیادہ نیک ہونے اور شخصیت کی پختگی کی وجہ سے بھی اس قسم کی پرچھائیں کو سو پردوں میں چھپا کر رکھ سکتا ہے۔ یہ بھی اُس کا بچپنا ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن فطری طور پر ودیعت ہونے والا بچپنا بھی تو آسانی سے نہیں جاتا!

میں شام کو سات بجے دہلی پہنچ گیا — وہاں میرے قیام کے لئے اوبرائے ہوٹل میں پہلے ہی سے ایک کمرہ ریزرو کرایا جا چکا تھا۔ ایئرپورٹ سے میں سیدھا وہاں پہنچا — کافی تھکا تھکا سا محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ فلائیٹ صرف ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔ لیکن میرے ذہن پر ایک بوجھ تھا۔

بمبئی میں خاصی اُمس تھی — جبکہ دہلی میں خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ بمبئی میں تو میں صبح شام خوب ٹھنڈے پانی سے نہانے کا عادی تھا۔ دہلی پہنچ کر بھی میں فوراً نہانے کی خواہش کو دبا نہ سکا۔ گرم پانی موجود تھا۔ میں خوب مل مل کر نہایا اور بالکل تازہ دم ہو کر باہر نکلا۔ گرم کپڑے پہن کر ریستوران میں جا بیٹھا — کافی پینے کے لئے — اس کے ایک حصے میں بار روم تھا۔ کئی غیر ملکی اور ملکی مرد و عورتیں وہاں موجود تھے۔

مشرق کی جانب ایک کشادہ کھڑکی تھی — جس پر شیشہ چڑھا تھا اور اس کے پردے کھچے ہوئے تھے۔ شیشے کے پار سے لگ بھگ آدھے شہر کی روشنیاں تو دکھائی دے ہی رہی تھیں۔ پس منظر میں ایک مزار تھا۔ اُس کے پیچھے پرانے قلعے کے کھنڈروں کا ایک طویل سلسلہ۔ دہلی کی بے شمار جگمگاتی ہوئی شاہراہوں میں سے کسی ایک کے کنارے پر راجوری گارڈن کی کالونی بسائی گئی تھی۔ اُس سمت میں، میں بہت اُداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہاں سے بہت دور تھی۔ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ کبھی کبھی انسان اندھیرے میں بہت سی روشنیوں کو ایک ساتھ دیکھ سکنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اُس سے بھی اچھی یہ بات ہے کہ وہ بہت سی روشنیوں میں سے کسی ایک روشنی کو بہت ہی واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔ اُسے پہچان سکتا ہے۔ اس پر ٹکٹکی لگا کر دیکھ سکتا ہے اور انہی لمحات میں خود کو بہت زیادہ اُداس اور بجھا بجھا سا بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ زندگی کا حقیقی درد محسوس کرنے کے لئے آدمی کے لئے افسردہ ہونا کس قدر ضروری ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ فطری ہے اور تکلیف دہ بھی — اس بات کا صحیح ادراک انہی ہی لمحوں میں ہو سکتا ہے۔

میں کتنی دیر تک آس پاس کی بھیڑ کے درمیان تنہا، سوچتا ہوا بیٹھا رہ گیا — ایک کافی اور منگا کر پی گیا — اُس وقت ایک جرمن لڑکی اپنا شراب سے لبالب بھرا ہوا گلاس اُٹھائے میری ٹیبل پر آ کر بیٹھ

گئی تھی۔ شاید میرے سامنے بیٹھنے سے پہلے اُس نے اجازت بھی مانگی تھی۔ لیکن میں اُس کی مسکراہٹ ہی دیکھ کر چونکا اور اُس کا جواب میں نے دھیرے سے ہیلو کہہ کر دیدیا۔

اُس کی آنکھیں نیلی تھیں جو اُس کے گورے رنگ اور سنہرے بوائے کٹ بالوں کے ساتھ بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اُس نے ابھی تک، دو ایک گھونٹ ہی حلق سے نیچے اُتارے تھے۔ میری طرح وہ بھی تنہا تھی۔ اُسے کسی کا ساتھ چاہیے تھا۔ باتیں کرنے والے کسی بھی ساتھی کا ـــــ میں نے اُسے گہری نظر سے دیکھا اور مسکرادیا۔ اور مجھے یہ اچانک ہی محسوس ہوا کہ میرے لئے مسکرانا اب زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ممکن ہے اُسی لڑکی نے مجھے یہ حوصلہ دیدیا ہو۔ جس نے خود کو لارا ڈیٹ کہہ کر متعارف کرایا۔

میں نے اُس کے ساتھ دوستانہ گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اگرچہ اُس کے ساتھ میں ہاتھ نہ بھی ملاتا تب بھی وہ میری آنکھوں سے میری مسرت کو دیکھ سکتی تھی۔ جو صرف اُسی کے لئے نمودار ہو گئی تھی ـــــ کسی بھی اجنبی کے خیر مقدم کے لئے چاہے وہ مُلکی ہو یا غیر ملکی سر کو ہلکی سی جنبش دیکر مسکرا دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن میں شاید اُس وقت اپنے لمحوں کی جکڑبند سے خود آزاد ہو جانا چاہتا تھا ـــــ اُس کے ہاتھ کے نرم لمس نے مجھے آناً فاناً بے تکلّف کر دیا۔

"یس میڈم، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

اُس نے بتایا کہ وہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی اختلافات پر ریسرچ کرنے کے لئے آئی ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے کتنے گوشے جو دنیا والوں کی نظروں میں ابھی تک نامعلوم یا مبہم تھے یک بیک نمایاں ہو گئے ہیں۔ جب سے ملک کی تقسیم ہوئی تھی۔ اب تو دنیا والے ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔ جتنا جاننا ابھی باقی رہ گیا ہے اُس کے لئے متمدّن اور ترقی یافتہ ممالک کے کونے کونے سے ریسرچ اسکالروں کو بھیجا جا رہا ہے۔ چھوٹے بڑے پروجیکٹ دے کر ـــــ مختلف موضوعات کا انتخاب کرکے، مطالعے کے لئے اور کتابیں لکھ کر جمع کرانے کے لئے۔

اس بات کا اُس نے اعتراف کیا: "ہمارے لئے ہندوستان اب جادوگروں اور سنیاسیوں کا دیش نہیں رہا۔ اس قسم کی متھ بنانے والے بعض انگریز مصنّف تھے۔ کپلنگ وغیرہ۔ کیونکہ اُن کے یہاں ایسا ہی لٹریچر بک سکتا تھا۔ اب بھی بک رہا ہے۔ اس کاروبار میں کچھ ہندوستانی ادیبوں نے بھی خوب ہاتھ رنگے ہیں ـــــ وہ ابھی تک ویسی ہی کہانیاں اور ناول لکھ کر یوروپی و امریکی منڈیوں میں چھپوا رہے ہیں ـــــ جو کچھ میں اب تک اپنی آنکھوں سے دیکھ سکی ہوں اور کانوں سے سُنا ہے اس کا بہت سا حصّہ تو ہماری جدید دنیا کا بھی بنتا ہے۔ صرف لباس اور رہن سہن کے طور طریقوں سے نہیں، خیالات سے بھی ـــــ انفرادی روّیوں کو دیکھتے ہوئے بھی۔"

ایک غیر ملکی لڑکی کے منہ سے یہ سب سُن کر کچھ خوشی ہوئی۔

پھر اس نے اپنے بچپن کے بھیانک واقعات کا قصّہ شروع کر دیا۔

دوسری جنگ کے زمانے میں، میں بہت چھوٹی تھی۔ سات آٹھ برس کی ـــــ اتنا مجھے یاد ہے کہ بم باری سے بچنے کے لئے میرے باپ اور دادا مل کر گھر کے اندر ہی اندر ایک سُرنگ کھودنے میں لگے

ہوئے تھے۔ میں انہیں تبسم پرصرف نیکریں پہنے۔ گدالیں اور پھاوڑے چلاتے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ میں اور میرے دوسرے چھوٹے بہن بھائی یہ سمجھتے تھے ہم اس سُرنگ کے ذریعے بہت جلد ایک نئی دنیا میں پہنچ جائیں گے جو پاتال میں بسی ہوئی تھی۔ لیکن وہ سُرنگ کئی روز کی سخت محنت کے بعد ہمارے پڑوس میں ہی ایک مکان تک کھودی جاسکی۔ وہاں جاکر بھی ہمیں اور ہمارے پڑوسیوں کو بمباری کے وقت فرش پہ لیٹ جانا پڑتا تھا۔ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہوکر۔ بالکل سست الوجود گندے سوروں کی طرح۔ اور بم کے دھماکے سُن کر تو ہم سب کے منہ سے چیخیں نکل جاتی تھیں۔ اسی طرح کے ایک دھماکے کے دوران مٹی کے ایک تودے کے نیچے دب کر میری ماں ہلاک ہوگئی تھی۔ نازی میرے باپ اور بھائی کو زبردستی دھکیل کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ فوج میں بھرتی کرنے کے لئے —— اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ میں تو اپنے دادا جی کے کندھے پہ بیٹھے بیٹھے بڑی ہوئی ہوں۔"

میں نے اُس کا گلاس خالی دیکھا تو جلدی سے بار کاؤنٹر پہ جاکر اُسے ایک پیگ اور لاکر دیدیا۔ اس نے میری طرف تشکرآمیز مسرور آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے بھی کچھ مختصراً اپنے بارے میں کہہ سنایا تو وہ بولی۔

"جس طبقے کے آپ فرد ہیں وہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں ہی میں رہتا ہے —— ہندوستان کی دیہی زندگی میں اس طبقے کی جڑیں ابھی اتنی گہرائی تک نہیں پہنچی ہیں —— پھر بھی یہ حقیقت تو تسلیم کی ہی جاسکتی ہے کہ بڑے شہروں ہی کی تہذیب دیہات پہ حملہ آور ہوتی آئی ہے —— جو کچھ آج کلکتہ، بمبئی، دہلی اور مدراس میں بیٹھ کر سوچا جاتا ہے وہی کبھی روم، نیویارک، لندن اور برلن میں بھی سوچا جاتا تھا۔"

اُس کی باتوں میں مجھے سچائی اور ایک بڑی فکر کا احساس مل رہا تھا۔ میں نے اُس کی باتوں کی منطق سے مرعوب ہوکر اُس کے سامنے وبھا پنڈت کا ذکر چھیڑ دیا۔ جسے اُس نے بڑی دلچسپی سے سُنا اور یہ نتیجہ نکالا —— میرا خیال ہے آپ اب بھی اُس سے محبت کرتے ہیں —— ایک عورت کے سامنے اظہار محبت کرنے میں مرد کو جھجکنا نہیں چاہیئے۔ عورت کی بھی دلی آرزو ہوتی ہے اگرچہ وہ اپنا انکار کرنے کا حق بھی محفوظ رکھتی ہے ——"

یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ لیکن اُس نے میرا مذاق نہیں اُڑایا تھا —— ایک فطری و بنیادی بات صاف صاف کہہ دی تھی۔ جس آدمی کے پاس علم و تجربہ ہوتا ہے، غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کبھی کبھی اس طرح شوخ بھی ہو اُٹھتا ہے۔ ان لمحوں میں مجھے لارا ڈیٹ میر کی آنکھوں میں سچ مچ شوخی کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ لیکن میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اُس نے میرے اندر کی ایک خوابیدہ خواہش کو جگا دیا تھا۔ اُس نے میرے دل میں وبھا کے لئے ایک ہمدردی پیدا کردی تھی۔ لیکن ابھی تو میں وبھا سے جاکر ملا بھی نہیں تھا۔ اُسے ایک مدت سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو وہ ۱۵ اپنی فوٹو سے بھی مختلف ہو چکی ہوگی جو ایک فائیل میں لگی ہوئی تھی —— وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی شکل و صورت اور اُس کے نظریات بھی بدل جاتے ہیں۔ اُس کے رویے بھی —— مجھے کیا معلوم، اب وبھا کس انداز سے گفتگو

کرتی ہے۔ وہ پہلی سی اُنیس بیس سال کی شرمیلی، سکڑی سمٹی ہوئی سی تو ہرگز نہیں رہی ہو گی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں، میں جس قسم کی حیرانی اور خوف کی پرچھائیاں دیکھ چکا تھا، وہ اب غائب ہو چکی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے وہ اب ایک دبنگ قسم کی اور حقیقت پسند عورت میں تبدیل ہو چکی ہو! اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی جرأت اپنا بسیرا کر چکی ہو جو اپنے سامنے کھڑے ہوئے مرد کے ضمیر تک کو ٹٹول لینے کے قابل ہو گئی ہو!

"کیا سوچ رہے ہیں۔؟" لارا نے اچانک مجھے چونکا دیا۔

وہ اپنے گلاس میں بچی ہوئی وہسکی کے آخری گھونٹ حلق کے نیچے اُتار رہی تھی۔ اُس کی لمبی، نازک اور شیشے کی سی گردن میں سے نیچے اُترتی ہوئی شراب صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اچانک مسکرا دیا اور اُس سے پوچھا۔

"آپ میرے ساتھ ڈنر میں شریک ہونا پسند کریں گی؟ اس وقت میں بے حد تنہا ہوں۔ آپ کا ساتھ چاہتا ہوں۔ اگر آپ بھی واقعی تنہا ہوں تو!"

لارا ڈیٹ میرنے میری دعوت بخوشی قبول کر لی۔ کرسی کی پشت پر ڈالا ہوا اپنا پل اوور اُٹھا کر پہنا اور میرے ساتھ ڈائننگ روم کی طرف چل دی۔

چھ

وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتا جب جرمنی کی ریسرچ اسکالر لارا ڈیبٹ میر مجھے ہوٹل میں اچانک مل گئی تھی اور اُس نے میرے ساتھ بہت ہی مفید گفتگو کی تھی اور وہ میرے ساتھ ڈنر میں بھی شریک ہو گئی تھی۔ جب تک وہ میرے ساتھ رہی میرا موڈ خوشگوار بنا رہا۔ لیکن اُس کے وہاں سے جاتے ہی جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو جیسے وبھا پنڈت کی یاد ایک جیتا جاگتا پیکر بن کر دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے پہنچ گئی۔ میں نے اس کے ساتھ پوری رات جاگتے ہوئے گذار دی۔ اُسے جاگتی آنکھوں سے دیکھنا اور اُسے محسوس کرنا اب مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ بہت اچھا اور میرا دل اگلے روز اُس سے ملنے کے لئے دھڑکتا رہا۔

صبح ہوتے ہی کمپنی کے دہلی آفس سے اسٹاف کار منگوا لوں گا۔ پھر وبھا سے ملنے کے لئے راجوری گارڈن چل دوں گا۔ اُس کے بعد مالیر کوٹلہ جانے کا پروگرام بناؤں گا۔

اُس رات کا ایک ایک لمحہ میں نے جاگتے ہوئے کاٹا۔ کتنی بار اُٹھ کر کمرے کے اندر ٹہلتا پھرا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر آسمان میں پھوٹنے والی روشنی کا انتظار کرتا رہا۔ دہلی میں بمبئی کی نسبت کچھ دیر سے صبح ہوتی ہے۔ پانچ بجے کے قریب آسمان میں مشرق کی جانب ایک لالی سی نظر آئی۔ اُسے دیکھتے ہی جیسے میرے دل کو قرار آ گیا۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں اُس کا استقبال کرنے کے لئے ٹیرس پر چلا گیا۔ صبح کی نوید میرے لئے وبھا پنڈت سے ملاقات کے مترادف تھی۔

بمبئی میں کتنی بار سمندر کے اُفق پر میں پہلے شفق کو پھر سپیدی کو پھوٹتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ سورج اپنا سارا سونا سطحِ سمندر پر بکھیر دیتا تھا۔ میرے فلیٹ کا سامنے کا حصّہ بحیرہ عرب کے رُخ پر تھا۔ لیکن میں نے زندگی میں پہلی بار پرانے قلعہ کی کھنڈر ہوتی ہوئی بُرجیوں کو اوشا کی سرخی میں نہایا ہوا دیکھا۔ وہ ایک عجیب و غریب سہاونی صبح تھی۔ میں اُس کے سحر میں بالکل کھو کر رہ گیا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ لارا ڈیبٹ میر کب اپنے کمرے سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی تھی اور وہ میری ہی طرح ٹیرس کی ریلنگ پر جھک کر اُسی منظر کو دیکھ رہی تھی۔

جب اُس نے پوچھا ــــ "کیا سوچ رہے ہیں ؟" تو میں نے سر گھما کر اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اُس کے سنہرے بال جو کل رات کو اُس کے سر کے عین وسط میں ایک خوبصورت کلپ میں لپٹے ہوئے تھے اب اُس کی گردن کے دونوں طرف جھول رہے تھے۔ اور طلوعِ سحر کی ساری لال و سنہری رنگت سے اُس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا ــــ میں اُس کی طرف دیکھتا سا رہ گیا۔

میرا جواب نہ پاکر وہ مُسکرا کر بولی ــــ "معلوم ہوتا ہے، آپ اپنی کھوئی ہوئی جنت کے بارے میں سوچ رہے ہیں ؟ میں نے ٹھیک اندازہ لگایا نا !"

میں نے کہا ــــ "میں یہ کہہ سکتا ہوں، میری جنت بھی آپ ہی کی طرح حسین ہو گی ــ !"

اس تعریف کے لئے اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے چائے پینے کی دعوت دی جو اُس نے اپنے کمرے کے باہر ٹیرس پر ہی رکھی ہوئی میز پر منگوا لی تھی۔

اُس روز میں نے بار بار الیکٹرک شیور سے شیو بنائی۔ ہر بار کہیں نہ کہیں بال رہ جاتے تھے۔ رات کو اچھی نیند نہ آئے تو صبح شیو بنانے میں بھی خاصی محنت کرنی پڑ جاتی ہے۔ نہا دھو کر میں نے کپڑے پہنے ــــ لیکن ہاتھ میں ٹائی لئے ہی رہ گیا ــــ سوچا، ایک بیوہ سے ملنے جا رہا ہوں ــــ اظہارِ افسوس بھی ضرور کرنا ہو گا ــــ اس موقع پر اتنی بھڑکیلی ٹائی باندھنا مناسب نہیں ہے۔ بھڑک دار ٹائی اندرونی خوشی ہی کی غماز ہوتی ہے۔ لیکن میرے سوٹ کیس میں تو تینوں ٹائیاں شوخ رنگ کی تھیں۔ کالے یا اُداس رنگ کی ایک بھی نہیں تھی۔ اگرچہ اُس کے شوہر کو انتقال کئے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن میں پہلی بار اُس سے ملوں گا! میں نے اچانک ٹائی لگانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا پیلی چیک قمیض کے کالر کوٹ کے اوپر پھیلا لئے ــــ یہی ٹھیک رہے گا۔ بریف کیس اٹھایا اور کار میں جا بیٹھا ــــ ڈرائیور مجھے جانتا تھا۔ میں اکثر اُس سے گاڑی لے کر خود ہی چلا لیتا تھا۔ اُس دن بھی اُسے ٹپ دے کر "چھٹی" کر دی۔ اور راجوری گارڈن کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اُس علاقے سے واقف تھا۔ لِٹل فلاور اسکول کے سامنے ہی ایک ڈبل اسٹوری مکان تھا جس کا پتہ میرے پاس محفوظ تھا۔ وبھا پنڈت کے والد اُسی میں مقیم تھے۔

میں نے کال بیل بجائی تو دروازہ کھولنے کے لئے وبھا ہی آئی ــــ اُسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔ وہ سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کا چہرہ پہلے جیسا کتابی تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں بھی وہی اور اُس کے آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے سینشوئل ہونٹ بھی وہی! اُس کے سر پر پیچھے پیٹھ تک گئے ہوئے لمبے بال بھی ویسے ہی کسے کسے اور کھلے کھلے سے تھے ــــ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر بے پناہ خاموشی پُتی ہوئی تھی جو اُداسی سے آمیز تھی۔ یہ دونوں کیفیتیں کسی بڑے صبر کا ہی نتیجہ ہو سکتی تھیں۔ میں اُس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا ــــ اُس نے مجھے نہیں پہچانا تھا ــــ مجھے دیکھ کر وہ لحظہ بھر کے لئے بھی نہیں چونکی تھی۔ میں نے بھی اُسے دس برس پرانی ملاقات کی یاد نہیں دلائی ــــ صرف اتنا کہا

"میں بمبئی سے آیا ہوں ــــ نانا بھائی پٹیل اینڈ کمپنی کی طرف سے ــ"

یہ سُنتے ہی وہ ایک طرف ہو گئی۔ مجھے راستہ دینے کے لئے۔ بولی۔

"آیئے "

پھر وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔ ایک ڈرائنگ روم میں لے گئی ـــ مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اُس کے لوٹنے سے پہلے میں نے چھوٹے سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے لیا ـــ تین پیس کا بہت پُرانا صوفہ، ایک سنٹرل ٹیبل جس پر اخبار بچھا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا دیوان، دوسری دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی ڈائننگ ٹیبل اور اُس کے نیچے پھنسی ہوئی چار کرسیاں ـــ دیواروں پر کچھ تصاویر بھی ٹنگی ہوئی تھیں ـــ کرشن اور ارجن کی جو مہابھارت کا ایک منظر پیش کر رہی تھیں۔ ایک فوٹو اُس کے معمّر والد کی لگتی تھی ـــ دوسری فوٹو میں ایک خوبرو نوجوان سکھ کے ساتھ اُس کی خوبصورت دیوی تھی۔

جب وہ چائے کی ٹرے اُٹھائے ہوئے لوٹی تو مجھے کہنا پڑا ـــ "اس کی کیا ضرورت تھی مسز پنڈت بس تو چائے پی کر ہی چلا تھا!"

بولی ـــ "کوئی بات نہیں ـــ ایک پیالی اور لے لیجئے ـــ آپ کے آنے سے پہلے بنا ہی رہی تھی ـــ پاپا کے لئے ـــ "

"آپ کے پاپا گھر پر ہیں ؟ " میں نے پوچھا۔

"جی ـــ ابھی آئیں گے۔ تب تک آپ لیجئے ـــ"

یہ کہہ کر وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ دو پیالوں میں چائے انڈیل دی۔

اُس نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا تھا ـــ شاید میں ہی بہت بدل گیا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا۔ ایک صدمہ سا بھی محسوس ہوا ـــ میں ویسا کا ویسا ہی بنا رہ گیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! میرے لئے تو وہ ذرا سی بھی نہیں بدلی تھی۔ جس طرح میں اُس کے بارے میں سوچتا رہا ہوں، کیا اُس نے بھی ایسا کیا ہے ؟

انسان قدم قدم پر نئے پُرانے چہرے دیکھتا ہے ـــ کچھ یقیناً جاذب نظر ہوتے ہیں۔ متاثر کرتے ہیں۔ پھر کچھ اور چہرے آجاتے ہیں ـــ جیسے کسی کتاب کا ورق پلٹ جائے ـــ پھر نئے الفاظ، نئے جملے اور نئی نئی کیفیتیں من کو چھونے لگتی ہیں۔ جو کیفیت زیادہ گہری ہوتی ہے وہی دیرپا ہوتی ہے ـــ لیکن اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ یاد بھی رہ جائے۔ کبھی کبھی انسان اپنے شب و روز میں گھر کر آگے، پیچھے کا سب کچھ بھول بھی جاتا ہے۔ ہر شخص میری طرح کا تو نہیں ہو سکتا کہ وہ ماضی میں جیتا رہ جائے اور اُسے جھیلتا بھی رہے۔

میں نے اپنی ادھیڑ بن میں سے نکلتے ہوئے کہا ـــ "آپ کے پتی کے بارے میں معلوم کر کے بہت دُکھ ہوا ـــ"

وہ خاموش بیٹھی رہی ـــ سر جھکائے ہوئے۔

"سوشیل کو میں جانتا تھا ـــ کچھ عرصہ ہم بمبئی میں ساتھ رہے تھے۔ بہت اچھا آدمی تھا۔ بہت ہی

خوش مزاج اور دلدار قسم کا ــــ "

اُس نے چائے میں چینی ملا کر پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ کچھ لمحے بڑی خاموشی میں گذر گئے۔ میرے ہمدردی بھرے الفاظ کا اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا۔ جس طرح وہ پہلے پُرسکون تھی اُسی طرح اب بھی نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں چپ چاپ چائے پیتے رہے ــــ چائے ختم ہو گئی تو میں نے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"آپ نے سوشیل کی وفات کے بعد سروس کے لئے درخواست دی تھی !"

"جی ۔"

"کمپنی نے اُسے منظور کر لیا تھا" !

"جی ۔"

"آپ کو "ریمائنڈر" بھی بھجوائے گئے تھے ۔"

"جی ۔ مل گئے تھے ۔"

ہر بار مختصر سا جواب اور اُس کے بعد گہرا سکوت ــــ لاتعلقی کا احساس بھی ہو رہا تھا ــــ شاید اُسے سروس کرنا اب منظور نہیں ہے ! میں نے کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے بریف کیس میں سے اُس کی فائیل نکال لی۔ اس کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ کچھ منٹ اور بیت گئے ــــ پھر میں نے فائیل بند کر کے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے گھورا۔

وہ میرا عندیہ سمجھ کر بولی ــــ "میں چنڈی گڑھ میں رہ کر سروس نہیں کرنا چاہتی ۔"

"اوہ !"

میں سمجھ گیا ــــ چنڈی گڑھ کے ساتھ اس کے مرحوم شوہر کی یادیں وابستہ ہوں گی۔ اُسی آفس میں اُس کے لئے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جہاں ہر شخص سوشیل کو جانتا تھا اُسی کے بارے میں باتیں کرتا رہے گا۔

میں نے سوچا، ہماری کمپنی اُسے اور کونسے شہر میں آفر دے سکتی ہے۔ دہلی، کلکتہ، بمبئی، کانپور، احمد آباد ! ان سارے شہروں میں ہمارے ذیلی دفتر ہیں ــــ وہ جہاں بھی جانا چاہے اُس کے لئے جگہ نکال لی جائے گی۔ میں اس کی سفارش کر دوں گا۔

میں نے اُس کے سامنے تجویز رکھی ــــ "آپ جہاں بھی جانا چاہیں وہاں میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ دہلی کیسا رہے گا آپ کے لئے ــــ ؟ یہاں تو آپ کے پاپا بھی رہتے ہیں ــــ "!

لیکن وہ چُپ رہی۔ جیسے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے !

میں نے کہا ــــ "سوچ لیجئے۔ کمپنی آپ کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ تنخواہ بھی معقول مل جائے گی ــــ میں ایک دن کے لئے مالیر کوٹلہ جا رہا ہوں۔ لوٹ کر آپ سے پھر ملوں گا۔ تب تک شاید آپ کچھ من بنا لیں گی ۔"

مالیر کوٹلہ کا نام سن کر وہ چونکی — میں نے پہلی بار اُس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں چمک بھی دیکھی۔ اُس نے فوراً دریافت کیا — "آپ مالیر کوٹلہ جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں — وہاں ہم ایک کیمیکلز کی فیکٹری لگا رہے ہیں۔"

بولی — "وہاں میرا بیٹا گیا ہوا ہے۔ میرے بھائی کے پاس۔"

"اچھا، تو کیا آپ اُس کے لئے کچھ بھیجنا چاہتی ہیں؟ یا کہیے تو واپسی پر اُسے ساتھ لے آؤں؟ میرے پاس گاڑی ہے۔ کوئی دقت نہیں ہوگی — لیکن اپنے بھائی کے نام آپ کو ایک خط لکھ کر دینا ہوگا۔"

میں نے محسوس کیا، میں اُس کے بن کہے اُس کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔

اُس نے جواب دیا — "نہیں جی — وہ تو اب وہیں پر ہی رہے گا —" وہ اچانک پہلے سے زیادہ افسردہ ہو گئی۔ اس کا گلا بھی رُندھ گیا۔

پھر کچھ لمحوں تک خاموش رہ کر بولی — "لیکن اُن لوگوں نے تو فیصلہ کر رکھا ہے، سنٹی کو اب میں کبھی نہیں مل سکتی۔"

میری سمجھ میں فوراً کچھ نہ آسکا — یہ فیصلہ کن لوگوں نے کر رکھا ہے؟ اُس کا بچہ اُس کے پاس رہنے کی بجائے اپنے ماما کے پاس مالیر کوٹلہ میں کیوں رہ رہا ہے؟ یہ تو واضح ہے کہ وِبھا اُن کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہے۔

"کتنے سال کا ہے آپ کا سنٹی؟" میں نے اس کی نمناک ہوتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہ ابھی تین ہی سال کا ہے۔ نہ جانے اُسے کیسا لگتا ہوگا میرے بغیر!"

اُس نے کوشش کی کہ اُس کے ہونٹوں سے سسکی نہیں نکلے۔ پھر بھی نکل ہی گئی۔ اور اُس نے جلدی سے چہرہ گھما لیا۔ دروازے کی جانب — ایک بوڑھا آدمی شلوار قمیض پہنے گلے میں مفلر لپیٹے چھڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اندر آرہا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا — وہی وِبھا کے پاپا ہیں — میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا — وِبھا پنڈت جلدی سے آگے بڑھ گئی — انہیں سہارا دے کر اندر لے آئی — اُنہیں ایک صوفے پر بٹھا کر خود بھی اُن کے پاس ہی بیٹھ گئی — اُن کے بازو کے ساتھ اپنا سر ٹیکا کر سسکتی ہوئی بولی

"پاپا، آپ مالیر کوٹلہ جا رہے ہیں — کمپنی کے ایک کام سے — کل لوٹ آئیں گے — میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں؟ سنٹی کو دیکھ کر لوٹ آؤں گی —"

اُس کا بوڑھا باپ سن سا رہ گیا — میری طرف بھاری پپوٹوں کے نیچے دبی دبی آنکھوں سے دیکھنے لگا — اسّی سال سے کم کا نہیں ہوگا وہ۔ اُس کا بھاری بدن اب پلپلا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کے اُونچے بانسے کی ناک اب مرجھا چلی تھی — میلی میلی سی بھی ہو رہی تھی — اُس کی ٹھوڑی کے نیچے جھریوں نے ایک گچھا سا بنا لیا تھا۔ اپنی بیٹی کی طرف دیکھے بغیر ہی وہ بولا ۔

"لیکن تمہیں تو تمہارے بھائی اور بھابھی نے منع کر رکھا ہے، اب سنٹی کے ساتھ کوئی واسطہ مت

رکھو! نہیں وہاں دیکھ کر وہ ناراض نہیں ہوں گے ؟"

اُس کی کھرکھراتی ہوئی آواز سارے کمرے میں گونج اُٹھی۔ اُس کا لب ولہجہ پاکستان سے تقسیم کے بعد آنے والے پنجابیوں کا سا تھا۔ اُس کی آواز کی گھن گرج میرے اندر گھومتے گھومتے اچانک رُک گئی۔ جب وِبھا نے اُس سے بمنت کہا ــــ نہیں پاپا، میں وہاں رُکوں گی نہیں۔ سنٹی کو بس دیکھ کر فوراً چلی آؤنگی"

بزرگ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُن کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ــــ میں نے اُسے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ــــ "آپ کی بیٹی کو کسی بڑے شہر میں سروس دلائی جا سکتی ہے۔ شہر کے بارے میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے ــــ"

میری بات سُن کر وِبھا کے پاپا نے پلک تک نہ جھپکی ــــ سفید بھاری ابروؤں کے نیچے چھپی ہوئی آنکھوں سے میری طرف گھورتے رہے۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولے۔

"یہ فیصلہ وِبھا خود کر سکتی ہے۔ اپنے بھلے بُرے کو سمجھ سکتی ہے"

یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ وِبھا نے پھر اُن کی مدد کی۔ انہیں سہارا دے کر باہر لے گئی ــــ واپس آئی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ میرے سامنے بیٹھ کر بولی۔

"آپ سے تو پوچھے بنا ہی میں نے مالیر کوٹلہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بھی کتنی عجیب ہوں! لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں واقعی آپ کے ساتھ چلوں ؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں ــــ" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا ــــ "ضرور چلیے ــــ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے! یو آر موسٹ ویل کم!"

"میں تیار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لوں گی ــــ بس صرف دس منٹ!"

"کوئی بات نہیں ــــ ابھی بہت وقت ہے۔ پونے تین سو کلومیٹر ہی تو جانا ہے۔ چار پانچ گھنٹوں میں بڑی آسانی سے پہنچ جائیں گے۔

یہ کہہ کر میں فلیٹ سے نیچے اُتر آیا۔ آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ جس بات کا میں نے تصوّر تک نہیں کیا تھا وہ بن مانگی مراد کی طرح پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔

وِبھا دس منٹ کے بعد تیار ہو کر آ گئی ــــ میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا ــــ اُس نے کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا ــــ وہی سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی ــــ اُسی سادگی سے اُس نے بال سمیٹ رکھے تھے ــــ میک اپ نام کی کوئی بھی چیز اُس نے نہیں کی تھی ــــ اُسے میک اپ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اُس کے بغیر بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

اُس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی تھی جسے میں نے اُس کے ہاتھ سے لے کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور اُسے اپنے ساتھ آگے ہی بیٹھ جانے کے لئے کہا ــــ وہ بلا جھجک میرے پاس بیٹھ کر بولی ــــ

"راستے میں مارکیٹ سے کچھ بسکٹ ٹافیاں وغیرہ لینی ہیں ــــ سنٹی کے لئے ــــ اگر آپ کی

اجازت ہو گی تو!"

"واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! جہاں کہیے گا گاڑی روک لوں گا۔"

راستے کا سفر بہت سہاونا تھا۔ خوب دُھوپ نکل آئی تھی۔ جنوری کی سخت خنکی کچھ کم ہو گئی تھی۔ جی ٹی روڈ پر ہمیشہ کی طرح بہت زیادہ ٹریفک تھا۔ بے شمار کاریں اور بسیں مسافروں سے بھری ہوئیں تیزی سے آ جا رہی تھیں ـــــ دُور دراز کے علاقوں سے، گوالیار، اجمیر شریف، جے پور، شملہ، چنڈی گڑھ، پٹھانکوٹ، جالندھر، امرتسر، لُدھیانہ وغیرہ سے ـــــ بڑے بڑے ٹرک بھی دندناتے پھرتے تھے۔ اپنے اندر مشینیں، لوہے کے سریے، پائپ، سیمنٹ، اناج کے بورے، لکڑی کے بڑے بڑے تنے وغیرہ لادے ہوئے ـــــ ان سب گاڑیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا۔ زندگی مجموعی طور پر رواں دواں ہے

سڑک کی دونوں طرف کہیں کہیں کھیتوں کے سلسلوں سے ہٹ کر کہیں کم کہیں بہت زیادہ آبادی والے چھوٹے بڑے قصبے بھی تھے ـــــ دُور سے گذرتے ہوئے بھی چھوٹی چھوٹی گلیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں کے جنگلوں پر سوکھتی ہوئی رضائیاں اور کھیس، دھوتیاں، لنگیں، شلواریں اور ہندوؤں و سکھوں کی تازہ رنگی ہوئی پگڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں ـــــ چھوٹے کمروں والے اسکولوں کے بچّوں سے بھرے ہوئے احاطے بھی نظر آئے۔

مجھے ایسا لگا، ہم دونوں آس پاس کی ہر چیز کو ایک سی دلچسپی سے دیکھتے جا رہے ہیں۔ کوئی خاص دلکش منظر آ جاتا ہے تو ہم مشین کی تیزی سے خود بخود اُدھر کو گھوم جاتے ہیں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اُس کا ایک خاص اثر بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ـــــ یہ خاموشی کسی قسم کی اجنبیت کی وجہ سے نہیں ہے ـــــ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے ہیں ـــــ ہمارے بیچ کوئی دیوار بھی نہیں ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر ہم خود کو بے تعلق بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں ـــــ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی جیسے ایک دوسرے کو پوری طرح محسوس کر رہے ہیں ـــــ گردشِ ہی کی مدد سے جس کے پاس سے ہم آنکھ جھپکتے میں گذر جاتے ہیں ـــــ زن سے! وہ سارا کچھ پیچھے چھوٹ جاتا ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ بھی رہا ہے ـــــ اور جس نے ہمیں سانسوں کے ذریعے سے اور اچٹتی ہوئی نظروں کے ذریعے

سے بھی ایک دوسرے کو محسوس کرنے کا ایک عجیب احساس دیدیا ہے۔

جب اچانک میں نے سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک ٹی اسٹال پر رک کر چائے پی لینے کی تجویز رکھی تو وسبھا نے فوراً قبول کر لی — ٹی اسٹال پر ہمارا رُکنا بھی جیسے ہمارے درمیان ایک پُل بن گیا — اسٹال کے مالک نے جو ایک ادھیڑ عمر سکھ تھا اور سردی کے موسم میں بھی بدن پر صرف ایک کچھا اور بنیان پہنے ہوئے تھا ہمیں گڑ کی بنی ہوئی چائے کے دو گلاس کار کے اندر ہی پہنچا گیا۔ اور جاتے جاتے کہہ گیا۔

"باؤ جی، میں چینی لینے کے لئے ڈپو پر نہیں جا سکا۔ کل اُس کے مالک کو دہشت پسندوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اُس کے پاس جتنا روپیہ تھا وہ بھی چھین کر لے گئے۔"

ہم دونوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مجھے یاد آیا، پنجاب اور ہریانہ میں کبھی کبھی اچانک ایسی واردات ہو جاتی ہے۔ بمبئی میں بیٹھ کر میں نے اخباروں میں ایسی خبریں پڑھی تھیں۔

"اب تو دہلی بھی اُن لوگوں سے محفوظ نہیں رہا۔ کسی روز اچانک کہیں بم پھٹ جاتا ہے کہیں تاڑ تاڑ گولی چل جاتی ہے۔"

مجھے دہلی کے بارے میں بھی خبریں ملتی رہی تھیں — لیکن میں نہیں چاہتا تھا، ہم گڑ کی اتنی اچھی چائے کا ذائقہ بھول کر گولیوں اور بموں کے بارے ہی میں باتیں کرتے رہ جائیں — اتفاقیہ دہشت گردی کے باوجود زندگی پوری رفتار سے چلی جا رہی ہے۔ لوگوں کے ہاتھ پیر رُک نہیں گئے — کھیتوں میں کسان ٹریکٹر چلاتے پھر رہے ہیں۔ ٹیوب ویل یہاں وہاں کتنا پانی اُگل رہے ہیں — قصباتی دکان دار دکانیں کھولے ہوئے کاروبار میں مصروف ہیں تو ہم بھی زندگی کی مسرتوں کے بارے میں کیوں نہ باتیں کریں!

میں نے وسبھا سے پوچھا — "چائے پسند آئی؟"

"بہت !!!" اُس نے یہ لفظ قدرے لمبا کر کے کہا۔

مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ اُس نے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ہے — ہمیں جو کچھ مل گیا ہے اُس کا وہ میرے ساتھ پورا لطف اُٹھانے کے لئے تیار ہے۔ کسی خاص علاقے میں جا کر وہاں کے ماحول کو، اس کی کمیوں کو، ان کے رسموں رواجوں کو اور وہاں کی زندگی کے دیگر قسم کے رویّوں کو بھی کسی قسم کی تنقید کئے بغیر قبول کر لینا بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ہمارے ذہن صاف ہیں — دل کشادہ ہیں۔

راستے میں اُس نے اُونچے اُونچے گنوں کے کھیت کے پاس سے گذرتے وقت پوچھا۔

"اب ہم کہاں ہیں؟"

میں نے پہلی بار اُس کے سامنے ہنستے ہوئے کہا — "ابھی تک تو ہم گڑ اور مٹھاس کے نگرسے گذر رہے ہیں —"

یہ سُن کر اُس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا — میری برجستہ بات پر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ اُبھری — لیکن لمحہ بھر کے لئے اُس نے میری طرف جس انداز سے کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھا اُن میں

بے پناہ مٹھاس تھی۔ خوشبو تھی جو ابھی تک میرے ذہن اور ذہن میں موجود تھی۔

میں نے اُسے بتایا — "کوئی دو گھنٹے بعد ہم انبالہ پہنچ جائیں گے — وہیں جا کر کھانا بھی کھالیں گے — اُس کے بعد ہریانہ سے پنجاب میں داخل ہو جائیں گے۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر کہا — "اگر ایک گھنٹہ پہلے دہلی سے نکل لئے ہوتے تو ہم پٹیالہ جا کر بھی کھانا کھا سکتے تھے — وہاں میرے ایک ٹیچر رہتے ہیں جن سے میں نے پنجابی لٹریچر پڑھا تھا۔ وہ اب پنجابی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں — اُن کی سردارنی جی مجھے اپنے بیٹے کی طرح مانتی ہیں — وہ ہمیں اچانک دیکھ کر بہت خوش ہو جاتیں — آپ دیکھتیں کہ وہ کتنے پیار سے ہمیں پراٹھے اور سرسوں کا ساگ کھلاتیں، لسّی بھی بھر بھر کر پلاتیں — ہم اب بھی اُن سے جا کر ملیں گے۔"

وبھا نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اُسے میری باتوں کی سچائی پر یقین نہیں آیا ہو — اور میں بھی اندر سے اُن کے بارے میں کتنا جذباتی ہوں! میں اُس کی جانب مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا — وہ سر جھکا کر بولی۔

"لیکن وہ لوگ تو مجھے نہیں جانتے نا!"

اُس کے تذبذب کا سبب میں سمجھ گیا۔ اُسے یقین دلایا — "وہاں آپ کسی قسم کی اجنبیت نہیں محسوس کریں گی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں — دیکھ لیجیے گا"

اگرچہ ہم انبالہ کی طرف رواں دواں تھے اور میں کئی بسوں اور ٹرکوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا جا رہا تھا لیکن میری نظروں کے سامنے پروفیسر ہزارا سنگھ اور اُن کی سردارنی جی کے مشفق چہرے گھوم رہے تھے۔ اُن سے جلد سے جلد ملنے کی میرے اندر خواہش تیز تر ہو گئی تھی۔ جب دہلی سے روانہ ہوا تھا تو ارادہ یہ تھا کہ اُن سے مالیر کوٹلہ سے واپس آتے وقت ملوں گا۔ اب اس ارادے کی تبدیلی کے پیچھے شاید وِبھا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کی خواہش کارفرما ہو گئی ہو! جو بھی ہو، اب میں پہلے سے زیادہ خوش تھا۔

ایک مدّت کے بعد شمالی ہند کے ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان چوڑی شاہراہ پر کبھی ساٹھ ۶۰ کبھی اسّی ۸۰ کلومیٹر کی رفتار سے کار چلاتے ہوئے مجھے ذرا بھی جھجک نہیں محسوس ہو رہی تھی — ایک بار وبھا نے خوف زدہ ہو کر مجھے کم اسپیڈ پہ گاڑی چلانے کے لئے کہا تو میں ہنس دیا — اگرچہ اُسے مطمئن کرنے کے لئے تھوڑی سی اسپیڈ کم بھی کر دی۔

پنجاب اور ہریانہ کبھی ایک تھے۔ پنجابی جاٹ ہریانہ میں بھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جہاں جہاں اُنہیں کھیتوں میں ٹریکٹر چلاتے اور کہیں کہیں مشینوں پر چارہ کاٹتے ہوئے دیکھ لیتا تو میں رفتار کم کر دیتا۔ جی چاہتا اُن کے پاس رُک جاؤں — کچھ دیر کے لئے ہی سہی — ان کی زبان سے بے ساختہ تخلیق ہونے والی بولیاں سُننے کے لئے — کسی پنجابی جاٹ کی جھلک پاتے ہی میرے کانوں میں

بھولی بسری، میٹھی اور ان جانے شکھ میں مبتلا کر دینے والی بولیاں اپنے آپ سر سرانے لگتی تھیں۔

تینوں لڈواں نے گرمی کیتی۔
کھالے پورو، ناشپاتیاں!
(لڈو کھا کھا کر تجھے گرمی چڑھ گئی ہے۔ لے پورو! اب ناشپاتیاں کھا!)
نی میں بیریاں چوں بیر لے آیا۔
بھابھی تیرے گل ورگا!
("سن ری بھابھی! میں کتنے پیڑوں سے چن چن کر ایک ایسا بیر لے آیا ہوں جو تیرے رخسار کی مانند سرخ ہے)
باپو تیرے کڑماں نے
گورے رنگ دی قدر نہ جانی
(باپو تیرے سمدھیوں نے تو میرے گورے رنگ کی قدر ہی نہیں کی!)

میں کسی جگہ رک جاتا اور ان سے ست سری اکال، کہہ کر ہم کلام ہوتا تو وہ میرے ساتھ خوش ہو کر ہاتھ ملاتے۔ میں ان سے بولیاں سنانے کے لئے اصرار کرتا تو وہ مجھے مایوس نہ کرتے۔ بولیاں بھی سناتے اور ہیر وارث شاہ کا کوئی ٹکڑا بھی۔ بلھے شاہ اور بابا فرید کے دوہے بھی سنا دیتے — یہ سارا لوک ورثہ صدیوں سے سارے پنجاب کے خون میں ہر دم گردش کر رہا ہے — ملک تقسیم ہو گیا ہے — پہلے پنجاب کے دو حصے ہوئے پھر تین ہوئے — لیکن اس تقسیم در تقسیم کے باوجود اس دھرتی کی شاعری، اس کے لوک ناچ اور عوامی گیت تقسیم نہیں ہو سکے — معرفت اور حسن و عشق کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نغمے ابھی تک ساجھے ہیں — یہ یہاں کے باسیوں کے دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔

یہ ایک ایسا ورثہ ہے جسے اپنایا تو جا سکتا ہے۔ سرحدوں میں بانٹا نہیں جا سکتا — چھلاں مارتے ہوئے دریا کو سیاسی تلوار سے کون الگ کر سکتا ہے —؟ یہ وراثت، یہ جذبہ، یہ عشق اور فراق ہمارے سامنے کیسے سوال کھڑے کر دیتے ہیں؟ جذباتیت کے شدید لمحوں میں اور ہم کوئی جواب نہیں دے پاتے۔

اچانک میرے دل میں وسبھا پنڈت کو ایک پنجابی نظم سنانے کی خواہش پیدا ہو گئی — میں چاہتا تھا وہ میری اندرونی کیفیت میں جو ان لمحوں میں اچانک میرے اندر پیدا ہو گئی تھی شریک ہو جائے۔

"مسز پنڈت" اس وقت مجھے سرحد پار کے ایک پنجابی شاعر شارب انصاری کی ایک نظم یاد آ گئی ہے — اسے میں نے برسوں تنہائی میں گنگنایا ہے — آپ بھی سنیئے ذرا —

ہردے دے وچ سدھراں دا ہڑ
بے واقف گیتاں دی لو
انجانی الفت دا نگھ
پیار بھرے ساہ دی خوشبو
دل دی جوہ وچ
ڈونگھے کھوہ وچ
ہسدے ہسدے سو کوہ قاف
نگھے جسم تے نرم لحاف
لمبے چوڑے بیابان
سڑدے بلدے ریگستان
لُو نال انھیاں ہوئیاں اِلاّں
اگ وردھاون وادیاں لہراں
میں نمانا ، نموں جھانا
بھریا پیتا
چُپ چپیتا
مینوں آ آ پچھن لوگ
میں کی دساں خود نہ جاناں
مینوں کی اوّلا روگ ؟
اکھڑے اکھڑے ساہ سمے دے
موئیاں موئیاں راہوں
مینوں دسّو واورولو
میں کدّھر نوں جانواں ؟

(دل میں حسرتوں کا سیلاب / اجنبی گیتوں کا شعلہ / انجانی اُلفت کی گرمی / پیار بھرے سانسوں کی خوشبو / دل کی گہرائی میں / گہرے کنوئیں کے اندر / ہنستے ہنستے سو کوہ قاف / گرم بدن اور نرم لحاف / وسیع وعریض بیاباں / تپتے جھلستے ریگستان / لُو سے چیلیں تک اندھی ہو گئیں / آگ برستاتی ہوئی وادیاں اور راہیں / میں بے چارا ، غم کا مارا / اندر سے بھرا ہوا / خاموش / مجھ سے آ آ کر پوچھیں لوگ / کیا بتاؤں ، خود بھی نہیں جانتا / مجھے کیسا انوکھا روگ لگا ہے / وقت کی سانسیں اکھڑی اکھڑی / مری مری سی راہیں / مجھے بتاؤ ہوا کے بگولو ! / میں کہاں جاؤں !)
نظم سُناتے سُناتے میرا گلا رُندھ گیا ___ میری آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئے ___ میں وہا

کی طرف دیکھنے کے بجائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا — اگرچہ جاننا چاہتا تھا کہ اس نظم کے بارے میں اُس کا تاثر کیا ہے؟ یہ نظم میرے جذبات کی صحیح ترجمان تھی — تھوڑی بہت تفصیل کے فرق کے ساتھ — میں اس کے ساتھ اپنی شناخت کر سکتا تھا کرتا رہا ہوں — دیکھا ابھی تک مجھے پہچان نہیں پائی سکی ہے — اُسے کیسے بتاؤں کہ میں ابھی تک اُسے بھول نہیں سکا ہوں — جب سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا تو اُسے سر جھکا کر سوچ میں غرق پایا — مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی کچھ لمحے گذر گئے تو اُس نے صرف اتنا کہا

"بہت اچھی نظم ہے — من کو چھوتی ہے —"

آٹھ

راستے میں ایک پیٹرول پمپ دکھائی دیا تو میں نے گاڑی اُسی طرف موڑ دی۔ جی چاہتا تھا، کچھ دیر باہر نکل کر ذرا ٹانگیں سیدھی کر لی جائیں — وہاں بہت سے ٹرک بھی رکے ہوئے تھے جو بھاری سامانوں سے لدے ہوئے تھے۔ مدراس کلکتہ وغیرہ کے علاقوں کی طرف سے آئے تھے لیکن اُن سب کے ڈرائیور سکھ تھے — خوب لمبے چوڑے اور تندمند — وہ وہاں پیٹرول لینے کے علاوہ آرام کرنے کے لئے بھی رُک گئے تھے — پیٹرول پمپ سے ملے ہوئے دو ڈھابے تھے جن کے آگے درجنوں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ ڈرائیور اور کلینر تو آرام سے ہاتھ پاؤں پھیلائے سو رہے تھے — کچھ کھانا کھا رہے تھے — اور کچھ ایک نل کے نیچے بیٹھے نہا رہے تھے — ڈھابوں کے پیچھے کھیت تھے جن میں گنا اُگا ہوا تھا۔ وہیں گنے کا رس نچوڑنے والی مشینیں لگی ہوئی تھیں اور آگ پر چڑھائے گئے کڑاہوں میں گُڑ بنایا جا رہا تھا — پیلا پیلا اور خوشبو دیتا ہوا — یہ منظر دیکھ کر میں کھو سا گیا — گاڑی میں پیٹرول بھرا کر اسے ایک طرف پارک کر دیا اور وبھا سے کہا — باہر آیئے تو ذرا ٹہل لیا جائے — "

اُس نے اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا — اور بولی "یہاں تو کوئی دوسری عورت نظر نہیں آتی ہے"
میں نے کہا — گھبرایئے مت — ہم اپنے ملک میں ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے ہیں — "
وہ میرے اصرار پر باہر آ گئی — ہم چلتے چلتے ڈھابوں کی طرف نکل گئے — تندور پر روٹیاں پکاتا ہوا ایک آدمی بولا — باؤجی، ادھر آ جایئے۔ ادھر منجی پر — کھانا تیار ہے۔ گرما گرم!"
"بھوک لگی ہے؟" میں نے وبھا سے پوچھا۔
"زیادہ نہیں — "
"یعنی کچھ کچھ؟" میں نے مسکرا کر کہا — اگر ارادہ ہو تو انبالہ کے بجائے یہیں کھا لیں — ؟
ایسی تندوری روٹیاں وہاں کہاں ملیں گی؟"

وہ بولی — "مل تو جائیں گی — ہر بڑے ہوٹل میں تندور کا بھی انتظام ہوتا ہے — پر یہاں جتنا اچھا اور سستا کھانا ملے گا وہاں نہیں ملے گا —"

اُس کی رائے جان کر میں اُسے ایک چھپر کے نیچے لے گیا — ایک بڑی سی چارپائی کے آگے ایک میز بھی رکھی ہوئی تھی — ہمیں وہاں بیٹھتا دیکھ کر ہوٹل والے نے نوکر کو زور سے آواز دی۔

"اوئے تیر سنگھ سیہاں! چل میز صاف کر دے تے نالے پانی کا جگ اور گلاس بھی دھر دے۔ باؤ اور ران نوں پچھ، کی کھان گے! — دال سبزی، یا اور بھی کچھ — مرغا بھی تیار ہے —"

"ہاں جی دسّو باؤ جی کی لیا واں؟ مرغے کی دو پلیٹیں اور روٹی!" نو عمر سردار چھوکرا میز صاف کر کے بولا۔

میں نے وبھا پنڈت کی طرف دیکھا یہ جاننے کے لئے کہ کیا وہ بھی میری طرح نان ویجی ٹیرین ہے؟ جب اُس نے انکار نہیں کیا تو میں نے اپنی پسند کا آرڈر دے دیا۔

ذرا فاصلے پر چارپائیوں پر سستاتے ہوئے سردار اٹھ کر بیٹھ گئے — پہلے تو انہوں نے کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھا — پھر آپس میں ہاسا مخول کرنے لگے — اُن کے بے ساختہ ہنسنے کی آواز مجھے بھلی لگ رہی تھی — گھروں سے کئی کئی ہفتے باہر رہ کر ہزاروں میل کا سفر کر کے وہ ملک کی معشیت کو ترقی دینے میں بہت بڑا کردار نبھا رہے تھے — سردی گرمی، لُو، بارش، طوفان، تنہائی اور پولیس کی زیادتیاں برداشت کرنے کے باوجود کتنے مست تھے —! کتنے زندہ دل اور ٹھٹھول پسند!

کھانا کھا چکنے کے بعد ہم اُن کے پاس سے ہو کر کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ جہاں گنّے کے رس سے گُڑ بنایا جا رہا تھا — ہم دونوں اُن کے بھاپ دیتے ہوئے کڑاہوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے — کام کرنے والے سکھ کسانوں نے ہماری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھا اور لکڑی کے ایک بڑے سے تنے کی طرف ایک سکھ جوان نے اشارہ کر کے کہا — "باؤ جی بہہ جاؤ —؟"

ہم دونوں لکڑی کے تنے پر بیٹھ گئے — اُس نے زور سے کھیت کے اندر کام کرتی ہوئی ایک لڑکی کو پکارا — "او گُڈے ذرا ادھر آجا — باؤ جی تے بی بی اور اں نوں گرم گرم گُڑ کھلا۔"

اونچے اونچے گنّوں کے درمیان سے ایک الھڑ لڑکی بھاگتی ہوئی نکلی اور ہمارے پاس آ کر ہمیں غور سے دیکھنے لگی — اُس کے بدن پر شلوار قمیض اور دوپٹہ — سب ریشمیں تھے۔ گہرے رنگ کے چھاپے والے لیکن وہ کئی روز سے جیسے دھوئے نہیں گئے تھے — بالکل مدھلے ہوئے تھے — اُس کے بالوں پر گرد جمی تھی اور گھاس پھوس کے خشک تنکے اٹکے ہوئے تھے۔ اس حال میں بھی وہ دلکش معلوم ہو رہی تھی کیونکہ اُس کا ناک نقشہ اچھا تھا۔

وہ جلدی سے اخبار کے ایک کاغذ پر بہت سا گُڑ رکھ کر لے آئی — حلوے کی مانند پگھلا پگھلا اور بہتا ہوا سا — اُس میں سے ہلکی ہلکی بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

"سردار جی، اتنا سارا گڑ! تھوڑا کم کر دیجیے۔"

"کھاؤ باؤ جی کھاؤ! خوب مزے سے کھاؤ۔۔۔ بچ جائے تو ساتھ لے جانا۔۔۔ ایسا ودھیا گڑ کہیں اور نہیں ملے گا۔۔۔"

اُنگلیوں سے اٹھا اٹھا کر ہم دونوں کھانے لگے۔۔۔ اچھا تو لگا لیکن میٹھا اس قدر تھا کہ زیادہ نہیں کھایا جا سکا۔۔۔ وبھا نے باقی گڑ اُسی اخبار میں لپیٹ کر رکھ لیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالے تو کسان بولا۔۔۔ "باؤ جی پیسے مت نکالنا۔۔۔ یہ میں نے آپ کو اپنی خوشی سے کھلایا ہے۔۔۔"

میں نے اُس کی طرف شکر گزار آنکھوں سے دیکھا۔۔۔ شکریہ ادا کیا اور کہا۔۔۔ واپسی پر دو چار کیلو لے جائیں گے۔۔۔ شاید کل شام تک ادھر سے گزریں۔۔۔"

"جتنا جی چاہے لے جانا۔۔۔ میں تھیلے میں ڈال کر رکھ لوں گا۔۔۔"

"ابھی لے جایئے نا۔۔۔" وبھا بولی۔۔۔ "پٹیالے میں اپنے ٹیچر کو بھی دے دیجئے گا۔!"

تجویز بُری نہیں تھی۔۔۔ میں نے دو تھیلوں میں پانچ پانچ کیلو گڑ بھروا لیا۔ سردار نے جتنے پیسے مانگے میں نے ادا کر دیے۔۔۔ لیکن میں جانتا تھا اُس نے کم ہی پیسے مانگے تھے۔

جب ہم کار کی طرف لوٹ رہے تھے تو ڈھابے کے سامنے بہت سے ڈرائیوروں کے درمیان بیٹھا ہوا ایک نو عمر ڈرائیور بڑے رسان سے ہیر گا رہا تھا۔ میرے ساتھ وبھا نہ ہوتی تو میں اُن کے بیچ میں بیٹھ جاتا اور ہیر سُنتا۔۔۔ میں اُن سب کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہی محسوس کرکے افسوس ہوتا رہا کہ میں کتنے قیمتی اور خوشگوار لمحے اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔۔۔ یہ سارا کچھ کتنی تیزی سے دُھول کے مرغولوں میں گم ہوتا ہوا لگتا ہے۔ ان لمحوں کو قید کرکے اپنے ساتھ لے جانا ناممکن تھا۔۔۔ وہ لمحے اتنے خوبصورت تھے کہ وہ مجھے اونچے البیلے جاٹوں کی ہی ایک شبیہہ معلوم ہونے لگتے تھے۔۔۔ لیکن وہ لمحے سڑک کے کنارے دور تک بہتی ہوئی پانی کی ٹلیا جیسے بھی لگتے تھے۔۔۔ اور آسمان پر اُڑتے ہوئے آزادی کے نشہ میں چور پنچھیوں کی مانند بھی۔۔۔ اور اچانک میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہی لمحے میرے پاس گاڑی کے اندر برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی افسردہ، اپنے خیالوں میں گم ایک حسین عورت بھی بن گئے ہیں جو بیوہ ہو کر بھی بیوہ نہیں لگتی ہے۔ بس اُداس ہی معلوم ہوتی ہے۔

میں نے ابھی تک اُس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ دہلی میں سروس کیوں نہیں کرنا چاہتی ہے؟ چنڈی گڑھ میں تو وہ یقیناً خوش نہیں رہ سکے گی۔ یہ میں سمجھ چکا تھا۔۔۔ لیکن اُس کے والد نے اُس کے مالیر کوٹلہ جانے پر جو اندیشہ ظاہر کیا تھا اُس کا حقیقی سبب کیا تھا؟ اُس کے بھائی اور بھابھی اُسے دیکھ کر کیوں خوش نہیں ہوں گے؟

ان سوالوں کے جواب یقیناً اس کے پریوار کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اور اس بارے میں کچھ پوچھنے کا مجھے کوئی حق بھی نہیں تھا۔ اگر میں زور دیتا تو ممکن ہے وبھا بتا بھی دیتی۔۔۔ لیکن ایسا کرکے وہ رو بھی

ضرور دیتی ــــ اس بات کا بڑا امکان تھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ اندر سے بہت دُکھی ہے۔ اس لئے اُس کے ساتھ کوئی بات چھیڑنے کے بجائے میں نے خود کو کار کے باہر بکھری ہوئی، پھیلی ہوئی ساری فضا کی آغوش میں دے دینا زیادہ بہتر سمجھا ــــ ونڈ اسکرین سے جو آسمان دکھائی دے رہا تھا وہ ایک لمبی چادر کی طرح اوپر ہی اوپر سے سرکتا چلا جاتا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور کاروں میں جانے والے لوگ ہماری طرف خاموش نظروں سے دیکھتے ہوئے ــــ نکل جاتے تھے۔ ہر نگاہ توصیفی تھی۔ ہر نگاہ اپنی انفرادی مسرّت کی غمّاز تھی۔ میرے اندر بھی تو مسرّت کا ایک جذبہ موجود ہے۔ میں نے اس مسرّت سے اکیلے ہی لطف اُٹھانے کا جتن کرنا زیادہ اچھا سمجھا ــــ جب سب لوگ مسرور ہوں تو ہم بھی کیوں مسرور نہ ہوں! ان لمحوں کو بھلا کیوں نہ دیا جائے جو ہمارے نہیں ہیں ــــ انہی لمحوں کے ساتھ کیوں نجیا جائے جن پہ ہمارا اختیار ہے۔

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وِبھا پنڈت کی طرف وہ بھی وہی کچھ دیکھتی آ رہی تھی جو گاڑی کے ونڈ اسکرین کے آگے پھیلا ہوا تھا ــــ اور ایک ہی لمحے میں گذر بھی جاتا تھا۔ اور پھر ــــ اور بہت کچھ ویسے کا ویسا یا پہلے سے بھی کوئی زیادہ دلفریب، زیادہ دلچسپ منظر سامنے آجاتا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ قریب لمحہ بہ لمحہ دُور!

اب وہ بھی اتنی اُداس نہیں نظر آتی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نام کی کوئی چیز نہیں نظر آتی تھی۔ وہ بس پُرسکون سی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے اُس کے اندر ہر چیز، ہر لہر ٹھہر گئی تھی۔ بڑے توازن سے اور رفتہ رفتہ۔

میں نے پوچھا ــــ "کیا سوچ رہی ہیں؟"

اس نے بڑے سکوت سے جواب دیا ــــ "کچھ نہیں ــ"

اُس نے میری طرف چونک کر دیکھا۔

"کچھ تو سوچئے ــ"

"کیا سوچوں ــ؟"

"کم سے کم یہی کہ ہرے ہرے، اُجلے اُجلے لباس پہنے ہوئی یہ فصلیں کتنی بھلی لگ رہی ہیں! آنکھوں کو اور دل و دماغ کو!"

"میں سوچ رہی ہوں"

"پھر، کیسا لگ رہا ہے؟"

"ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔"

"ذرا اُدھر دیکھو ــــ اُس ٹریکٹر پر جو نوجوان کسان بیٹھا ہے اور ٹرانزسٹر پر لتا کا گانا سُن رہا ہے! وہ کتنا معصوم مگر شُور بیر نظر آتا ہے ــ!"

اُس نے سر گھما کر کسان کی طرف کئی لمحوں تک دیکھا ــــ مگر کہا کچھ نہیں۔

"میرا جی چاہتا ہے، گاڑی روک کر اُس کے پاس جاؤں!"
"کیوں؟" اُس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔
"اُس کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے۔"
"کونسی باتیں؟"
"مثلاً یہی کہ یہ کھیت ہمیشہ ہرے بھرے رہیں، وہ سب محنت کرتے رہیں اور مستی دکھاتے رہیں۔"
"کھیت بھی ہرے بھرے ہیں اور وہ لوگ مست بھی ہیں۔"
"لیکن کبھی کبھی یہ سب رک کیوں جاتا ہے؟ ٹریکٹروں کی گھڑگھڑاہٹ اچانک بند ہو جاتی ہے اور فصلیں اُداس ہو جاتی ہیں۔ وہ لوگ گانا اور ناچنا بھول جاتے ہیں! میں اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں ـــــ"

"یہ بے چارے کیا بتا سکیں گے؟ ان کے اختیار میں تھوڑی ہی ہے ـــــ"
"پھر کس کے اختیار میں ہے؟"
"وہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں ـــــ اچانک آجاتے ہیں ـــــ"
"کون لوگ! کہاں سے آجاتے ہیں وہ؟"
"کیا معلوم! یہ تو پولٹکس ہے ـــــ"
صرف پولٹکس یا دہشت گردی؟"
"دونوں ـــــ"
"سنا ہے کئی گروپ اُن کے ـــــ ایک دوسرے سے آزاد ـــــ ڈاکے بھی ڈالتے ہیں ـــــ بنک لوٹ لیتے ہیں ـــــ پُرانی دشمنیاں نکالتے ہیں ـــــ قتل کرتے ہیں ـــــ اغوا کرتے ہیں ـــــ" میں جیسے واقعات پر تبصرہ کر رہا تھا۔
"یہ سب صحیح ہے ـــــ" اُس نے میری تائید کی۔
"لیکن یہ سب غلط بھی تو ہے ـــــ"
"ہاں غلط تو ہے ہی ـــــ!"

"انسانوں کی اپنی زندگی میں کتنا کچھ غلط ہو جاتا ہے ـــــ" میں نے ویو مرّر کا زاویہ ٹھیک کرتے ہوئے اُسی میں سے اُس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی ـــــ "لیکن انہیں اس کا احساس تب ہوتا ہے جب سب کچھ بکھر چکا ہوتا ہے ـــــ"
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ اُسی لمحے ایک جاٹ سر پر گھاس کا بڑا سا گٹھا اٹھائے، جس میں اُس کا سارا وجود قریب قریب چھپا ہوا تھا سامنے سے آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ سڑک کے کنارے ایسا لگتا تھا گھاس کا ایک پہاڑ چلا آ رہا ہے۔ اُس کے پاس پہنچ کر میں نے اچانک

گاڑی روک لی اور زور سے ہارن بھی بجا دیا۔ وہ گھبرا کر ایسا بدکا کہ اُس کے سر سے گٹھڑ نیچے گر پڑا اور وہ بھاگ کر ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہماری طرف بہت گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تو میں ہنس پڑا۔ اس نے بھی کھسیا کر ہنسی نکال لی۔ گھنی داڑھی مونچھوں کے بیچ میں سے ——

"یہ گھاس بیچو گے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں باؤجی۔ بھینس لئی ای لے جا رہیا آں! پر تسی کی کرو گے جی؟"

"اپنی گاڑی کو کھلاؤں گا ——" میں نے اُسے جواب دیا —— "بہت دنوں سے اس نے ہری ہری گھاس نہیں چکھی ہے ——"

میں نے مسکرا کر وبھا کی جانب بھی دیکھا —— لیکن اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا

چلاٹ ہنس کر بولا —— "باؤجی، مذاق کر دے او! آپ جی دی گڈی تاں پٹرول پیندی اے!"

"ہاں یار —— لیکن ہر وقت ایک ہی چیز پیتے رہنا بھی اچھا نہیں لگتا —— کبھی کبھی ذائقہ بدلنا بھی چاہیے —— لو، پانچ روپے لو اور ساری گھاس کو اُوپر ڈال دو ——"

اُس نے خوش ہو کر پانچ کا نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اُسے اپنی تہمد کی ڈب میں کھونسا اور گھاس کا گٹھڑ اُٹھا کر کار کے اوپر جنگلے میں ڈال دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے گاڑی پھر اسٹارٹ کی تو وبھا پنڈت نے پوچھا —— "گھاس کا کیا کیجیے گا؟"

"راستے میں کسی گائے بھینس کے آگے ڈال دوں گا —— اب ظاہر ہے یہ گاڑی تو کھائے گی نہیں!"

لیکن میرے ہنس دینے پر وہ ہنسی نہیں —— اگرچہ اُس کے چہرے کی کیفیت کچھ بدل گئی تھی۔ اُس نے اپنی مسکراہٹ کو کہیں اندر ہی روک لیا تھا، بڑی کامیابی سے۔

"دراصل میں آپ کی خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا —— آپ کھل کر کوئی بات ہی نہیں کرتیں۔ اتنا لمبا سفر کیسے کٹے گا ہے؟"

اُس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا —— "اگر میں کچھ نہیں کہتی تو آپ ہی باتیں سناتے رہیے"

اُس نے ٹھیک کہا تھا —— مجھے ہی بولتے رہنا چاہیے۔ وہ میری طرف متوجہ رہتی ہے۔

"اچھا ٹھیک ہے —— میں ہی بولتا رہوں گا —— پھر نہ کہیے گا کہ میرے منہ سے کوئی بے سر پیر کی بات نکل گئی!" یہ کہہ کر میں ہنس پڑا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پوچھا —— "آپ دوسری شادی کریں گی؟"

اتنے اچانک اور واضح سوال کی اُسے توقع نہیں تھی —— اُس کے چہرے پر اُبھری ہوئی حیرت کو میں نے بھانپ لیا —— اور کہا،

"آپ کو پہلی ہی نظر میں میں اپنا دل دے بیٹھا تھا —— یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔ آپ کو تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ ہم دونوں نے ایک ہی ہال میں بیٹھ کر بی ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ آپ

کی سیٹ ٹھیک میرے آگے ہوتی تھی ــــ "

یہ سن کر اُس نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا ــــ کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ جیسے میری موجودہ شکل وصورت میں کوئی بھولا بسرا چہرہ تلاش کرنے کی سعی کر رہی ہو۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ اُبھر سکی۔ وہی مسکراہٹ جس کا خزانہ اُس کے اندر موجود تھا لیکن اسے وہ افشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ مجھے معلوم تھا یہی مسکراہٹ اُس کی شخصیت کا ایک خاص امتیاز تھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا وہ اپنی اس خصوصیت سے اب محروم ہو چکی ہے ــــ پُرانی یاد دلانے پر بھی اُس کی آنکھوں میں چمک نہیں پیدا ہوئی ــــ لیکن اُس نے یہ اعتراف فوراً کر لیا۔

"جی ہاں ــــ یاد آیا ــــ آپ کا رول نمبر ایک ہزار بائیس ۱۰۲۲ تھا !"

"اور آپ کا دو ہزار ایک سو چون !" اُس کا رول نمبر مجھے بھی ابھی تک یاد تھا۔

"میرا رول نمبر آپ کو ابھی تک کیسے یاد ہے ؟"

"یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتا ہوں !"

"کچھ دیر چپ رہ کر اُس نے پوچھا ــــ آپ پاس ہو گئے تھے ــــ"

"جی ــــ اور آپ بھی تو ! میں نے رزلٹ دیکھ لیا تھا ــــ"

وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"پاس ہو جانے کے بعد آپ کیا کرتی رہیں ؟"

"ایک اسکول میں سائنس پڑھاتی رہی ــــ"

وہ سر جھکا کر بولی ــــ "اور آپ ؟"

"میں ؟" ــــ میں نے یاد کرتے ہوئے بتایا ــــ "میں نے بہت سے کام کئے۔ ایک پریس میں پروف ریڈنگ کی جہاں یونیورسٹی کے فارم اور پراسپکٹس وغیرہ چھپتے تھے۔ ایک انشورنس ایجنٹ کا سب ایجنٹ رہا جو مجھے پچیس فی صد کمیشن دیدیتا تھا۔ ایک پولیٹیکل پارٹی کے لئے الیکشن کے زمانے میں پوسٹر اور ہینڈ بل لکھے۔ ساتھ ساتھ بزنس منیجمنٹ کا کورس بھی کرتا رہا۔ جب ڈپلوما مل گیا تو اسی فرم میں سروس مل گئی جہاں آج ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو آج آپ سے ملاقات بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ شاید ہمارے ستارے ایک خاص سمت میں گردش کر رہے تھے ــــ "

"آپ ستاروں کے کرشمے میں وشواس رکھتے ہیں ؟"

"نہیں بھی رکھتا لیکن محاورہ تو استعمال کر ہی سکتا ہوں !"

اُس نے ہنسنے میں میرا ساتھ نہیں دیا ــــ خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی ــــ لیکن میں ابھی تک اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

"شادی کب کی ؟ اسکول میں سروس پانے کے فوراً بعد کر لی تھی ؟"

"نہیں — فوراً تو نہیں — پاپا کے پاس اتنا روپیہ ہی نہیں تھا — ہمارے اسکول کے پرنسپل نے پنجاب کا ریاستی الیکشن لڑا۔ ہم سب ٹیچروں کو گھر گھر جاکر پروپیگنڈہ کرنے کا کام سونپا گیا۔ میں اُن کی انچارج تھی — پرنسپل کی تقریروں کے پریس ریلیز بھی تیار کر دیتی تھی۔ وہ الیکشن جیت گئے — اتفاق سے منسٹر بھی بنا دیے گئے۔ وہ میرے کام سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے مجھے اپنا پرسنل سیکریٹری مقرر کر لیا۔ تنخواہ اچھی ملنے لگی — لیکن دو ہی سال بعد منسٹری ٹوٹ گئی۔ کولیشن کی وجہ سے بنی تھی نا — میں پھر پڑھانے کے لئے اسکول واپس چلی گئی — انہی دنوں سوشیل کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا — پھر شادی —"

"سوشیل تو بہت ہی آدرش وادی تھا — اُس نے جہیز وغیرہ کچھ نہیں لیا ہوگا۔ اور آپ کے پاپا زیر بار بھی نہیں ہوئے ہوں گے!"

"کوئی جہیز نہ لے تب بھی مڈل کلاس دکھاوے پر بہت خرچ کر دیتی ہے۔ پاپا کا پروویڈنٹ فنڈ اور میری تنخواہ سے بچا بچا کر رکھا ہوا سارا روپیہ خرچ ہوا۔ اُسی میں بھیا کی تعلیم بھی کچھ ڈسٹرب ہوئی — لیکن پاپا کے ایک دوست نے اُن سے اپنی لڑکی بیاہ دینے کی لالچ میں اُن کی فیسیں ادا کیں۔ تب ہی وہ ڈاکٹر بن سکے —"

"آپ کے بھیا ڈاکٹر ہیں جن کے پاس آپ جائیں گی —"

"جی —"

میں نے اچانک ایک جگہ گاڑی روک لی — اسٹرینگ پر جھک کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — "میں نے ایک بات پوچھی تھی آپ سے! اُس کا جواب نہیں ملا ابھی تک —"!

"کونسی بات؟"

"آپ دوسری شادی کریں گی؟"

"لیکن گاڑی کیوں روک لی آپ نے؟ آگے بڑھائیے —" وہ خاصی نروس ہو کر بولی۔ وہ چاہتی تھی گاڑی چل پڑے تو شاید میرا سوال بھی کہیں پیچھے چھوٹ جائے گا۔ لیکن میں گاڑی اسٹارٹ نہیں کی — کہا —

میں جانتا ہوں — سوشیل بہت اچھا لڑکا تھا — بالکل تمہارے قابل — آپ اُس یقیناً بہت محبت کرتی ہوں گی — لیکن انسان کی زندگی میں اچانک کئی موڑ آجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو اُٹھتا ہے — کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کوئی فیصلہ کرنے میں اُلجھن محسوس کر رہی میرا مطلب ہے کوئی جذباتی دشواری!"

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو اُس نے اُنہیں چھپانے کے لئے سر جھکا لیا — یہ دیکھ مجھے افسوس ہوا کہ یہ سب اُس سے کیوں کہہ دیا ہے؟ اگرچہ میرا سوال نامناسب ہرگز نہیں تھا۔

کے لیئے ایک مناسب لمحہ ہوتا ہے ___ شاید وہ ابھی دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی ہے۔
میں نے اُس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔
"آئی ایم ساری! میں نے آپ کا من دکھی کیا ___ لیکن میں سچ مچ آپ سے محبّت کرتا ہوں اور آپ کی مدد بھی کرنا چاہتا ہوں ___ میں نے ابھی شادی نہیں کی ہے ___ میں انتظار کر سکتا ہوں!"
یہ کہہ کر میں نے گاڑی آگے بڑھانی چاہی تو اُس نے اسٹیرنگ پر رکھے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ___ روہانسی ہو کر بولی۔
"آپ سے میں پرارتھنا کرتی ہوں، جلد بازی سے کام مت لیجیے ___ ہمارا ایک دوسرے کو جان لینا ضروری ہے ___ آپ مجھے بالکل نہیں جانتے ہیں ___ سوائے اس بات کے کہ ہم دونوں نے دس سال پہلے ساتھ ساتھ ایگزام دیا تھا ___ اُس کے بعد میں کیا ہوں ___ آپ کو بتانا مشکل ہے"!
ان لمحوں میں وہ مجھے بہت ہی سچی، کھری اور معصوم نظر آئی ___ بے حد خوبصورت بھی ___ اُس کے بال ڈھیلے ہو کر کانوں پر اُتر آئے تھے ___ جنہیں وہ پیچھے نہیں ہٹا رہی تھی لیکن اُس کے حُسن کی تعریف کرنے کا یہ موقعہ نہیں تھا ___ میں نے اُس سے اپنی محبّت جتا کر اُسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا ___ کیا یہی کافی نہیں تھا کہ اُس نے شادی کے گٹھ بندھن میں بندھنے سے پہلے ایک دوسرے کو جاننے کے لیئے وقت مانگا تھا ___ اور اپنے بارے میں کچھ ایسا اشارہ دیا تھا کہ میرے لیئے اُس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لینا ضروری تھا ___ اُسی کے کہنے کے مطابق ___ ورنہ میں تو اُسے جیسی بھی وہ تھی، جس حال میں تھی، قبول کرنے کے لیئے تیار تھا ___ کیونکہ اُس کے بغیر میں اپنی زندگی بے معنی سمجھتا تھا۔
وہ اُس وقت اپنے باپ کے پاس رہ رہی تھی۔ جہاں وہ مطمئن نہیں تھی ___ یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا ___ اُس کا یہ سوچنا قابلِ تعریف تھا کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی پر اپنی ذمّہ داری نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔
میرے ہاتھ پر ابھی تک اُس کا ہاتھ رکھا ہوا تھا جسے میں نے جان بوجھ کر نہیں کھینچا تھا ___ وہ بھی اس سے بے خبر تھی۔ اچانک ہمارے پیچھے سے ایک ٹریکٹر گھر گھراتا ہوا ہمارے پاس پہنچ کر آگے نکلا تو اُس پر بیٹھے ہوئے ایک سکھ جاٹ نے زور سے پکار کر کہا ___ بادشاہو، محبّتاں ہی کرتے رہو گے یا اپنے چارے کا بھی کچھ دھیان کرو گے؟ ذرا مڑکے دیکھو تاں!!"
میں نے سر گھما کر دیکھا ___ ایک گائے واقعی گردن اُونچی کرکے گاڑی کے اُوپر رکھی ہوئی گھاس نوچ نوچ کر کھا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر گائے نے پورا گھاس کا گٹھڑ کھینچ کر نیچے گرا لیا اور اُسے منہ سے کھینچتی ہوئی ایک طرف بھاگ گئی ___ ٹریکٹر والا ابھی تک ہمیں پلٹ پلٹ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے گاتا بھی جا رہا تھا۔

لڈو کھا کے چبار یوں اُتری
کیڑیاں نے پیڑ کڈھ لئی

(دتُو تو چوبارے پر لڈو کھانے کے بعد اُتر کر چل بھی دی لیکن چیونٹیوں نے مٹھاس کے نشان پا کر تعاقب کرنا شروع کر دیا ہے۔)

اُس نے بڑے علامتی انداز میں ہمیں خبردار کر دیا تھا ـــــ اُس کے زندہ دلی سے بھرپور تبصرے پر میں خوش ہو اُٹھا ـــــ اور کھڑکی سے ہاتھ نکال کر سردار کی طرف لہرا دیا۔

نو ۹

پٹیالہ جانے کے لئے ہم نے انبالہ سے پہلے ہی بائی پاس اختیار کر لیا تھا — اب ہم وہاں سے تھوڑی دور رہ گئے تھے — پنجابی یونیورسٹی کی عمارتیں چار پانچ کلومیٹر پہلے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ وائس چانسلر کے دفاتر، آرٹ بلاک، بھاشا وبھاگ، رجسٹرار کا دفتر وغیرہ۔ ایک جانب دھرتی کے سینے پر کئی پوری اور ادھوری عمارتیں تھیں۔ ان کے درمیان خاصی اونچائی پر بنائی گئی پانی کی ایک ٹنکی دکھائی دی۔ ایک غیر معمولی قد آور شخص کی طرح جو اپنے آس پاس چھوٹے قد والوں کو بڑی تمسخرانہ نظروں سے دیکھ رہا ہو۔

وہیں ہمیں کئی رنگ برنگے شامیانے اور تمبو بھی گڑے ہوئے دکھائی دیے۔ جدھر کھیل کے میدان تھے — وہاں بہت سی لمبی لمبی قطار در قطار کھڑی کی ہوئی تھیں۔ مختلف صوبوں سے آئی ہوئیں — اُن پر الگ الگ رنگوں اور مونوگراموں کے جھنڈے لہرا رہے تھے — بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی بھیڑ بھی دکھائی دی جو مختلف قسم کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہماری سمجھ میں فوراً نہ آسکا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔

میں نے کار کا رخ اسٹاف کوارٹرز کی جانب موڑ دیا۔

وہاں چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی کئی قطاریں تھیں — اُن کے درمیان چھوٹی بڑی پکّی سڑکیں — کہیں کہیں اینٹوں روڑی اور مٹی کے ڈھیر بھی لگے تھے — تارکول کے سیکڑوں کالے ڈرم بھی آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے — روڑی کوٹنے والا بھاری اسٹیم رولر بھی بھک بھک دھواں اُگلتا ہوا دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔

سڑکوں کے کنارے کنارے پیڑ لگانے کے لئے لوہے کے بے شمار "ٹری گارڈز" لگائے گئے تھے جن پر دو نوعمر سکھ لڑکے روغن کرتے پھرتے تھے۔ جو کوارٹر آباد ہو گئے تھے اُن کی باؤنڈری کے اندر سے پودے جھانک رہے تھے۔

میں نے ایک بنگلے کے اندر بے شمار خوبصورت پودے دیکھے —— دیواروں پر چڑھی ہوئی پھولوں کی بیلیں —— املتاس اور رباطل برش کے پیڑ —— میں نے وہیں گاڑی روک لی —— سڑک کے اُس پار۔

"میرے ٹیچر کو ہمیشہ سے پھولوں اور پودوں سے عشق رہا ہے۔ وہ فطرت کا بہت بڑا عاشق ہے۔ اسی نے اُسے زندگی سے بھی محبت کرنا سکھایا ہے —— "

لوہے کے گیٹ کے ساتھ ایک نیم پلیٹ لگی تھی۔ "پروفیسر حضور سنگھ"

وبھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی سے باہر بھی نہ نکلی —— اُس کی جھجک کو میں سمجھتا تھا۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا —— اپنے اُستاد سے وِبھا کا تعارف کیا کہہ کر کراؤں گا؟ لیکن میرے اندر ویسی گھبراہٹ نہیں تھی۔

کھڑکی میں سر ڈال کر میں وبھا کی بڑی بڑی جذباتی آنکھوں میں ڈوب کر مُسکرایا اور کہا، "باہر آجایئے —— یہ گھر بالکل اپنا ہے —— "

لیکن وہ اُسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی —— میری طرف بنا پلکیں جھپکے دیکھتی رہی جیسے مجھے باور کرانا چاہتی ہو —— یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھتے ہو —— تم یہ کیوں محسوس نہیں کرتے کہ میں کتنا بے تُکا سمجھ رہی ہوں اس وقت یہاں چلے آنا!"

لیکن میں نے بڑے پُر اعتماد اور جرأت آمیز لہجے میں کہا —— "ہم بھلے ہی مرد اور عورت ہیں۔ رشتے میں ہم ایک دوسرے کے کچھ نہ سہی، لیکن دو انسانوں کی طرح تو کہیں بھی آجا سکتے ہیں —— ہمارے درمیان یہی ناطہ کیا کم ہے کہ ہم انسان ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کی عزّت کرتے ہیں! ہم اُس ٹریجڈی سے اوپر اُٹھ کر جس نے تمہیں بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے ایک دوسرے کا ساتھ تو دے سکتے ہیں! کیا ہمارے سر اونچا کر کے چلنے کے لئے یہی انڈرسٹینڈنگ کافی نہیں ہے؟"

وِبھا پنڈت نے مجھ پر سے اپنی آنکھیں نہیں ہٹائیں —— آج میں نے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت پہلی بار اُبھری ہوئی دیکھی —— جس میں انکار نہیں تھا —— بس ایک تامّل تھا۔ کچھ بے بسی بھی تھی —— پھر وہ دھیرے سے سرک کر باہر آگئی —— میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی —— اپنی ساڑھی ٹھیک کرنے لگی —— دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُس نے اپنے بالوں کو چھُوا جو ڈھیلے ہو گئے تھے —— کانوں اور گردن پر اُتر آئے تھے —— اُس نے جلدی جلدی اپنے بالوں کو سمیٹا۔ سنہری دھوپ میں اُس کے بال چمک رہے تھے —— میرے لئے اُس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا۔ جیسے میرے اندر کچھ جل رہا تھا —— جی چاہتا تھا پل بھر میں اُس کا سارا دُکھ، ساری اُداسی، ساری خاموشی اپنے اندر اُتار لوں —— اپنی روح میں جذب کر لوں —— اور وہ اچانک مُسکرا اُٹھے —— اُس کی آنکھوں

کے دیے جگمگا اُٹھیں۔

میں اُس سے اپنے من کی بات نہ کہہ سکا ـــ آگے بڑھ کر کار کے شیشے چڑھائے اور گاڑی بند کر کے اُس کے آگے آگے چل پڑا ـــ ہم نے بکھری ہوئی اینٹوں پر چل کر سڑک پار کی۔
لیکن سنبھل سنبھل کر ـــ کہیں گر نہ پڑیں ـــ میں نے اُس کی طرف بے اختیار ہاتھ بڑھا دیا اور اُس نے تھام بھی لیا ـــ یاد آیا، بچپن میں اسی طرح اینٹوں پر بھاگتے ہوئے نکل جاتا تھا۔ کبھی کسی کا ہاتھ ہاتھ میں آجاتا کبھی نہیں آتا تھا۔ پھسل کر گر جاتا تو خود ہی کھِل کھلا کر ہنس پڑتا تھا ـــ دوسروں کے ہنسنے سے پہلے ہی ـــ اور کبھی سُبکی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ جیسے گرپڑنا بھی ایک دلچسپ کھیل ہو ـــ!
پتہ نہیں وبھا نے ان لمحوں میں کیسا محسوس کیا تھا؟ اُس نے بھی تو بچپن میں اسی طرح کی شرارتیں کی ہونگی! اور کئی بار گری بھی ہوگی! بچپن تو قریب قریب سب ہی کا ایک سا ہوتا ہے ـــ معصوم، آزاد، کھلنڈرا اور سہاؤنا!

لیکن وبھا کے چہرے پر پہلے جیسا سکوت طاری تھا۔ نئی نئی بنی ہوئی سڑک کے کنارے ریت بھی بکھری ہوئی تھی ـــ اُس میں چلتے ہوئے ہمارے جوتوں پر دُھول جم گئی ـــ سڑک پر پہنچ کر زور زور سے پاؤں پٹخنے تو کچھ دُھول اُتر گئی۔ لیکن مجھے ہم دونوں کا اس طرح پاؤں پٹخنا اچھا لگا۔
بنگلے کے سامنے پہنچے تو اندر سے کچھ لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں ـــ ہم برآمدے ہی میں رُک گئے۔ ان آوازوں میں سردار حضور سنگھ کی آواز نمایاں تھی ـــ اُن کی سردارنی جی کی بھی۔ دونوں کے قہقہے ہمیشہ زندگی اور زندہ دلی سے بھرپور رہے تھے ـــ اُن کے یہی بےساختہ قہقہے اُن کی شخصیتوں کے غمّاز تھے ـــ

میں نے کال بیل پر انگلی رکھی تب بھی اُن کے قہقہے گونجتے رہے ـــ انہی کے درمیان میں نے آنٹی کے قدموں کی چاپ سُنی ـــ انہیں میں ہمیشہ آنٹی ہی کہتا تھا ـــ انہوں نے جالی کے دروازے کے پٹ کھول کر ہمیں دیکھا۔ پہلے حیرت سے ـــ پھر مجھے پہچان کر وہ خوشی سے چیخ پڑیں۔
"ارے سریش! تم! آج اچانک کیسے راستہ بھول گئے؟" انہوں نے لپک کر مجھے گلے سے لگالیا۔
پروفیسر حضور سنگھ نے میرا نام سن کر اندر سے پکارا، خوشی سے بھرے ہوئے لہجے میں ـــ
"کون؟ سریش آیا ہے! سریش نندا! آجاؤ بیٹا، چلے آؤ"
میں نے دونوں میاں بیوی کے باری باری سے پاؤں چھوئے ـــ آنٹی نے اب میرا سر چوما۔ بار بار چوما۔

جب میں نے اُن سے وبھا پنڈت کا تعارف کرایا تو آنٹی نے اُس کا بھی بار بار سر چوما ـــ یہی اُن کا سُبھاؤ تھا۔ جس میں بے پناہ شفقت تھی ـــ بے حد اپنا پن تھا۔
وہاں تین لوگ اور بھی موجود تھے ـــ جن کا تعارف پروفیسر صاحب نے کرایا۔

"پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر نریش کمار"،
چنڈی گڑھ کی بھنگڑا پارٹی کے ڈائریکٹر سردار لابھ سنگھ جن کا تعلق پنجاب سرکار کے کلچر کے محکمے سے تھا۔
اور اسی پارٹی کا ڈھول بجانے والا غریب داس جسے پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ ثقافت سے گولڈ میڈل بھی مل چکا تھا ——— پروفیسر حضور سنگھ کے قول کے مطابق وہ بڑا گنی آدمی تھا۔
میں نے سب کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور انہیں بڑے غور سے دیکھا ——— وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔
"فوجاں کتھوں آ رہیاں نے؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا۔
"میں تو بمبئی سے آ رہا ہوں۔ کل رات کو دہلی پہنچا تھا ——— مالیر کوٹلہ جانا ہے ——— دہلی سے ان کا ساتھ ہو گیا ——— یہ بھی وہیں جا رہی ہیں ———"
بس اتنے سے ہی اشارے سے دیکھا پنڈت کے ساتھ میرے تعلقات ان پر واضح ہو گئے ——— اس کے بعد نہ کوئی سوال نہ ہی وضاحت ——— وہ اتنا ہی کہہ کر چپ ہو گئے ——— "واہ جی واہ! بڑی خوشی ہوئی مل کے ———"
میاں بیوی، دونوں ہی اب پچاس پچپن کے پیٹے میں تھے ——— اور ہمیشہ کی طرح سرخ و سفید اور تر و تازہ ——— اگرچہ دونوں کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی ——— لیکن ان کے چہروں سے جوانوں کی سی بشاشت ٹپکتی تھی ——— نریش کمار دبلا پتلا اور اونچے قد کا نوجوان تھا ——— گورا چٹا ——— وہ وسھا پنڈت کو دیکھ کر کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔
سردار لابھ سنگھ بھرے بھرے جسم کا چھوٹے قد کا سردار تھا ——— داڑھی مونچھیں تراشیدہ اور سرخ مہندی سے رنگی ہوئیں ——— ان کی پگڑی بڑے اسٹائل سے بندھی ہوئی تھی۔ پنجاب کے سابق راجواڑوں جیسی ——— انہیں دیکھ کر یاد آیا ان کا تعلق فلموں سے بھی ہے۔ میں نے پوچھ بھی لیا ———"
سردار جی، آپ تو پنجابی فلموں کے مشہور آرٹسٹ ہیں!"
پروفیسر صاحب نے کہا ——— "ہنجی یہ وہی آرٹسٹ ہیں ——— بہت سی فلموں میں کام کیا ہے اور فلموں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ بیشمار ایوارڈ لے چکے ہیں ———"
میں نے ان کے ساتھ ایک بار پھر ہاتھ ملایا ——— "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ——— میں تو آپ کا فین ہوں ———"
غریب داس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ بڑے بڑے گل مچھے، سر پر اونچے شملے والی رنگین پگڑی۔ بدن پر قمیض پاجامہ اور کوٹ ——— ڈھول کے حوالے سے اس کا تعارف سنتے ہی میرے دل و دماغ میں ڈھول کی آواز گونج گونج گئی۔
پروفیسر حضور سنگھ بولے ——— "بڑے اچھے موقع پر آئے ہو ——— یہاں یوتھ فیسٹیول ہو

رہا ہے۔ ہندوستان کے کئی صوبوں سے ٹیمیں آئی ہیں۔ شام کو بڑا جشن رہے گا ــــ ابھی تھوڑی دیر میں جلوس بھی نکلنے والا ہے۔"

یہ سن کر میں نے وبھا کی طرف دیکھا ــــ آنٹی اُسے اپنے پاس صوفے میں بٹھائے اُسی فیسٹیول ہی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ وہ بار بار اُس کا سر بھی چومنے لگتی تھیں جس سے وبھا کو بڑی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

پھر اچانک آنٹی اٹھ کر بولیں ــــ "ہائے، میری تاں مت ہی ماری گئی! چائے پیو گے یا کھانا کھاؤ گے۔ دونوں چیزیں تیار ہیں!"

میں نے کہا ــــ "کھانا راستے میں ایک ڈھابے پر کھا لیا تھا ــــ لیکن آپ کے پاس آ کر پھر بھوک لگ گئی ہے۔"

یہ سن کر وہ مسکرا دیں اور آگے بڑھ کر میرا سر چوم لیا ــــ "جیوندے رہو۔ میرے پُتر! تمہیں کھانا ہی کھلاتی ہوں ــــ آج تو تیری من پسند چیزیں بنی ہوئی ہیں ــــ سرسوں کا ساگ گرم گرم مکئی کے ڈھوڈھے! اور لسّی بھی ہے۔"

"میں نے خوش ہو کر پوچھا ــــ اور مکھن؟ وہ بھی تو ملے گا نا!"

"ضرور ملے گا ــــ ڈھیر سارا ملے گا ــــ جتنا کھا سکو ــــ واہگورو کی بڑی کرپا ہے ــــ!"

اُس نے جاتے جاتے میرے سر پر ایک اور بوسہ دے دیا ــــ اور اپنے ساتھ وبھا کو بھی رسوئی میں چلنے کا اشارہ کیا۔

"بس تو یہاں آنا میرا سپھل ہو گیا ــــ انہی ساری نعمتوں کے بارے میں راستے میں مسز وبھا پنڈت کو بتاتا چلا آیا ہوں۔ پوچھ لیجیے ان سے ــــ"

یہ سن کر آنٹی کا چہرہ خوشی سے اور بھی لال ہو گیا۔ میں سمجھ گیا، اب وہ پھر آگے بڑھ کر میرا سر چومے گی۔ میں نے خود ہی اپنا سر آگے کر دیا ــــ اس پر سب لوگ زور سے ہنس پڑے۔ آنٹی نے وبھا ہی کیا لیکن میری پیٹھ پر ایک دھپ بھی جما دی ــــ پیار بھری ــــ اُن کے کردار کا یہ ایک خاص وصف تھا۔ بار بار دوسروں کے سر کو چوم لینا ــــ جن کو وہ واقعی بہت پیار کرتی تھیں ــــ ہمارے مذاق کا وہ کبھی بُرا نہیں مانتی تھیں۔

سردار حضور سنگھ نے کہا ــــ "تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہم ایک بہت ہی دلچسپ موضوع پر بات کر رہے تھے۔ غریب داس کے بیٹے کے بارے میں ــــ تم نے ابھی تک اُسے نہیں دیکھا۔ ابھی ملاتا ہوں اُس سے بھی ــــ"

پھر وہ ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولے ــــ "اُدھر دیکھو تو، غریب داس جی اُسے کتنے اچھے کپڑے پہنا کر لے آئے ہیں ــــ!"

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی ـــ ڈرائنگ روم میں کوئی بچّہ دکھائی نہیں دیا تو میں نے حیرانی سے سب کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ میری کھلاہٹ سے خوب لُطف اندوز ہوئے ـــ پروفیسر صاحب بولے۔
"ایک بار پھر غور سے دیکھو ـــ وہ اسی کمرے میں موجود ہے ـــ"
میں نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر بھی وہاں کوئی بچّہ دکھائی نہیں دیا تو میں صوفوں اور کرسیوں کے پیچھے جھانکنے لگا شاید وہ وہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔
مجھے ایسا کرتے دیکھ کر انہوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ اُسی لمحے آنٹی نے وہاں آکر بتایا ـــ
بیٹا، یہ تمہیں بدھو بنا رہے ہیں ـــ غریب داس کا بچّہ تو تیرے پاس ہی صوفے پر موجود ہے ـــ"
میرے پاس خوبصورت ریشمیں کپڑوں میں ایک ڈھول ہی رکھا ہوا تھا۔ اس پر پھول اور پتّیاں بھی کاڑھی گئی تھیں۔ گوٹا کناری کا کام بھی کیا ہوا تھا۔ اور رنگین ڈوریوں کے ساتھ چاندی کے ننھے ننھے گھنگھرو بھی ٹکے ہوئے تھے۔

اب تو مجھے خود اپنے آپ پر ہنسنا پڑ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر ڈھول کو چھوا اور اُسے ذرا سا بجا کر بھی دیکھا۔ سردار جی بولے ـــ "یہی تو غریب داس جی کا بچّہ ہے۔ اکلوتا بچّہ ـــ اسے وہ بڑی حفاظت سے رکھتا ہے ـــ ایک لمحے کے لئے بھی کسی کے پاس نہیں چھوڑتا۔ بھروسا ہی نہیں کرتا۔ اس کے سُندر سُندر کپڑے اپنے ہاتھ سے سیتا ہے اور اسے بڑے چاؤ سے پہناتا ہے"
میں نے سب کی ہنسی کے دوران غریب داس کی طرف دیکھا ـــ اُس کے گل مچھّوں کے نیچے چھپے ہوئے ہونٹوں پہ ایک فخریہ مسکراہٹ ہویدا تھی ـــ اُس کی آنکھوں میں بھی ایک مسرور چمک دکھائی دے رہی تھی۔

پروفیسر صاحب نے کہا ـــ "تمہاری طرح لابھ سنگھ اور نریش کمار بھی میرے شاگرد رہے ہیں ـــ لیکن غریب داس کو میں نے اپنا گورو دھارن کر لیا ہے۔ یہ اتنا اچھا ڈھول بجاتا ہے کہ میرے پاس اُس کی تعریف کرنے کے لئے الفاظ بھی نہیں ہیں ـــ"

آنٹی اور روبھا مل کر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھیں ـــ آنٹی نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ لو جی، اور سنو۔ اب اس عمر میں یہ ڈھول بجانا سیکھیں گے ـــ اب تک جو ڈھول بجاتے آئے ہیں اُسی پر صبر نہیں ہوتا انہیں ـــ"!
پروفیسر صاحب ہنستے ہوئے بولے ـــ "اب تک جو ڈھول بجایا ہے وہ تو میرے گلے میں زبردستی مڑھ دیا گیا تھا۔ ایک ڈھول اپنی رضا سے بھی بجانا سیکھ لوں!"
اس پر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ سب کی نظریں آنٹی کی طرف اُٹھ گئی تھیں اور وہ کھسیا کر رہ گئیں۔ بولیں ـــ "کچھ تو لحاظ کیجئے سردار جی۔ یہ سب آپ کے بچّوں کے سمان ہیں"
یہ کہتے کہتے انہوں نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کے شاگردوں کے سر پر باری باری بوسہ دیا۔ پھر

1.25.19

اُنھوں نے غریب داس کا سر بھی چوما اور میرے پاس رکھے ہوئے ڈھول پر بھی اپنے شفقت بھرے ہونٹ رکھ دیے۔ یہ دیکھ کر مجھے ایک اور ٹھٹھول سوجھ گیا اور پروفیسر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا ——— "انھوں نے کیا قصور کیا ہے ؟ ذرا ان کو بھی نواز دیجئے۔"

سب نے میری تائید کی ——— "ہاں ہاں، ضرور ضرور!"

آنٹی اپنے شوہر کی جانب دیکھ کر بس لمحہ بھر کے لئے ہی جھجکیں ——— اُس کے بعد فوراً آگے بڑھ کر اُن کی پگڑی کو چوم لیا اور ہم نے تالی بجا کر خوشی کا اظہار کیا ——— پروفیسر صاحب بھی ہنس رہے تھے اُن کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا تھا ——— میں نے وِبھا کی طرف دیکھا ——— اُس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی لہر اُبھر آئی تھی۔ لیکن مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے فوراً سر جھکا لیا۔

آنٹی بولیں ——— "آج آپ کے شاگردوں نے مل کر آپ کا موجو اُڑایا ہے۔"

سردار جی نے ہماری طرف بڑی محبت سے تاکتے ہوئے کہا ——— یہ لوگ میرے شاگردوں سے زیادہ میرے دوست ہیں۔ اگر میں خود کو اُستاد ہی سمجھتا رہوں گا تو بہت جلد بوڑھا ہو جاؤں گا۔ بھلی لوک اِس نقطے کو کبھی مت بھولنا!"

ہم سب نے اُن کی تائید میں سر ہلا دیے ——— اُن کی طرف احسان مندی سے بھی دیکھا۔ یہ حقیقت تھی اُنھوں نے روائتی معنوں میں ہمیں اپنا شاگرد کبھی نہیں سمجھا تھا۔ ہمیشہ اپنا دوست ہی جانا تھا۔ ہم نے بھی اُن کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے اُن کے ساتھ ہمیشہ کھل کر گفتگو کی تھی، ہر موضوع پر۔ اسی وجہ سے اُن سے مل کر ہمیشہ بہت خوشی محسوس ہوتی تھی ——— اُن سے ملتے رہنے کو جی بھی چاہتا تھا۔

میز پر کھانا لگا دیا گیا تو ہم سب وہاں جا بیٹھے ——— ہنسی مذاق وہاں بھی جاری رہا۔ اسی وجہ سے خوب پیٹ بھر کر کھا گئے ——— ساگ، گوبھی، دہی، مکھن، مکئی کی گرم گرم روٹیاں، مولی اور گاجر ——— اچانک وِبھا نے میرے کان میں آکر کہا ——— "گاڑی میں آپ کے لئے گُڑ بھی تو رکھا ہے ——— اسی کی سویٹ ڈش ہو جائے!"

میں بھاگ کر ایک تھیلا اُٹھا لایا ——— اور آنٹی کے حوالے کرتے ہوئے کہا ——— میں تو بھول ہی گیا تھا۔ یہ آپ ہی کے لئے راستے میں لے لیا تھا۔ بالکل تازہ گُڑ ہے۔"

سب نے گُڑ بھی خوب مزے لے لے کر کھایا ——— غریب داس نے سب سے زیادہ گُڑ کھایا ——— اُسے اُس کے بیٹے کا حصّہ بھی دیا گیا جسے پا کر وہ بہت خوش ہوا۔

پروفیسر حضور سنگھ کے یہاں سے ہمیں فوراً مالیر کوٹلہ کے لئے روانہ ہونا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ سب ہی اصرار کر رہے تھے کہ شام کے جلوس میں ضرور شریک ہوں اور رات کا رنگارنگ کلچرل پروگرام بھی دیکھیں — مجھے تو وہاں رُک جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ایک روز تو کیا، میں کئی روز تک ٹھہر جانے کے لئے تیار تھا — میں تو ایسے سنہرے موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا — کہیں بھی مل جائیں۔ کلچرل میرے بدن کے لئے ایک حرارت تھی، خون کی روانی تھی — پنجاب کی دھرتی سے کٹ کر میں بمبئی جا بسا تھا وہاں رہ کر بھی اس دھرتی کے سپنے دیکھا کرتا تھا میری جڑیں اس دھرتی میں پیوست ہیں زندہ رہنے کیلئے مجھے بار بار یہاں لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ مجھے بس وبھا ہی کی طرف سے ایک اندیشہ لاحق تھا کہ وہ ایک شب یہاں رہنے کے لئے تیار تھی یا نہیں — اگرچہ وہ آنٹی سے متعارف ہو جانے کے بعد اور اُن کا بے پناہ پیار پا کر اس طرح مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے اُس سے ذرا سا بھی اصرار کیا گیا تو وہ وہاں رُک جانے سے انکار نہیں کرے گی۔

جب ہم واش بیسن پر ہاتھ دھونے کے لئے پہنچے تو میں نے اُس سے پوچھا — "اگر یہاں سے کل صبح روانہ ہوں تو کیسا رہے گا؟"

وہ کچھ تشویش سے بولی — "مالیر کوٹلہ جا کر ساری بات بتانی پڑے گی نا!"

"اگر نہیں بتائیں گے تب کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟"

"ایک جھوٹ من میں چھپائے چھپائے پھرنے سے تکلیف نہیں محسوس ہوگی! نابلیا نہ!"

"اور اگر سب سچ سچ بتا دیں گے تب؟"

"تب بھی جواب تو دینا ہی پڑے گا — ہم راستے میں کیوں رُکے؟"

اُس کی ہر دلیل میں وزن تھا — اور میں اُس کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"لیکن اتنے خوشگوار ماحول سے یوں منہ موڑ کر چل دینا بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے —

کم سے کم مجھے تو ہرگز نہیں ـــــ تمہیں کیسا محسوس ہوگا۔ ؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ـــ گھبا کر دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا ـــ غریب داس اپنے ڈھول پر انگلیوں کی ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر خود ہی خوش ہو رہا تھا۔

"بعد میں دیکھ لیا جائے گا، جو بھی ہوتا ہے!" میں نے قدرے زور دے کر کہا۔

وہ کچھ سوچ کر بولی ـــــ "آپ مجھے وہاں پہنچا کر لوٹ آئیں ـــ رات وں رات! یا پھر مجھے اجازت دے دیجئے کہ کسی بس سے اکیلی ہی چلی جاؤں!"

میں نے کہا ـــ "تمہیں چھوڑ کر لوٹوں گا تو صبح ہو جائے گی۔ سارے پروگرام ختم ہو چکیں گے ـــ اور تمہیں تنہا تو نہیں بھیج سکتا ـــ کیونکہ تم میری ذمہ داری پر آئی ہو ـــ"

ہاتھ دھونے کے لئے پروفیسر صاحب، نریش کمار اور لابھ سنگھ بھی وہاں آ گئے۔

"اس وقت چار بج رہے ہیں ـــ جلوس یونیورسٹی کے گیٹ تک پہنچ چکا ہوگا۔ شہر کی خاص خاص سڑکوں سے ہوتا ہوا چھ بجے تک میلے میں جا پہنچے گا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی الگ الگ پنڈالوں میں کلچرل ڈانس، ڈرامے، میوزک وغیرہ کے پروگرام شروع ہو جائیں گے ـــ وہاں بڑی رونق ہوگی۔"

آنٹی نے میز پر سے لسّی کے خالی جگ اُٹھاتے ہوئے کہا ـــ "چھیتی چھیتی سب لوگ تیار ہو جاؤ ـــ رات کو دو بجے سے پہلے واپس نہیں آپاؤ گے ـــ آپ کو یہاں بستر لگے ہوئے ملیں گے۔"

پھر وہ وبھا کے پاس آکر بولیں ـــ "پُتر، تجھے شلوار قمیض نکال دوں؟ تیرے یہ کپڑے تو میلے ہو گئے نے سفر وچ۔!"

"میری اٹیچی گاڑی میں رکھی ہے۔ میرے پاس کپڑے ہیں پہننے کے لئے۔"

یہ کہہ کر وبھا نے میری طرف دیکھا ـــ وہ آنٹی کے سامنے انکار کرنے کی جرأت نہیں دکھا رہی تھی اس سے مجھے خوشی ہوئی۔ میں جلدی سے گاڑی میں سے اُس کا اٹیچی اور اپنا سوٹ کیس نکال کر لے آیا۔

ہم سب کپڑے بدل کر بنگلے سے باہر آ گئے ـــ ایک گاڑی پروفیسر صاحب کے پاس بھی تھی۔ جس میں اُن کے ساتھ نریش کمار اور لابھ سنگھ بیٹھ گئے ـــ وبھا اور آنٹی میری گاڑی میں پیچھے آ گئیں۔ غریب داس اپنے ڈھول سمیت میرے ساتھ آگے کی سیٹ پر جم گیا۔ غریب داس کو جلوس میں شامل ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا اُس کی پارٹی والے اُس کی غیر موجودگی کی وجہ سے کُڑھ رہے ہوں گے۔ وہ بڑے اضطراب سے ڈھول پر ہلکے ہلکے انگلیاں بجا رہا تھا ـــ

اُس نے اپنی پگڑی کے اوپر ایک ریشمی رومال کی پٹی باندھ لی تھی۔

میں جلدی جلدی اپنی گاڑی آگے نکال کر لے گیا ـــ جہاں جلوس کے ہونے کی توقع تھی۔ لیکن ابھی شیرانوالہ گیٹ پر جلوس میں شامل ہونے والی پارٹیاں جمع ہو رہی تھیں ـــ انہیں ترتیب

سے کھڑا ہونے کے لئے کہا جا رہا تھا ـــــ ہر ایک ریاست کے گروپ الگ الگ تھے ـــــ اپنے اپنے کلچرل لباسوں میں۔ جو عام طور پر اُن کے یہاں پہنے جاتے تھے ـــــ یا جن سے اُن کی شناخت کی جا سکتی تھی۔ آسام، بنگال، اُڑیسہ، بہار، کرناٹک، کیرالا، کشمیر، گجرات وغیرہ۔ پنجاب اور اتر پردیش کے گروہ باقی ریاستوں سے بڑے تھے۔ لیکن اُن کے آگے پیچھے مسلح پولیس کافی تعداد میں نظر آئی۔ پولیس کی وائرلیس سے لیس گاڑیاں جگہ جگہ موجود تھیں۔

عزیب داس نے کار سے باہر نکلتے ہی ڈھول کو زور سے بجایا تو پنجاب کے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت عزیب داس کے چہرے کی کیفیت بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ اُس نے آنکھیں بیچ لیں، ہونٹ ایک خاص انداز سے بھینچ لئے اور پورے بدن کو ایک ٹانگ پر جھکا کر ایک خاص گت سے ڈھول بجانے لگا۔ اس کی پارٹی کے لوگ اُسے کندھوں پر اُٹھا کر لے گئے ـــــ جلوس کے بالکل آگے لے جا کر اُسے اُتار دیا۔ پنجابی گروہ کے بھنگڑا ڈالنے والے نوجوان لڑکے اُس کے گرد حلقہ بنا کر ناچنے لگے۔ اُن کے لباس اور پگڑیاں بہت ہی دیدہ زیب تھیں۔ بھنگڑے کا ردم بہادروں کی رگوں میں خون کی گردش کو تیز کر دیتا ہے۔ یہ لوک ناچ شجاعت، دلیری، مستی، اور مردانگی کا مظہر ہے۔ اس کی دھمک دلوں کو دہلاتی نہیں بلکہ دیکھنے والوں کو ناچ میں شامل ہونے کے لئے اُکسا دیتی ہے۔ یہ لوک ناچ فتح مندی کا بھی غماز ہے اور فصلوں کی کامیاب کٹائی کے بعد ایک اجتماعی خوشی کا اظہار بھی ہے اب تو اسے نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی شہرت بھی حاصل ہو چکی ہے ـــــ ماسکو، لندن، واشنگٹن، پیرس، ٹوکیو اور بیجنگ اور دنیا کے ہر ملک میں اُس کے مظاہرے کئے جا چکے ہیں۔

وبھا، آنٹی اور میں اپنی کار میں بیٹھے بیٹھے ہی جلوس کو گذرتا ہوا دیکھتے رہے۔ جب جلوس کے آخر میں پروفیسر حضور سنگھ کی کار ہمارے سامنے سے نکلی تو انہوں نے ہمیں دیکھ کر پیچھے پیچھے آنے کو اشارہ کیا۔ میں نے بھی اپنی گاڑی جلوس میں شامل کر دی۔ آنٹی اور وبھا جلوس کو زیادہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے میرے پاس آگے آ بیٹھیں۔ آنٹی نے وبھا کے گرد اپنے ایک بازو کا حلقہ بنا لیا اور اُس کا سر شفقت سے چوم کر بولیں۔

”یہ بہت ہی اچھا کیا تو نے پُتر کہ سریش کے ساتھ چلی آئی۔ یہاں پہلی وار آئی ہے کہ پہلے وی آ چکی ہے!“

”جی بالکل پہلی بار آئی ہوں“ وبھا نے اُسے بتایا۔

آنٹی اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں وبھا کی دلکشی کے تئیں تعریفی جذبہ جھلک رہا تھا ـــــ وہ اُسے اپنے ساتھ چمٹا کر اور اُس کا سر چوم کر بولیں

”جیوندی رہ، سدا سکھی رہ ـــــ اچھا ایک بات تو بتا ـــــ تو چنڈی گڑھ بھی رہ چکی ہے کبھی! ـــــ نریش کمار کہہ رہا تھا اُس نے تمہیں وہیں کہیں دیکھا تھا ـــــ“

یہ سنتے ہی وبھا کا چہرہ فق ہو گیا ۔۔۔ اُس نے گھبرا کر میری طرف بھی دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔ میں نے آنٹی کو بتایا!

"جی آنٹی جی ۔۔۔ وبھا وہاں بھی رہتی تھیں ۔۔۔ لیکن اب تو دہلی میں رہتی ہیں ۔۔۔"

اس سے پہلے کہ آنٹی اُس سے کچھ اور پوچھتیں، میں نے مزید کہا ۔۔۔ "یہ جلوس تو سارے شہر کا چکر کاٹ کر اسپورٹس گراؤنڈ میں پہنچے گا ۔۔۔ کیا تب تک ہم اسی طرح پیچھے پیچھے ہی لگے رہیں گے؟"

"اور نہیں تو کیا ۔۔۔!" انہوں نے چمک کر جواب دیا ۔۔۔ "اسی بہانے سارے شہر کی سیر کر لو گے ۔۔۔"

میں نے کہا ۔۔۔ "یہاں میرا ایک پرانا دوست بھی رہتا ہے۔ سوشیل۔ وہ یہاں کا جیلر ہے۔ ایک مدت سے نہیں ملا اُس سے ۔۔۔ جا کر پتہ لگاؤں ۔۔۔ شاید ابھی تک یہیں ہو!"

"تو مل آؤ نا جاکر۔ منع کس نے کیا ہے ۔۔۔ اگلے چوراہے پر مجھے اُتار دینا ۔۔۔ میں سردار جی کے پاس جا بیٹھوں گی۔ پر میلے میں سمے پر پہنچ جانا ۔۔۔ وہاں ہمیں ڈھونڈ لو گے نا!"

"جی ڈھونڈ لوں گا ۔۔۔"

مجھے اُس کے فیصلے سے بڑا اطمینان ملا۔ شاید وبھا کو بھی ملا ہو ۔۔۔! لیکن وہ تو ابھی تک سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی ۔۔۔ جب سے آنٹی نے اُس کے چنڈی گڑھ میں رہنے کا ذکر کیا تھا۔ نرلیش کمار کے حوالے سے۔

اگلا چوراہا بہت دُور نہیں تھا ۔۔۔ وہاں جاکر میں نے کار ایک کنارے روک لی۔ آنٹی باہر نکل کر بولیں ۔۔۔ "اچھا پُتر رب راکھا۔ اب میلے ہی میں ملاقات ہو گی جلدی آجانا!"

"جی ۔۔۔ بہت اچھا آنٹی جی ۔۔۔"

وہ جلدی جلدی چلتی ہوئی پروفیسر حضور سنگھ کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی ۔۔۔ میں نے گاڑی ایک دوسری سڑک پر گھما کر اسپیڈ تیز کر دی ۔۔۔ اس لئے نہیں کہ سڑک خالی تھی۔ بلکہ آنٹی نے ہمیں جس قسم کی گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا یہ اُسی سے نجات پانے کا ایک ردعمل تھا۔ کچھ منٹ تک ہمارے درمیان کوئی گفت گو نہ ہوئی۔ ہم چاہتے بھی نہیں تھے کہ کسی ایسے موضوع پر بولیں جو ہمارے دلوں میں اور بوجھ بھر دے۔

میں نے جیل کے پھاٹک پر گاڑی روک دی تو وبھا نے پوچھا ۔۔۔ "یہاں آنا بہت ضروری تھا؟"

"جو بات بالکل ضروری نہیں معلوم ہوتی وہ بھی کبھی کبھی ضروری ہو جاتی ہے ۔۔۔ یہیں میرا ایک بہت پیارا دوست رہتا تھا۔ شاید ابھی تک یہیں ہو ۔۔۔ اُس سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گی۔ اُس کے بیوی بچّوں سے بھی مل کر ۔۔۔ کچھ وقت یہاں بھی دلچسپی میں گزرے گا ۔۔۔"

یہ کہہ کر میں نے اُس کی طرف دیکھا ۔۔۔ وہ رضامندی ظاہر کرے تو میں آگے بڑھوں۔ اُس نے کوئی تاثر نہیں دیا تو میں نے گاڑی ایک طرف پارک کر دی ۔۔۔ اُسے گاڑی کے اندر ہی بیٹھا چھوڑ کر میں نے جیل کے پھاٹک پہ کھڑے سنتری سے سوشیل پال کے بارے میں پوچھا ۔۔۔ اُس نے بتایا کہ وہ دفتر میں

موجود ہیں۔ اُس نے میرا نام پوچھ کر اندر اطلاع بھجوادی ـــ پال نے فوراً گیٹ پر آکر میرا خیر مقدم کیا ـــ جیسے کہ اُس کی عادت تھی ـــ اُس نے مجھے خوب بھینچ کر سینے سے لگالیا اور میرے گال چومے اور بولا ـــ "تم اِس وقت نہیں آتے تو میں نکل چکا ہوتا۔ زنانہ قیدیوں کے وارڈ میں عورتوں کا آپس میں کچھ سر پھٹول ہوگیا ہے۔ اُس سے نپٹ کر مجھے ایک درجن ایسے قیدیوں کو صاف ستھرے شہری لوگوں والے کپڑے پہنوا کر، جن کی قید کی مدّت میں چار چار چھ چھ مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ آل انڈیا کلچرل میلا دکھانے کے لئے لے جانا ہے۔ اُن کے بھاگ جانے کا اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ پکڑے جائیں گے تو پھر لمبی سزائیں بھگتیں گے ـــ چلو تم بھی رہو میرے ساتھ ساتھ!"

وہ آج سویلین ڈریس میں تھا ـــ قیدیوں کے ساتھ اسی لباس میں اُسے میلے میں جانا تھا۔ تاکہ لوگ کسی قسم کا امتیاز نہ کرسکیں۔ اس سے قیدیوں کے دل میں سماج میں لوٹنے پر ایک اعتماد پیدا کرنا بھی مقصود تھا۔

میں نے سوشیل کو بتایا ـــ "میرے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔ اُدھر گاڑی میں بیٹھی ہیں"

"اچھا!" اُس نے حیران ہوکر پوچھا ـــ "کون ہیں وہ؟"

"وبھا پنڈت ـــ چلو اُس سے ملادوں ـــ" میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اُس نے اچانک مجھے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر روک لیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"سچ سچ بتا! تیری کون ہے وہ؟ دیکھ بیٹا جھوٹ مت بولنا ورنہ ابھی بند کردوں جیل میں۔"

میں نے بھی اپنے ہاتھ اُس کے گرد حمائل کرلئے ـــ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"پیارے! اس وقت کچھ زیادہ مت پوچھ تو اچھا ہوگا۔ فی الحال اتنا ہی جان لے کہ اُس کا نام مسز وبھا پنڈت ہے ـــ اس کے علاوہ وہ میری کچھ نہیں ہے۔ لیکن ہو بھی سکتی ہے ـــ ابھی وقت لگے گا۔ سمجھ گیا نا! گھر جاکر بھابی کو بھی سمجھا دینا۔ وہ وبھا سے کچھ مت پوچھے"

وہ مسکرادیا۔ کچھ کچھ سمجھ کر۔ بہت کچھ نہیں سمجھ کر بھی ـــ پھر میرا بازو پکڑ کر بولا ـــ "تیرا بھی جواب نہیں پیارے!"

وبھا اور سوشیل کا میں نے تعارف کرادیا۔ سوشیل نے اُس سے کہا ـــ "میں تھوڑی دیر کے لئے زنانہ قیدیوں کے وارڈ میں جاؤں گا۔ کیا آپ نے کبھی زنانہ جیل دیکھی ہے؟ نہیں تو چلئے ـــ دکھالاؤں!"

پھر وہ سنجیدگی سے بولا ـــ "یہ بھی ایک بڑی عجیب وغریب دنیا ہے۔ باہر کی دنیا سے بالکل مختلف مجھے یقین ہے آپ نے مجرم عورتیں کبھی نہیں دیکھی ہوں گی ـــ ان کے بارے میں آپ تصوّر ہی نہیں کرسکتیں کہ وہ کس طرح رہتی ہیں! کس انداز سے گفتگو کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض کے رویّے تو حد درجہ ناشائستہ ہیں۔ بداخلاقی کی پستیوں تک گرے ہوئے۔ تجربے کے لئے ہی سہی! ایک نظر دیکھ لیجئے!"

وبھا کار میں سے باہر نکلی تو میں نے کہا ـــ "ہمارے لئے یہ بھی ایک طرح کی جیل یاترا ہی ہوگی!"

سوشیل ہماری طرف دیکھ کر مسکرادیا ـــ وبھا ہمارے درمیان بڑے وقار سے چل رہی تھی جیسے

وہ کوئی جیل وِزٹر ہو!

زنانہ جیل کے پھاٹک پر کھڑے دو مسلح سنتریوں نے سوشیل کو دیکھ کر سیلوٹ کیا۔ پال کے ہاتھ میں چمڑے سے مڑھا ہوا بڑا خوبصورت بیٹن تھا۔ جیسے ذرا سی جنبش دے کر اُس نے سنتریوں کے سیلوٹ کا جواب دیا۔ اسی سے اُس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ یوں بھی کسی بھی شخص کے لئے اُس کی اپنی اہمیت کا احساس بے حد لذیذ ہوتا ہے۔

پھاٹک کے باہر ایک ادھیڑ عمر سکھ اور اُس کے دو چھوٹے چھوٹے بچّوں نے اُس کا راستہ روک لیا۔ اُن تینوں کی آنکھوں میں بے بسی جھلک رہی تھی۔ شاید یہ بے بسی کبھی آنسو بن کر بھی بہتی رہی ہو گی۔ اب آنسوؤں نے بہنا بند کر رکھا تھا۔ پال نے اُنہیں دیکھتے ہی کہا —— "اوئے تم لوگ پھر آ گئے؟ کتنی بار کہا ہے ملاقات کے دن آیا کرو۔ —— دو بار بچّوں پر رحم کھا کر تمہاری عورت سے ملوا دیا تھا —— سوموار کو آنا اب —— اگلے مہینے کے پہلے سوموار کو!"

وہ آدمی اُس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ گڑگڑا کر بولا —— "حاکم، آج ہمیں مایوس مت کرو۔ یہ معصوم بچّے دن بھر روتے رہتے ہیں —— آج بس ایک جھلک انہیں ان کی ماں کی دکھلا دو —— میں ہر طرح کی غلامی کروں گا۔ تمہاری سرکار!"

"تم سے کہا نا آج ملاقات نہیں کرائی جا سکتی۔ تیری خاطر بار بار جیل کا ضابطہ نہیں توڑ سکتا۔"

سوشیل نے اُسے جھڑک کر دور ہٹا دیا۔ سنتری اُسے دھکیلتا ہوا دُور لے گیا —— وہ چلّاتا ہی رہ گیا —— "نہیں نہیں حاکم جی، آپ سب کچھ کر سکدے او۔ آپ جی کے ہتھ وچ پوری بادشاہی ہے۔ آپ نوں واہگورو جی دا واسطہ! سچّے پادشاہ دا واسطہ! آج مایوس مت کرو مالک۔ ایہہ نیانڑے دعا دین گے آپ جی نوں!"

سوشیل نے ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتایا —— "اِس کی عورت نے اپنی ساس کی گردن کاٹ ڈالی تھی۔ گھریلو جھگڑے کی وجہ سے —— جب مقدمہ قائم ہوا تو اُس وقت تو اُس نے اپنی عورت کے خلاف سب بیان دے دیا۔ جو اسے معلوم تھا۔ اب جب اُسے دس سال کی سزا ہو گئی ہے تو پچھتا رہا ہے۔

زنانہ وارڈ کے اندر پہنچتے ہی ایک وردی پوش عورت نے سوشیل کا اور ہمارا بھی استقبال کیا۔ سیلوٹ کر کے —— سوشیل نے ہمارے ساتھ اُس کا تعارف کرایا۔ وہ بسنتی کھُرانا تھی۔ وارڈن۔ چھوٹے قد کی، موٹی اور خونخوار قسم کی عورت۔ اُس نے سوشیل کے سامنے دو قیدی عورتوں کی آپسی مار پٹائی کا قصّہ بیان کیا —— سر، دونوں بڑی حرامزادی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر سوتی بھی ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کا سر بھی پھوڑ ڈالتی ہیں۔ آج ایک دوسرے کے بال کاٹنے پر جھگڑا کیا۔ کھانے کی رکابیاں بالوں پر مار مار کر بال چھوٹے کر رہی تھیں۔ وہ جو بھینگی آنکھ والی دُلاری ہے اُس نے بھگوانی مسکن کے ذرا زیادہ بال کاٹ دینے پر واہی تباہی مچا دی۔ رکابی اُٹھا کر اُس کے سر پر دے ماری۔ کچھ اور قیدی عورتیں بھی اُن کے جھگڑے میں شامل ہو گئیں۔ کچھ اِس طرف تو کچھ اُس طرف —— ایک دوسرے کا جھونٹا

پکڑ پکڑ کر کھینچنا — ہاتھا پائی اور اٹھا پٹک بھی بہت ہوئی۔ آخر ان پر ڈنڈے برسانے پڑے۔ چھ قیدی زخمی حالت میں پڑی ہیں — ''

سوشیل کے پیچھے جیل کا دوسرا عملہ بھی چل رہا تھا۔ سب کی سب عورتیں تھیں — وارڈن، میٹرن، ویل فیئر افسر اور تین چار ایسی قیدی عورتیں جو اچھے چال چلن کی وجہ سے قیدیوں پر نگرانی کرنے کے لئے لگا دی گئی تھیں — کھانا تقسیم کرنے، صفائی کروانے وغیرہ جیسے کاموں پر۔

ایک جیل کے اندر کئی اور جیلیں تھیں — اونچی اونچی دیواروں والی، لوہے کے مضبوط جنگلوں اور دروازوں والی — ان کے اندر کئی وارڈ تھے — چھوٹے چھوٹے کمرے بھی جن کے اندر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میلے کچیلے کمبل پڑے ہوئے تھے — ایلیمونیم کے ٹیڑھے میڑھے اور پچکے ہوئے برتن بھی۔ ان کمروں کے اندر کونوں میں کچھ عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کچھ لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک عورت دوسری عورت کے بالوں میں سے جوئیں نکال رہی تھی۔ وہ سب ہمیں گھورنے لگیں — وہ ہر طرح کے قد و قامت کی تھیں۔ چھوٹی، ٹھگنی، لمبی، موٹی اور سوکھی سڑی بھی۔ بیس سے لے کر پچاس پچپن سال کے درمیان کی۔ کوئی کوئی چہرہ غیر معمولی طور پر ملیح تھا کوئی حیرت ناک طور پر چپٹا — کسی کسی چہرے کا ناک نقشہ بالکل متوازن نہیں تھا۔ سر بہت بڑا تو جسم بہت ہی چھوٹا۔ اُن کے سر کے بال بھی کئی طرح کے تھے۔ چھوٹے، لمبے، کسی کسی کی چُٹیا تو کسی کے سر پر جھاڑیاں اُگی ہوئیں۔ اُن کے بدن پر جیل کی طرف سے دیئے گئے کپڑے یا تو بہت تنگ تھے یا بہت ہی کُھلے کُھلے — اُن میں جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ تھے جن میں سے اُن کے بدن کے نازک ترین حصے جھانک رہے تھے — کسی کسی عورت کے ہونٹوں میں بیڑی یا سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑے پھنسے ہوئے تھے — انہوں نے ہماری طرف بہت ہی خوفناک نظروں سے دیکھا۔ دل کو دہلا دینے والی نظروں سے۔

اُن سب نے کسی نہ کسی شکل میں قانون ضرور توڑا تھا۔ اُسی کی سزا کاٹ رہی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر ایک شدید احساس یہ ہوا کہ تنہائی، چنتا اور افسردگی نے اُن کی ساری دلکشی چھین لی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے سے جتنی بھی دلکشی اُن کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہوتی جا رہی تھیں۔

اچانک ہم ایک بڑے ہال میں جا نکلے — جہاں بہت سی کھڈیاں لگائی گئی تھیں۔ کپڑا بُننے کی۔ کچھ عورتیں کام کر رہی تھیں کچھ کام چھوڑ کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کھڑی تھیں — وہ فرش پر پڑی ہوئی زخمی عورتوں کی طرف سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ زخمی عورتیں کراہ رہی تھیں۔ اُن کے کپڑے نوچنے کھسوٹنے میں پھٹ گئے تھے۔ جس سے اُن کے بدن ننگے ہو رہے تھے — اُن کے نُچے ہوئے بالوں کے گچھے یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بہت بے دردی سے نوچا اور کھسوٹا تھا۔ اپنے جیلر صاحب کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور یک زبان ہو کر اپنی اپنی بپتا سنانے لگیں —

لیکن سوشیل نے انہیں سختی سے جھڑک دیا اور چیف وارڈن لبنتی گھرانا کو حکم دیا ——— "انہیں فوراً اسپتال بھیجواور ان کے جھگڑے کی انکوائری کرنے سے پہلے تم اپنی رپورٹ تیار کرلو۔"

"سر، انہیں وارڈ نمبر گیارہ میں بھجوا دیا جائے تو ان کے ہوش ٹھکانے پر لگ جائیں گے۔"

"یہ انکوائری کے بعد دیکھا جائے گا۔"

میں سمجھ گیا گیارہ نمبر وارڈ میں زیادہ سخت محنت کرائی جاتی ہوگی۔

سوشیل اپنے ماتحت افسروں سے الگ ہو کر ہمارے پاس آکر بولا ——— "کچھ اندازہ ہوا آپکو یہاں کی زندگی کے بارے میں؟"

وہ وبھا سے مخاطب تھا۔ وبھا کے چہرے پر خوف اور نفرت کی ملی جلی کیفیت تھی۔ انتہائی بیزاری کی۔ جبکہ میں قیدی عورتوں کے لئے اپنے اندر ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے سوشیل سے پوچھا ——— "ان عورتوں کے جرائم کس قسم کے ہیں؟"

"کئی طرح کے ہیں ایک تو چوری چھپے ابارشن کا دھندہ کرتی تھی ایک بانجھ ہونیکی وجہ سے دوسروں کے بچوں کا گلا گھونٹ دیتی تھی۔ اپنا بچہ حاصل کرنے کے لئے اُس نے کتنے پیروں فقیروں سے تعویذ اور گنڈے حاصل کئے۔ کسی کے کہنے پر آدھی رات کو بالکل ننگی ہو کر قبر پر چراغ جلانے گئی۔ آخر مایوس ہو کر "ماربڈ" بن گئی۔ ذہنی طور پر بیمار۔"

وہ سگریٹ سلگا کر بولا ——— آج کا جھگڑا کوئی نیا نہیں تھا۔ اکثر ہو جاتا ہے۔ وہ سب ایک دوسرے کی حاسد ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بات پر لڑ پڑتی ہیں۔ روٹی بھاجی پر، چائے پر، کوئی زیادہ یا اچھا کام کر دکھائے یا کسی پر وارڈن زیادہ مہربان ہو جائے تو جل بھن کر رہ جاتی ہیں۔"

پھر وہ وبھا کی طرف دیکھ کر بولا ——— چھوٹی بڑی چوریاں کرنے کی عادتیں مردوں و عورتوں میں عام ہیں۔

لیکن زیادہ تر عورتیں دکانوں پر جا کر سامان چرانے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔ کریم کی شیشیاں، چپلیں، بٹن، کلپ، ربن کے گولے، کپڑے وغیرہ۔ جب اُن کا ہاتھ کھل جاتا ہے تو زیورات اور روپیہ چرانے کی ہمت کر دکھاتی ہیں۔ یہاں تو سب ہی طرح کی جرائم پیشہ عورتیں لائی جاتی ہیں۔ چور، قاتل، پیشہ ور طوائفیں اور جیب کترنے والی۔"

اچانک وہاں ایک تراشیدہ سفید بالوں والی عورت آگئی۔ اُس کے ہاتھ میں چکن کے کام کی ریشمی ساڑی تھی سوشیل سے کہنے لگی ——— "جیلر صاحب، میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ اب زیادہ باریک کام نہیں ہوتا مجھ سے۔ عینک دلوا دیجیے نا!"

میں اُس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے میں کوئی ایسا چہرہ تلاش کرنے لگا جسے میں یقیناً جانتا تھا۔ لیکن وہ مجھے اس طرح حیرت سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنا کام جیلر صاحب کو دکھانے میں مصروف تھی۔

اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ آگے بڑھ کر اُس سے پوچھا ——— "آپ، آپکا نام سنتوش پانڈے تو نہیں ہے؟"

اُس نے گردن گھما کر میری طرف چونک کر دیکھا۔ کچھ لمحوں تک گھورتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اُس کے پپڑی زدہ ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو من موہنی بھی تھی لیکن بے حد اداس اداس بھی۔ ایک ہاتھ بڑھا کر میرے کندھے پر رکھ کر پوچھا ——— "تم، تم وہی سریش ہو نا جو مجھ سے انگریزی پڑھنے کے لئے آیا کرتا

تھا۔ ہمارے پڑوس میں رہتا تھا!"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا تو اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ارے! تو کتنا لمبا ہو گیا ہے؟ یہاں کیسے؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں" آپ یہاں کیسے؟"

وہ ایک زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بولی ——— "جیسے دوسری عورتیں یہاں پڑی ہوئی ہیں"

میری سمجھ میں فوراً نہ آسکا کہ اس نے کونسا اتنا بڑا جرم کیا ہوگا جس کی اتنی بڑی سزا بھگت رہی ہے!

وہ تو بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ اس پر نظر جمائے نہیں جمتی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے۔ جن کے ساتھ وہ مجھے پہروں کھیلنے کی بخوشی اجازت دے دیتی تھی۔ میں عمر میں اس سے بہت چھوٹا تھا۔ لیکن اس سے چپکے چپکے عشق کرنے لگا تھا ——— یہ میری ایک طرح سے 'کاف لو' تھی۔ گائے اور بچھڑے والی محبت۔

سوشیل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کہا ——— "یہ بیچاری بڑی بدقسمت ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو اس نے اپنے زخمی خاوند کو پیٹھ پر لاد کر سرحد پار کی تھی۔ اگرچہ وہ اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ کچھ کما سکے اور اپنی بیوی کا بھی پیٹ بھر سکے۔ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب انسان دونوں ملکوں میں وحشی بن گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اس لئے نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے کہ وہ باہمی نفرت کا شکار رہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی نفرت کرتے تھے۔ جب آدمی خود سے بیزار ہو جاتا ہے تو پہلے دوسروں پر حملہ آور ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی اندرونی کیفیت سے نجات پا سکے۔ یہ بہت مشکل موضوع ہے۔ اس پر پھر کبھی بحث کریں گے۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ اس کا شوہر اپنے ہاتھ پیر کھو بیٹھنے کی وجہ سے نیم پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اسے معاف نہیں کر سکا کہ وہ اسے اس حالت میں بھی کیوں اٹھا کر لے آئی۔ اس سے یہ برداشت کرنا بھی ناممکن ہو گیا کہ وہ کوئی ملازمت کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلے۔ اسے بہت سمجھایا گیا کہ تمہیں زندہ رکھنے کے لئے تمہاری بیوی کا کام کاج کرنا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھتی ہی نہیں تھی۔ اگر کوئی بات بیٹھ چکی تھی تو وہ یہ کہ اس کی بیوی کے کارن ہی سے اس کی یہ درگت ہوئی تھی۔ وہ اتنی زیادہ خوبصورت نہ ہوتی تو اس کے ہاتھ پیر نہیں کاٹے گئے ہوتے۔ پہلے وہ اس کی خوبصورتی کا دیوانہ تھا۔ اب اس کی خوبصورتی کا دشمن ہو گیا۔ جب وہ سادھارن طریقے سے بھی بن سنور کر سروس کرنے کے لئے جاتی تو وہ غصّے میں مبتلا ہو کر واہی تباہی بکنے لگتا تھا۔ وہ تھکی ماندی واپس آتی تو پہلے اس سے یہ پوچھتا ——— "آج کون کون سے یاروں سے مل کر آ رہی ہو؟"

وہ سمجھتا تھا اس گھر کے باہر اس کی بیوی کے یاروں کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔ ایک پڑھی لکھی شریف اور ہمدرد بیوی کے لئے یہ سب برداشت کرنا کتنا مشکل تھا۔ جس عورت کے ماں باپ بھائی بہن اور سسرال والے تک ختم کر دیئے گئے ہوں اور جس کا ایک اپاہج خاوند کے سوا کوئی اور آسرا ہی نہ رہ گیا ہو وہ بھی اسے حد درجہ زچ کر دے تو وہ کیا کرے؟ مسز سنتوش پاٹھک جسے تم نے ابھی سنتوش پانڈے سے کہہ کر مخاطب کیا ہے کے بیانات عدالتی فائیل میں موجود ہیں کہ وہ اس کی ہر طرح سے دلجوئی کرتی تھی۔ وہ اس کے لئے بیوی تو تھی ہی، ایک ماں بھی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی اور کپڑے پہناتی اور سنوارتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی تھی۔ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ بٹھاتی تھی لیکن

اُس سے اپنی عورت کا ہی ذرا سا سجنا سنورنا گوارا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اُسے خوبصورت لمبے بالوں کے لئے بھی طعنے دیتا تھا۔ جبکہ انہی مہکتی ہوئی زلفوں کے سائے میں اُس نے شادی کے بعد کچھ پہنے اپنے آپ کو بالکل بھول کر گزارے تھے اور اب بھی سنتوش پاٹھک اُسی کو رجھانے کے لئے اُس پر اُس کی من پسند ساری راحت نچھاور کر دینے کے لئے اپنے بالوں کی دلکشی کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ لیکن وہ اپنے احساس کمتری میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ آخر اس عورت نے جو چاہتی تو اُسے چھوڑ کر ایک اور باعزت گھر بسا سکتی تھی ملازمت چھوڑ کر گھر میں بیٹھ جانا پسند کر لیا۔ دن بھر اپنے اپاہج آدمی کے سامنے بیٹھ کر ٹائپ کیا کرتی۔ اُس نے ایک ٹائپ رائٹر خرید لیا تھا۔ گھر کے باہر ایک بورڈ لگا لیا تھا۔ لوگ اپنے آپ اُسے گھر پر کام دینے چلے آتے تھے۔ زیادہ تر لوگ غریب کسان تھے جن کی زمینوں کے جھگڑوں کے درخواستیں ہوتی تھیں یا پاکستان سے آئے ہوئے اُن کے چھوٹے سے شہر میں بسے ہوئے شرنارتھی۔ جو مکانوں، دکانوں اور زمینوں کی الاٹمنٹ کے لئے کاغذات لے کر چلے آتے تھے۔ پاٹھک سے اُن کا بھی آنا جانا ناقابل برداشت ہونے لگا۔ وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے اُنہیں گالی دینے لگتا۔ گھر سے چلے جانے کے لئے کہہ دیتا۔ اور ویسے ہی ناشائستہ اور نازیبا جملے زبان پر لے آتا جو ایک نیک اور محنتی اور وفادار بیوی کے لئے سخت توہین آمیز ہوتے۔ اس نے بھی ایک دن غصے میں بھر کر ٹائپ رائٹر اٹھا کر اُس کے منہ پر پھینک دیا۔ وہ مسلسل گالی بکتا رہا اور وہ اُسے ٹائپ مشین سے بار بار زخمی کرتی رہی۔ اسے مار مار کر ختم کر دیا۔ اور اپنے خوبصورت بال کاٹ کر بھی اُس کی لاش پر پھینک دیئے۔

سوشیل نے سگریٹ سلگا کر کہا ——— یہ تھی اس نیک خاتون کے دس برس کے طویل صبر کی انتہا۔ اپنے بے رحم اور ریم پاگل مرد کے قتل کے جرم میں اُسے عمر قید کی سزا دی گئی۔ جو اب ختم ہونے والی ہے۔ ایک سال اور کچھ مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن یہ کہتی ہیں میں باہر جا کر کیا کروں گی وہاں کون ہے میرا جیل کے اندر ہی مر جاؤں تو اچھا ہے۔ لیکن محنتی بہت ہیں۔ قیدی عورتوں کو پڑھانے کا کام بھی کرتی ہیں۔ چکن کی کڑھائی میں بھی ماہر ہیں۔ اب مجھ سے ایک عینک لا دینے کیلئے کہہ رہی ہیں۔ وہ بھی انہیں لا دی جائے گی۔ ہم ان کی خدمات کے بیحد قائل ہو چکے ہیں۔ یہ چاہیں تو جیل کی سزا پوری کر کے بھی یہاں باقاعدگی سے آ جا سکیں گی ——— " میں اور روبھا سنتوش پاٹھک کی طرف ایک سی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سنتوش پاٹھک کے چہرے پر کسی قسم کی بے بسی کے آثار نہیں تھے۔ وہ خوش بھی ہرگز نہیں تھی۔ ایک مضبوط صبر کی سی کیفیت تھی اُس کے چہرے پر۔ میرا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے جاؤں۔ اُسے اتنی جلدی چھوڑ کر چل دوں۔ لیکن اب جانا ضروری تھا۔ سوشیل نے بھی باہر جانے کیلئے قدم بڑھا دیئے تھے سنتوش پاٹھک نے میرے کاندھے پر پھر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور بولی ——— " جاؤ "

جب ہم جیل سے باہر آئے تو سوشیل اپنے قیدیوں کو میلے میں لے جانے کے لئے اُن کے پاس جا چکا تھا۔ جاتے جاتے کہہ گیا تھا اپنی بھابھی سے مل کر جانا۔ میں نے کہلوا دیا ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں نہیں رکوں گا۔ اب میلے ہی میں ملوں گا۔" ہم گاڑی میں آ بیٹھے۔ دونوں خاموش تھے۔ آخر روبھا نے ہی زبان کھولی ——— "ایسی جگہ پر آپ مجھے کیوں لے آئے؟"

میں نے آہستہ سے کہا ——— " کیا آپ سمجھتی ہیں، میں ہی واقعی آپ کو یہاں لے آیا؟"

" ہاں وہاں آپ کے دوست لے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا ——— یہ ایک عجیب و غریب دنیا ہے۔ تجربے کے لئے ہی سہی، ایک نظر دیکھ لیجئے۔ مجھے تو ایسا لگا تھوڑی دیر کے لئے میں نے جیل کی سزا بھگت لی ہے۔ لیکن کسی جرم کے لئے نہیں۔ اگر یہی

تجربہ تھا تو بہت ہی ڈی پریسنگ تھا!"

"میرے لئے محض تجربہ نہیں تھا!" لیکن میں کسی اہم بات کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"تب کیا تھا وہ ؟"

"ٹھیک طرح بتا نہیں سکوں گا۔ میں نے اپنے بچپن میں جتنا کچھ کھو دیا تھا آج اُس سے کہیں زیادہ کھو دیا ہے۔"

وہ میری طرف ایک ٹک دیکھنے لگی۔ میں کسی دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

اُس نے جیسے پہلی بار میری ذہنی کیفیت کا احساس کر کے کہا —— "چلئے، کچھ ماحول بدلا جائے۔ اس گھٹن کو ختم کیا جائے۔"

میں اُسے سوشیل کے بنگلے پر لے گیا۔ جو جیل کے احاطے کے باہر بنا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک چھوٹی سی جیل کالونی تھی جہاں چھوٹے افسروں اور اسٹاف کے کوارٹر بھی بنے ہوئے تھے۔ وہاں مالی کا، صفائی کرنے کا اور پودوں کو پانی دینے کا کام بے ضرر قسم کے قیدی ہی کر رہے تھے۔

ہم کچھ دیر تک مسز سوشیل اور اُن کے بچوں کے درمیان رہے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا جو مسز سوشیل نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ اس بے تکلف ماحول میں ہم دونوں کا ذہنی تناؤ کچھ کم ہو گیا۔ جہاں اتنا اپنا پن ہو۔ اتنی دلچسپ باتیں ہوں، بچوں کی چیخ پکار ہو، وہاں دل کی کیفیت ضرور بدل جاتی ہے۔ نو بجتے بجتے ہم وہاں سے نکل سکے۔ وہاں سے سیدھے اسپورٹس گراؤنڈ کی طرف چل دیئے۔

اُس رات کو میں کبھی نہیں بُھلا سکتا جس نے میری زندگی اچانک بے پناہ خوشیوں سے بھر دی تھی۔ میرا دامن ان خوشیوں سے چھلک رہا تھا۔ پنجابی یونیورسٹی کا ہر ایک ہال کیمپس میں لگے ہوئے کئی خیمے اور اسپورٹس گراؤنڈ میں قطار در قطار گاڑے گئے تمبو اور قمقموں کی قطاریں ایک بہت بڑے میلے کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہر ایک اسٹیج پر ہندوستان کی مشترکہ ثقافتی زندگی کو ڈراموں اور کلچرل پروگراموں کے ذریعے پیش کیا جا رہا تھا۔ ہر جگہ بے پناہ بھیڑ تھی۔ سارا شہر ہی اُمڈ پڑا تھا۔ پٹیالہ کے علاوہ آس پاس کے شہروں قصبوں اور دیہات سے بھی لوگ آ گئے تھے۔ مرد عورتیں اور بچے۔ ریل، بسوں، بیل گاڑیوں، ٹریکٹروں اور موٹر سائیکلوں و جیپوں سے اور سائیکلوں سے بھی — دُور دُور سے — کڑاکے کی سردی کو جھیلتے ہوئے، کھیسوں، کمبلوں اور گرم کپڑوں میں خود کو لپیٹے ہوئے — سرِ شام جو بادل شوالک کی پہاڑیوں کی جانب سے آنے شروع ہو گئے تھے، ہوا کے رُخ پر مغرب کی طرف نکل گئے تھے۔

شام کو وقتِ مقررہ پر اس یوتھ فیسٹیول کا افتتاح کیا جا چکا تھا جو گورنر پنجاب کے بجائے چیف سیکریٹری نے آ کر کیا تھا۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے سیکورٹی والوں نے گورنر کو آنے سے روک دیا تھا۔ اگرچہ وہاں پولیس فورس کافی تعداد میں تعینات کی گئی تھی۔ رائفلیں اور مشین گنیں اٹھائے پولیس کے جوان اپنے لباس کے اوپر خاکی گرم جرسیاں پہنے ہر جگہ گھوم رہے تھے۔ جگہ جگہ پر آگ کے الاؤ بھی جلا دیئے گئے تھے جن کے گرد و پیش میں چائے اور کھانے پینے کے عارضی اسٹال بنائے گئے تھے۔ تندوری مرغے، کباب، پراٹھے، انڈے اور کئی قسم کی مٹھائیاں خصوصاً گرم گرم جلیبیاں بکثرت دستیاب تھیں۔ چوری چھپے شراب نوشی کرنے والوں کو کوئی منع نہیں کر رہا تھا۔ لوگوں کی ٹولیاں ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ وہاں پورا ہندوستان جمع ہو گیا تھا۔ طرح طرح کے لباس، ہنسی و مذاق

سے مسرور چہرے اور مختلف زبانیں۔

"او آہک بہک!"

"تھینک یُو — آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"اسثم، گوا ہاٹی۔"

"چا، پیو جی!"

"ہاں ہاں تھینک یُو۔ چھاکروک۔ اے ای مائر چاہ کھائی آہی چھو!"

"سر متا، آشن! آمر چاہ کھائی۔"

"سگریٹ کھا بین؟"

"نا! ساری۔ موں سگریٹ کھائے ناہیں"

"نلنی، چنچل کر"

"ٹکئے رہ اردن۔"

"لی گل اے پول ای وڈے وتو۔"

"اے نکو۔ وسے نٹی کاتری کنت"

"ولی کاہو!"

"اینیتو آئی؟"

"ایک روپیا۔"

"ملا ٹیکسی کنھٹے ملے؟"

"اگلے موڑ پر۔"

"سردارجی، تھوڑا دے لبسا۔"

"ہنجی بادشاہو، میں تواڈے لئی بیٹھاواں۔"

"آشا! آشا چھالے۔"

"آیئے آیئے تشریف لایئے۔ یہ میری ہمشیرہ عظمت ہے۔"

"اسلام علیکم۔"

"مجمدار صاحب، ہم یہاں اُردو کا ڈراما لے کر آئے ہیں۔ آپ کا پروگرام ہو گیا؟"

"چل رہا ہے — دیکھو گے؟"

"جی ہاں، چلتے ہیں۔"

وبھا اور میں گھومتے گھامتے ایک ایسے ہال کے اندر جا پہنچے جہاں بھنگڑے کا پروگرام پیش

کیا جا رہا تھا۔ اسٹیج پر علامتی طور پر ایک گاؤں پیش کیا گیا تھا۔ پردے پر کھیت اور کھلیان اور ایک پھوس کی جھونپڑی دکھائی گئی تھی۔ کدالیں، پھاوڑے، ترنگل، چھاجیں وغیرہ اِدھر اُدھر رکھ دی گئی تھیں۔ پنجاب کے کسان رنگ برنگی پوشاکیں پہنے اپنے عوامی رقص کے ذریعے اپنی محنتوں اور کمائیوں کا ناٹک دکھا رہے تھے۔ سود خور بنیا اور سنگدل زمیندار ان کی کھڑی فصلیں کٹوا کر اور بیلوں تک کو ہانکتے ہوئے لے جاتے تھے اور بھوک سے اُن کے بچے بلکتے رہ جاتے تھے۔ اب کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی زمینوں اور فصلوں کے خود ہی مالک ہیں۔ خاتمۂ نظامِ جاگیرداری نے انہیں ایک نئی قوت دیدی ہے۔ غریب داس اپنا ڈھول اٹھائے ایک ونگ میں کھڑا ہے۔ کسان منڈی میں اپنی فصلیں بیچ کر لوٹ آئے ہیں ــــ اُن کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اب وہ خوش ہیں۔ خوشی کا اظہار وہ بھنگڑا ڈال کر کرتے ہیں۔ غریب داس ڈھول بجاتا ہوا اُن کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ ایک خاص لے کے ساتھ گاتا بھی جا رہا ہے۔

نہ چُنی لے سُرمئی کُڑے
تُوں لگیں بدلی جئی کُڑے
کتھے نظر لوا نہ لیئں کُڑے

(اے لڑکی، سر پر سُرمئی رنگ والا ڈوپٹہ مت اوڑھ۔ اس میں تو کالی بدلی جیسی نظر آتی ہے کہیں تُو نظر نہ لگوا بیٹھے!)

پیر دھو کے جھانجراں پاؤندی
میل دی آندی
شوقن میلے دی!

(پاؤں دھو کر، پازیبیں آپس میں جوڑ کر پہنتی ہوئی میلے کی شوقین (لڑکی) چلی آ رہی ہے!)

چن وے کہ لڈّواں دا بھا پچھدی
اُدے گورے ہتھاں دی مہندی
بڑا گل بیندی!

(اے چاند، وہ لڈّوؤں کا بھاؤ پوچھتی پھر رہی ہے ــــ اس کے گورے گورے ہاتھوں پر لگی مہندی دیکھ کر تو میرے حلق میں کچھ پھنستے سا لگتا ہے۔)

چن وے کہ اُستے لے کے امرسیّا
اک گوری دا مروڑے کھاوے
پیش نہ جاوے!

(اے چاند، اپنے اوپر کپڑا اوڑھے ہوئے اُس گوری کی کمر اس طرح بل کھا رہی ہے کہ میں بالکل بے بس ہو جاتا ہوں)

سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ مرد و عورتیں سب کی زبانوں سے واہ واہ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ غریب داس کا ڈھول اُس وقت بھی ریشمیں کپڑوں سے سجا ہوا تھا۔ ڈھول کی چرمی طنابوں کے ساتھ جگہ جگہ ریشمیں پھول اور گھنگھرو ٹکے ہوئے تھے۔ اُس نے خود بھی خاصے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نیلے رنگ کے ساٹن کا تہمد، پیلے رنگ کا سفید و سرخ ریشم سے کڑھا ہوا کُرتہ اور اُس پر بنی ہوئی سفید سفید کوڈیوں سے مزین واسکٹ اور سر پر اُونچے شملے والی کالی پگڑی اور پگڑی کے اُوپر ہرے رنگ کے ریشمی رومال کا پیٹڈ!

میں نے اُس کے پاس جاکر اُسے مبارکباد دی ــــــ پلٹ کر وبھا کی طرف بھی دیکھا جو اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ غریب داس نے کہا ــــــ لگتا ہے بی بی اور راں لوں دی بھنگڑا پسند آگیا۔"

"جی بہت ــــــ بولیاں تو بہت اچھی لگیں ــــــ مبارک ہو۔"

وبھا کو میں نے پہلی بار اسقدر مسرور دیکھا۔ اُسے ساتھ لے کر میں پروفیسر حضور سنگھ اور آنٹی کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہ ابھی تک کہیں دکھائی نہیں دیئے تھے۔ چائے کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ٹی اسٹالوں کے سامنے اور آگ کے الاؤوں کے آس پاس بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہاں کچھ پنجابی دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے لوگوں کو پنجابی زبان کی بولیاں سُنا رہے تھے ــــــ ساتھ ساتھ بولیوں کا ترجمہ بھی کر دیتے تھے۔ جسے سُن کر ان لوگوں کی آنکھوں میں پنجاب کی عوامی شاعری کے لئے تعریف چھلک چھلک پڑتی تھی۔

"سُنو، مدراسی بھائی، ہمارے یہاں جُگنی ایک بہت ہی شوخ و شنگ لڑکی ہے۔ اُس کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ پھر بھی لوگ اُسے فرض کرکے مخاطب ہوتے ہیں۔ اُس کے بارے میں بولیاں گھڑتے ہیں ــــــ سُنو۔

جُگنی جاوڑی سی جیسے
سر تے گھڑا کالجا جھبے
پُچھ مُنڈا پانی منگے
ویر میریا جُگنی پتّل دی
ہیں ویکھی شہروں نکلدی

ایک دوسرا نوجوان سردار اُسے اس کا مطلب سمجھانے لگا۔

"جگنی چمبہ میں جا نکلی تھی۔ اُس نے سر پر گھڑا اُٹھا رکھا تھا اور اُس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ اُس نے بغل میں جو بچہ اٹھا رکھا تھا وہ اُس سے بار بار پانی مانگتا تھا ـــــ اے میرے بھائی، جگنی پیتل کی بنی تھی (یعنی خوب چمک رہی تھی) میں نے اُسے شہر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

تماشائیوں کی بھیڑ میں سے جنوبی ہند کی ایک لڑکی بولی ـــــ "ہمارے دیس میں بھی پنجابی لوگ ہے۔ ہم اُن کے کلچرل پروگرام سنتا ـــ بہت اچھا لگتا ـــ بھنگڑا اور جگنی بھی۔"

اُسی سردار نے جواباً کہا ـــ "اچھا، آپ کو ایک اور جگنی سُناتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جگنی چوبارے پر چڑھ گئی ـــ چوبارہ سمجھتے ہو نا؟ کوٹھے اوپر کوٹھا اُس پر اور کوٹھا اور پھر اُس کے اوپر اور کوٹھا ـــ!"

"ہاں ہاں تمہارا مطلب ہے ملٹی اسٹوری!"

"ہاں ہاں وہی۔ تو جگنی چوبارے جا چڑھی۔ نیچے اُس کا باپ اُسے پکارتا رہ گیا ـــ اُسے کہنے لگا، لڑکی نیچے آجا ـــ نہیں تو ہم جا رہے ہیں ـــ اچھا اب اسے پنجابی میں سنو۔" وہ بڑے لحن سے گانے لگا۔

جگنی جا چڑھی چوبارے
تھلوں بابا واجاں مارے
ہیٹھاں اُتر آ مٹیارے
اسیں چلے جاواں گے سارے
ویر میریا، جگنی چاندی دی
میں لوڑ پہچانی چاندی دی!

"آخر میں شاعر نے پتہ ہے کیا کہا ہے؟ اُس نے کہا ہے مدراسی بھائی کہ میرے بھائی، جگنی چاندی کی بنی ہوئی ہے۔ میں تو اس کی چال سے پہچان جاتا ہوں کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ کھِل کھلا کر ہنس بھی پڑا۔

وہاں کھڑے ایک نوجوان اسٹوڈنٹ کو جوش آگیا۔ اُس نے کان پر ہاتھ رکھ کر اور ایک لمبی سی تان لگانے کے بعد یہ بولی سنائی

میری جگنی دے دھاگے پکے
جگنی ہسدی بہت ہی پھبتے
ویر میریا، او جگنی اللہ بسم اللہ
میری جگنی! میری جگنی!

اچانک وبھا نے میرے کان میں سرگوشی کی — "آپ کے دوست سوشیل صاحب اُدھر کھڑے ہیں —"

میں نے سر گھما کر دیکھا — ایک الاؤ کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے — اُن میں سوشیل بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں اُدھر چل دیے — سوشیل ہمیں دیکھ کر خوش ہو گیا — اُس کے ساتھ جو قیدی سادا کپڑوں میں آئے تھے وہ سب اُس کے آس پاس کھڑے تھے — ایک قیدی ڈھول بجا رہا تھا۔ باقی قیدی سُر سے سُر ملا کر گا رہے تھے۔

جند ماہی باج تیرے کُمھلائیاں
تیری لاڈلیاں
تیری لاڈلیاں بھر جائیاں
باگیں پھرن کدی نہ آئیاں
اک پل بہہ جاناں
اک پل بہہ جاناں میرے کول
مٹھڑے لگدے نے
مٹھڑے لگدے نے تیرے بول

(جانِ من! تیرے بغیر تو میں مُرجھا چلی۔ تیری بھابیاں بڑی لاڈلی واقع ہوئی ہیں — وہ باغوں تک تو گھومنے آجاتی ہیں، میرے پاس کبھی نہیں آتیں۔ تو پل بھر کے لئے میرے پاس بیٹھ جا تیری باتیں مجھے بڑی میٹھی لگتی ہیں۔)

جیل میں ایک مدّت تک پڑے پڑے بھی وہ اپنی زبان کے شعری اظہار اور اپنے کلچر کی خوبیاں نہیں بھولے تھے۔ بلکہ قید میں رہ کر اُن کے اندر محرومی کا احساس اور شدید ہو گیا تھا۔ سوشیل نے ان سب کو شاباشی دیتے ہوئے کہا — "ہاں بھئی جوانو! کچھ اور سناؤ۔"

قیدی پھر گانے لگے ؎

جند ماہی جو چلیوں پٹیالے
تیرے دشمن ٹرپین نالے
ہتھ وچ چھریاں نے موڈھے بھالے
تیرا سر وڈھن دے چالے
گلاں کرن گے دنیا والے

وچھوڑا دو جیاں دا مندا
اِک پل بہہ جاناں میرے کول
مِٹھڑے لگدے نے تیرے بول!

دجان من! تو اگر پٹیالہ چلا گیا تو تیرے دشمن بھی ساتھ ساتھ جائیں گے۔ اُن کے ہاتھوں میں چھریاں اور کھنڈوں پر بھالے رکھے ہوں گے۔ اُن کی نیت تیرا سر کاٹ دینے کی ہے۔ پھر دنیا والے طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ دو دلوں کی جدائی تکلیف دہ ہوتی ہے پل بھر کے لئے میرے پاس بیٹھو تو ۔۔۔ تیری باتیں مجھے بہت میٹھی لگتی ہیں)
وہاں جتنے لوگ موجود تھے وہ سب ہاتھ سروں سے اُونچے اُٹھا اُٹھا کر آگ کے گرد اگرد ناچتے ہوئے گھومتے چلے جاتے تھے۔ اُن کے قدم اُٹھانے اور رکھنے اور تھرکنے میں ایک دھیما دھیما منظم ردم تھا۔ اُسی طرح ناچتے ہوئے ایک چکر سوشیل نے بھی لگایا۔ اس پر قیدیوں نے خوش ہو کر اُسے اپنے بازوؤں پر اُٹھا لیا۔ اور ایک نعرۂ مستانہ بھی بلند کیا۔ اُن کے بازوؤں پر بیٹھے بیٹھے سوشیل نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر ایک بڑی ہی شوخ بولی گا کر سنائی۔
نی کچیا دُدھ بین والیئے!
تیری ہک تے ملائیاں آئیاں
سارے قیدی خوشی سے اچھل پڑے۔ ایک قیدی نے اُسی طرح کان پر ہاتھ رکھ کر ایک لمبی تان لگائی۔

نی کچے دُدھ بین والیئے!
مُنڈا جموں گا دہی دی پھٹ ورگا!
ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ۔۔۔ ایک اور قیدی نے اپنی بات اس طرح کہی۔
جے میں جاندی جٹاں دے وس پیناں
نکیاں میں تیل ملدی!

اب بے ہودگی کا مظاہرہ ہونے لگا ۔۔۔ جوش و خروش میں ایسا ہو جاتا ہے۔ چاہے سامنے عورتیں ہوں، بہو بیٹیاں ہوں، بچے اور بزرگ ہوں۔ جوش میں مبتلا نوجوان سنجیدگی اور شرافت کی ساری حدیں پار کر جاتے ہیں۔ عورتیں پہلے تو نظریں جھکا کر مسکرا دیں۔ پھر دھیرے دھیرے کھسکنے لگیں سوشیل نے بھی اپنے آدمیوں کو اشارا کیا اور وہ واپس جانے کے لئے یونیورسٹی کے علاقے سے نکل گئے۔ وہاں سے

جانے سے پہلے سوشیل ہمارے پاس آیا اور ہم سے مل کر چلا گیا۔

وبھا نے گھڑی دیکھ کر کہا —— "تین بج گئے لیکن میلے میں رونق ابھی کم نہیں ہوئی ہے۔"

"ہم بھی چلیں؟ سب کچھ تو دیکھ لیا ہے۔"

"چلیے —"

"سردار جی اور آنٹی سے ملتے ہوئے چلیں گے — کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھیں گے — تاکہ صبح ہو جائے۔"

"اگر ہم اُدھر نہیں جائیں — اسی وقت مالیر کوٹلہ کے لئے چل پڑیں!"

"اتنی رات میں شاید جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس طرف عام طور پر رات کو سڑکوں پر گاڑیاں نہیں چلتی ہیں۔"

یہ سُن کر وہ چُپ ہو گئی۔ میرے ساتھ دھیرے دھیرے چلتی رہی۔ آسمان پر بادل پھر جمع ہو رہے تھے — ہماری گاڑی سڑک کے کنارے کئی گاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وبھا گاڑی کے ساتھ پیٹھ لگا کر بولی —— جی چاہتا ہے گاڑی میں ہی پڑ کر سو جاؤں۔ بہت تھک گئی ہوں۔"

"سو جایئے —" میں نے گاڑی کھول دی — اُسے اوڑھنے کے لئے ایک شال بھی نکال کر دے دی۔

"آپ؟ آپ نہیں سوئیں گے؟"

"میں بھی سو لوں گا — آگے کی سیٹ پر — بس گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے ہی تو آرام کرنا ہے —"

"لیکن یہاں کوئی اعتراض نہ کر دے —— پولیس والے گھوم رہے ہیں۔"

میں اُس کا خدشہ سمجھ کر بولا۔ "تو ٹھیک ہے۔ پروفیسر صاحب کے بنگلے پر ہی چلتے ہیں —"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے اُدھر ہی موڑ دی —— روشنیوں کے سیلاب میں ڈوبا ہوا کھیل کا میدان پیچھے رہ گیا۔ اب ہم مدھم روشنیوں کے ماحول میں سے گذر رہے تھے۔ مدھم روشنی اُونچے اُونچے کھمبوں کے ساتھ لگی ٹیوب لائیٹوں سے ہو رہی تھیں۔ بنگلے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ اس وقت کہاں جائیں —— کیا میلے میں واپس چلے جائیں؟

وبھا نے کہا —— "میں تو گاڑی میں ہی پڑ کر سو جاتی ہوں —"

میں نے کہا —— "گاڑی اسی بنگلے کے سامنے کھڑی رہے گی۔ آپ سو جایئے —— میں اُن کی واپسی کا انتظار کرتا ہوں —"

پھر اُس سے کہا —— "مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔ کل یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا —"

ابھی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ کہیں دُور سے ایک دھماکا سنائی دیا۔ جیسے کوئی بہت ہی طاقتور بم پھٹا ہو ـــــ اُس کے ساتھ ہی لوگوں کا شور اُبھر آیا ـــــ ہم دونوں اُس شور پر کان لگائے ہوئے تھے۔ گولیاں داغنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ میں نے آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کے لئے کار میں سے باہر نکلنا چاہا تو وبھا نے اچانک پیچھے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک دیا۔

"آپ باہر مت نکلیے۔ پلیز۔ بڑا خطرہ ہے۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔"

میں نے اپنے کاندھے پر اُس کے ہاتھ کی گرفت کو اور زیادہ سخت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے اُس کا کہا مان لیا لیکن کھڑکی میں سے سر نکال کر اِدھر اُدھر بڑی بے چینی سے دیکھنے لگا۔ یہ بات میرے دل میں بھی بیٹھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے اور یہ جائے وقوعہ یہاں سے بہت دُور نہیں ہے۔

"پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟" وبھا نے بڑی تشویش سے کہا۔ اُس کا ہاتھ ابھی تک میرے کاندھے پر پڑا تھا۔ اور کانپ رہا تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوا ہے ـــــ" میں نے بہت دھیرے سے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اسے یقین دلانے کے لئے کہ چاہے کچھ بھی ہو میں اُس کے ساتھ ہوں۔

"پروفیسر صاحب اور آنٹی موجود ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا!" اُس کی آواز میں بھی لرزش تھی۔

"وہ جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ ہمیں یہی منانا چاہیئے۔ کل شام کے بعد وہ ہمیں نہیں ملے!"

"وہ اسی میلے میں ہی رہے ہوں گے۔ اتفاق سے ہمیں دکھائی نہیں دیئے۔"

"شاید!"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آگے آجاؤں۔"

"آجایئے ـــــ" میں نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔ اور گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اُس نے مجھے روک دیا ـــــ "میں باہر سے نہیں، اندر ہی سے آجاتی ہوں۔"

میں نے اُسے پچھلی سیٹ سے آگے کی سیٹ پر آجانے میں مدد کی۔ اُس کا سارا وجود میرے بازوؤں اور ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ میرے ساتھ بیٹھ کر اُس نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ کچھ دیر تک بالکل نہیں بولی۔ اچانک بادل گڑگڑائے اور زور سے بجلی چمک گئی تو وہ گھبرا کر میرے قریب ہو گئی۔ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ میں نے بھی بلا جھجک اپنا بازو اُس کے گرد پھیلا دیا۔ اور ہنس کر کہا ـــــ "آپ کو بجلی کی آواز سے ڈر لگتا ہے؟"

"اس وقت ہر طرف ڈر کی پرچھائیں گھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"میں جو ہوں آپ کے ساتھ۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر تک بالکل نہ بولی۔ بارش بھی شروع ہو گئی ـــــ اچانک زور زور سے میں نے کھڑکی بند کر دی ـــــ اور پھر بجلی بھی چلی گئی ـــــ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بارش کے زوردار ہتھوڑے جیسے ہماری گاڑی کی چھت پر برس رہے تھے۔ ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی بارش جیسے دستک دیتی پھرتی تھی ـــــ اور کہتی پھرتی تھی ـــــ کھولو، کھولو!!

بجلی چمکتی تھی تو ہمیں سامنے سڑک پر پانی بھرا ہوا نظر آجاتا تھا۔ تیزی سے بہتا ہوا پانی ـــــ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے سے خاموش بیٹھے تھے۔ خوف نے ہمیں کس قدر آناً فاناً ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ یہی خوف ہی لوگوں کو سماجی اور سیاسی، قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر ایک دوسرے سے جوڑتا ہے اور کبھی کبھی الگ بھی کر دیتا ہے ـــــ انسان بنیادی طور پر تحفظ چاہتا ہے۔ ایک دوسرے کو زندہ رہنے کی گارنٹی دے کر یا دوسروں کو مار کر!

اچانک کوئی پانی میں تیز تیز چھپ چھپ بھاگتا ہوا بنگلے کی جانب گیا ـــــ میں نے گیٹ کھلنے کی آواز سُنی۔ اُس کے بعد خاموشی چھا گئی ـــــ جیسے کوئی اندر جا کر چھپ گیا ہو۔ یا برستے پانی سے پناہ لینے کے لئے برآمدے میں جا کر کھڑا ہو گیا ہو ـــــ پھر وہ اُدھر سے واپس نہیں آیا۔

وبھا نے میرے کان کے بالکل قریب منہ لا کر سرگوشی کی ـــــ "وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"ہمارے پروفیسر صاحب تو نہیں لگتے ـــ"

"وہ اس طرح اکیلے نہیں آتے! آنٹی کو بھی ضرور ساتھ لے آتے ـــ"

"جا کر پوچھوں؟"

"نہیں نہیں آپ مت جایئے ـــ پلیز!" اُس نے میرے کندھے پر اپنا سر ڈال دیا اور میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت بھی مضبوط کر لی۔ کچھ دیر بعد ہمیں گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی باہر نکلا تھا۔ وہی ـــ لیکن اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا ـــــ وہ دھیرے دھیرے ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ اُسے کھولنے کی کوشش کی۔ ہم نے اپنی سانسیں روک لیں ـــــ وہ واپس چلا گیا۔ جدھر سے آیا تھا۔ پانی میں دوڑتا ہوا ہی گیا۔ بجلی چمکی تو ہمیں اُس کے کندھے کے ساتھ لٹکی ہوئی ایک رائفل جیسی چیز دکھائی دی۔

سڑک پر کوئی دوسری گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ کسی بھی طرف سے ـــــ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا آس پاس کے کتنے بنگلے آباد ہیں اور کتنے غیر آباد پڑے ہیں ـــــ کسی بھی جگہ زندگی کے آثار نہیں دکھائی دیتے تھے ـــــ گہرا اندھیرا تھا اور زور زور سے مینہ برس رہا تھا۔ بجلی کبھی کبھی ہی چمک جاتی تھی ـــــ اچانک میں نے وبھا کے سسکنے کی آواز سُنی ـــــ سر جھکا کر اُسے دیکھا ـــــ ہاتھ بڑھا کر اُس کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ اُس کے آنسو پونچھے ـــــ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے

دلاسادیا۔

"گھبرائیے نہیں۔ میں جو آپ کے ساتھ ہوں ــــ ابھی صبح ہو جائے گی۔ یہ زندگی کا خاتمہ نہیں ہے۔"
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوئی جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ خاموش رہ کر وقت کاٹنا زیادہ مفید معلوم ہوتا تھا ــــ اگر بادل نہ گھرے ہوتے تو شاید آسمان پر لالی کی چھٹک بکھرنے کے قریب ہوتی۔ میں نے ہاتھ سے ونڈ اسکرین کو صاف کرنا چاہا۔ پھر ایک جھاڑن لے کر اُسے صاف کیا۔ اپنے پاس کی کھڑکی کا شیشہ بھی ــــ لیکن انہیں باہر سے بھی پونچھنے کی ضرورت تھی ــــ میں جانتا تھا، وہ مجھے دروازہ نہیں کھولنے دے گی۔ میں نے ہاتھ روک لیا ــــ اُس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کاندھے پر ہی سر رکھے سو گئی تھی۔ اُس کی ہلکی ہلکی سانسوں کی اور بالوں کی مہک میں پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں ایک عورت کی خوشبو محسوس کرنا کتنا بڑا تجربہ تھا۔ جو میری پسندیدہ لڑکی بنی رہی تھی۔ جس کا انتظار میرے محض خوابوں کا ایک حصّہ تھا۔ ایسے خوابوں کے تانے بانے کا جس کا تصور ہی میرے لئے بے حد لذّت آمیز تھا۔ اب وہ میرے بازو کے حلقے میں بے خبر سو رہی تھی۔ پورے اطمینان سے سو رہی تھی ــــ اُس کا سارا خوف میں نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا ــــ رفتہ رفتہ اُس کے چہرے پر روشنی پھیلنے لگی۔ میں نے اُس کے دلکش چہرے پر ایک دل لُبھانے والی ملاحت دیکھی۔ کیا وہ واقعی اِس قدر خوبصورت تھی۔ اُس کے اِس حُسن کا تو میں نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ رات بھر خوشی، مسرت، خوف اور دہشت کے ماحول میں جاگتے رہنے کے بعد اب جبکہ وہ تھک کر گہری نیند سو گئی تھی صبح کے نور نے اُس کے چہرے پر اپنا غازہ مل دیا تھا۔ اُسی کی آنکھیں ہی سیاہ پلکوں کے سائے میں بند تھیں۔ اُس کے ہونٹ تازہ کھلے ہوئے گلاب کی مانند سرخ تھے۔ اُس کے کالے چمکیلے بال اُس کے کانوں سے نیچے اُتر کر اُس کے چہرے کے گرد ایک دلکش ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ اُس کا سارا جسم گہرے بھورے رنگ کی شال میں لپٹا ہوا تھا۔ میرا ایک ہاتھ وہ ابھی تک اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔

میں نے اچانک کسی کو گاڑی کے بند شیشوں میں سے اندر جھانکتے ہوئے محسوس کیا اور گھبرا کر سر اُٹھایا۔ ایک طرف پروفیسر حضور سنگھ کھڑے تھے۔ بنا پگڑی کے۔ پانی میں تر بتر ــــ دوسری طرف آنٹی کھڑی تھیں۔ بھیگے ہوئے دوپٹے سے اپنے آپ کو پوری طرح لپیٹے ہوئے۔

میں نے جلدی سے کھڑکی کھول دی۔

"آپ لوگ رات بھر یہاں رہے؟ میلے میں نہیں گئے تھے؟" پروفیسر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہاں تو غضب ہو گیا ــــ بم پھٹا ــــ گولیاں چلیں ــــ کئی لوگ مر گئے ــــ کئی زخمی ہوئے ہیں۔"

"آنٹی جلدی جلدی بول رہی تھیں ــــ "سارا کچھ تباہ ہو گیا ــــ بالکل برباد اور غارت ہو گیا۔ یہاں تو اچانک کوئی نہ کوئی واردات ہو جاتی ہے۔ جتنا کچھ بناتے ہیں اُس سے زیادہ بگڑ جاتا ہے۔"

ہمارے بولنے کی آوازیں سُن کر وبھا کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے ہم سب کی طرف حیرت سے دیکھا ــــ پھر پروفیسر صاحب اور آنٹی کو پہچان کر اُسے کچھ اطمینان ملا۔ ہم دونوں باہر نکل آئے۔ آنٹی نے وبھا کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا ــــ اُس کے سر کو بار بار چومتی ہوئی بنگلے کے اندر لے گئیں ــــ پروفیسر صاحب اور میں گیٹ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

"سر، دراصل ہوا کیا؟ ہم نے تو میلے سے یہاں لوٹ کر دھماکا سُنا تھا ــــ اور گولیوں کی تڑاتڑ!"

"کسی نے ایک ایسی جگہ ٹائم بم چھپا کر رکھ دیا تھا جہاں بہت سے لوگوں کی بھیڑ ہونے کی اُمید تھی ــــ بھیڑ تو ہر جگہ تھی۔ تم نے دیکھا ہی تھا ــــ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ بس پھر کچھ نہ پوچھو ــــ جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑ رہے تھے ــــ اچانک ایک طرف سے اے۔ کے فائی سیون سے فائر ہونے لگے۔ اُس میں بھی کئی لوگ مارے گئے ــــ پولیس تھوڑی بے خبر ہو گئی تھی۔ جبکہ اُس کی تعداد کافی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکی ــــ مارنے والے مار کر بھاگ گئے ــــ ہماری گاڑی بھی لے گئے۔"

"کون لوگ تھے وہ؟ میرا مطلب ہے کسی خاص گروپ کے؟ کسی نے ذمّہ داری لی؟"

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے ــــ شام تک معلوم ہو سکے گا کہ وہ کس کا گروپ تھا کچھ لوگ کہہ رہے تھے جیل سے کچھ خطرناک قیدیوں کو اسی کام کے لئے خاص طور پر لایا گیا تھا۔ تاکہ دہشت پھیلے اور دہشت گردوں کے مخصوص گروہ بدنام ہوں ــــ"

"کیا گورنمنٹ بھی ایسا کراتی ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں کراتی ہے ــــ واہگورو جانے حقیقت کیا ہے!"

"اگر ایسا ہے تو گورنمنٹ کو فائدہ کیا ہے؟"

"تاکہ مسئلہ اُلجھا رہے ــــ اور اُلجھ جائے۔ اگر اس منطق پر یقین کر لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ پرانے سیاستدانوں کی کھیپ کو ختم کرا دینا چاہتی ہے۔ اس کرائیسس سے کوئی دوسری لیڈرشپ ابھر کر آئے گی۔ کبھی نہ کبھی تو!"

"جو لوگ یہ بات کہتے ہیں کیا وہ قابل اعتبار ہیں؟"

"میں نے کہا نا، یہاں جتنے منہ اتنی باتیں ــــ کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ــــ ہم تو بس واہگورو کے بھروسے پر جی رہے ہیں ــــ جب تک گاڑی چلتی ہے چلاتے رہیں گے ــــ"

اندر جا کر سب نے کپڑے بدلے ــــ آنٹی گرم گرم چائے بنا کر لے آئیں۔ میں نے چائے پیتے ہوئے اُنہیں بتایا۔

"رات کو کوئی آپ کے بنگلے کے اندر بھی گھسا تھا۔ اُس کے پاس شاید اے۔ کے۔ فارٹی سیون ہی تھی۔ اُس نے ہماری گاڑی کا دروازہ کھولنے کی بھی کوشش کی تھی۔ کامیاب نہیں ہوا تو برستے پانی میں چلا گیا۔"

یہ سُن کر میاں بیوی کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا۔ ایک دوسرے کی طرف حیرت سے تاکنے لگے۔ وہ خاموش رہ گئے تو میں نے پوچھا "آپ کی جان کو شاید خطرہ ہے!"

"خطرہ تو ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ جو اُن کے ساتھ نہیں ہیں اُنہیں وہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں ــــ میں نے کہا نا، زندگی کا یہاں کوئی بھروسا نہیں ہے!"

آنٹی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں ــــ "رات کو وہاں کتنا اچھا میلہ جُڑا تھا۔ ہزاروں لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ اب وہاں کیا ہے؟ اسپتالوں اور پولیس والوں کی گاڑیوں میں لاشوں کو ڈھویا جا رہا ہے۔ زخمیوں کو دور نزدیک اسپتالوں کی طرف بھگا بھگا کر لے جایا جا رہا ہے۔ بارش کے پانی میں سارے تمبو اُکھڑے پڑے ہیں۔ آرٹسٹوں کے ڈھول، سارنگیاں، اِکتارے اِدھر اُدھر لڑھکتے پھرتے ہیں۔"

اچانک پروفیسر حضور سنگھ کی نظر ایک لفافے پر پڑی جو کھڑکی میں پھنسا ہوا تھا ــــ وہ جلدی سے اُسے اُٹھا کر لے آئے۔ کھول کر پڑھنے لگے۔

"میرے پیارے دارجی و جھائی جی۔ ست سری اکال۔ آپ مجھ سے
ناراض ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن میں اپنے فرض سے منہ
نہیں موڑ سکتا۔ آپ کا جیتو!"

وہ آدمی جسے سرتیش نے رات کو یہاں دیکھا تھا وہ ہمارا من جیت تھا ــــ میرا تو یہ سنتے ہی ماتھا ٹھنکا تھا ــــ "وہی ہوگا۔ اور یہ کام اُسی گروپ کا ہے جس میں وہ شامل ہو گیا ہے ــــ"

آنٹی ہکا بکا سی بیٹھی رہ گئیں ــــ وبھا بھی خاموش تھی۔ سردارجی اپنا جوڑا کھول کر بڑے اطمینان سے بالوں میں کنگھی کرنے لگے۔

جب ہم پٹیالہ شہر سے باہر نکلے تو چھ بج رہے تھے ــــ سڑک پر مسلّح پولیس کی گاڑیاں بڑی تیزی سے آجا رہی تھیں۔ کسی کسی گاڑی کو روک کر پولیس والے تلاشی بھی لے رہے تھے۔ لیکن دودھ کے کین بھر بھر کے جانے والے ویگن، ٹریکٹر اور ترکاریوں کی بوریاں اور چھابے لاد کر لے جانے والے ریڑھے جن کے آگے تیز رفتار گھوڑے جُتے ہوئے تھے، پولیس والوں کی دخل اندازی سے بے نیاز ہو کر چلے جا رہے تھے۔ کوئی انہیں روکتا تو وہ فوراً رک جاتے۔ اُنہیں جانے کی اجازت ملتی تو خاموشی سے آگے بڑھ جاتے تھے ــــ جیسے یہ سب اُن کے لئے ایک معمول بن گیا ہو۔ وہ نہ بحث کرتے نہ ہی کسی قسم کا جھگڑا۔

ترکاریوں اور دُودھ سے لدے ہوئے یہ سارے ویگن بڑے شہروں کے لئے تھے۔ انبالہ، چنڈی گڑھ، لدھیانہ وغیرہ۔ بڑے شہروں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے والے۔ وہاں کے لوگوں کے لئے قصبوں اور دیہات کے لوگ کتنی محنت کرتے ہیں۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کی پرورش میں جی جان لگاتی ہے۔ رات رات بھر جاگتی رہ جاتی ہے۔ اس کے بچے بڑے ہو کر ماں کو اتنا سکھ نہیں دیتے جتنے کی وہ حقدار ہوتی ہے۔ جتنا سکھ، جتنی سہولیات بڑے شہروں کے حصے میں آتی ہیں اُتنی دیہات کو کبھی نہیں دی جاتیں۔ اسپتال، ریسرچ سنٹر، ایئر کنڈیشنڈ سنیما، کالج، یونیورسٹیاں، سپر بازار، فیشن گھر، سب کچھ شہروں کے حصے میں آتا ہے۔

میں دھیرے دھیرے ڈرائیو کرتا ہوا شہر سے کافی دُور نکل آیا۔ ملٹری کے کئی جوان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بنیائن اور نیکریں پہنے سڑک کے کنارے دوڑ لگا رہے تھے۔ شاید چھاؤنی قریب تھی۔ وِبھا کے چہرے پر صبح کی ٹھنڈی ہوا نے ایک تازگی پیدا کر دی تھی۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ اُس نے اپنے اور میرے درمیان پھر ایک فاصلہ پیدا کر لیا تھا۔ اسے اجنبیت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

لیکن اسے بے تکلفی بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ میں نے اُس سے کہا۔

"میں اس بات سے بے حد شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کل سے اتنی تکلیف اٹھانی پڑ گئی۔ پتہ نہیں کیا ہو جاتا ــــــ! خوش قسمتی سے ہم بچ گئے۔ ورنہ خطرے تو ہمارے سروں پر منڈلاتے پھر رہے تھے۔"

وہ بھاونڈا اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی، کیا جواب دے ــــ اُسے خاصی پریشانی تو اٹھانی ہی پڑی تھی اس میں کوئی شک نہیں تھا اور اس کے لئے میں ہی ذمہ دار تھا کہ میں سیدھے مالیر کوٹلہ جانے کے بجائے اُسے پٹیالہ لے گیا تھا ــــ وہاں کے سارے واقعات خصوصاً رات کے خاصے روح فرسا بن گئے تھے۔ اُس نے بالآخر زبان کھولی۔

"جو کچھ ہوا وہ میرے بھی نصیب میں تھا۔ آپ نے بھی کم پریشانی نہیں اٹھائی لیکن اب اسے یاد نہ کیجئے ــــ آگے کے بارے میں سوچیں ــــ"

آگے کسی شہر کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کھیتوں کے کنارے کچھ پکّے مکانات، کنوئیں اور رہٹ، کہیں کہیں ٹریکٹر اور ٹیوب ویل بھی ــــ ایک جگہ اناج پیسنے کی مشین چل رہی تھی۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ــــ ایک پیڑ کے ساتھ اُونچے اُونچے گنّوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک آدمی گنّوں کے چھلکے چھیل چھیل کر اور ان کے دو دو، تین تین ٹکڑے کاٹ کر اپنے گاہکوں کو دے رہا تھا ــــ ایک ٹھیلے پر مونگ پھلی کا ڈھیر دیکھ کر میں نے گاڑی روک لی۔

"مونگ پھلی لے لی جائے ــــ سفر ذرا قابل برداشت ہو جائے گا ــــ کیوں؟"

وہ بھا نے انکار نہیں کیا ــــ جب میں کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر مونگ پھلی کا لفافہ لے رہا تھا اُسی وقت ایک اندھا فقیر اپنے نابالغ بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہاں گاتا ہوا آنکلا۔

دو سادھو آئے جتّی ستّی

دو سادھو آئے جتّی ستّی

دونوں کے جسم پر پیوند لگے کمبلوں کے لبادے لٹک سے رہے تھے۔ جن میں جگہ جگہ سوراخ تھے اور کناروں سے اُونی تاگوں کے تار تار لٹک رہے تھے۔ دونوں کے کندھوں سے تھیلے بھی جھول رہے تھے اُن کے ہاتھوں میں ٹین کے ڈبّے تھے جن کے اندر کچھ سکّے پڑے تھے۔ وہ انہی سکّوں کو ڈبّوں کے اندر کھنکھنا کر گا تا گا رہے تھے۔ اُن کے گرد سننے والوں کا ایک مجمع سا لگ گیا۔

دو سادھو آئے جتّی ستّی

پیسہ نئیں سی منگدے

دھیلا نہیئں سی منگدے

منگدے سی،

سونے دی رتّی رتّی

پنج سیر پکا آٹا ہووے
دیسی گھی دا باٹا ہووے
تیری ہوجاؤ وگی گتی گتی
دو سادھو آئے جتی جتی

وبھا اُن کی آواز اور اُن کے الفاظ سے اتنی متاثر ہوئی کہ اُس کی پلکوں پر آنسو تیر تیر گئے اُس نے اپنے پرس میں سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر مونگ پھلی والے کو دیدیا تاکہ وہ اُن سادھوؤں کے ڈبے میں ڈال دے اور مجھ سے بولی۔

"گاڑی بڑھا ہے"

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہ گئی ـــــ جب وہ متوازن ہوئی تو اُس نے کہا ـــــ "ہمیں پنجاب کے سکّے کے دونوں رُخ دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک رُخ تو یہ ہے کہ وہ گلے گلے تک اپنے کلچر، مشترکہ تہذیبی روایات اور ہر دم آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے ایک نئے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ دوسرے رُخ پر صرف اے۔ کے۔ فارٹی سیون رائفل ہی نظر آتی ہے۔"

"پنجاب کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے کوئی بڑا لیڈر نہیں ملا۔ جتنے ملے وہ بونے اور غیر دانشور تھے پہلے وہ آپس میں لڑتے رہے۔ پھر انہیں دہشت گردوں نے ایک ایک کرکے ختم کر دیا۔"

"میرا خیال ہے اس کے لیئے سنٹرل گورنمنٹ ذمہ دار ہے۔ اُس نے کسی بھی ریاست میں کسی لیڈر کو اہم نہیں بننے دیا۔ جس کسی نے ذرا سر نکالا اُس کے پر کاٹ دیئے گئے۔ جبکہ آزادی سے پہلے یہ فضا نہیں تھی۔ مہاتما گاندھی اپنے آپ اتنا بڑا لیڈر نہیں بن سکتا جب تک کہ اُس کے دوسرے قومی ہم عصر اس کا امیج بنانے میں مدد نہیں کرتے۔ بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل وغیرہ۔ گاندھی جی نے بھی ان کی تعمیر و تشکیل میں پورا حصّہ لیا۔ ان سب کو اس بات کا احساس تھا کہ ملک کو ایک اعلیٰ قیادت کی ضرورت ہر وقت رہے گی۔ اس لئے آپسی اختلافات کے باوجود ملک کے مفاد کو مقدم سمجھتے تھے۔ اس بارے میں سبھاش چندر بوس کی مثال دوں گا۔ اُسے مہاتما گاندھی کے ساتھ مت بھید کی وجہ سے پہلے کانگریس، پھر ملک چھوڑنا پڑا۔ جب آزاد ہند فوج نے بھارت کی دھرتی پر قدم رکھا تو سبھاش نے اپنے پہلے ہی براڈکاسٹ میں راشٹر پتا کو سلام پیش کیا۔ یعنی اُس کی قومی شخصیت کی نفی کرنے کے بجائے اُس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔ ان رہنماؤں کو ملک کا نظم و نسق زیادہ عزیز تھا۔ شاید اُس وقت کے رہنماؤں میں قانون دانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ قانون توڑنے سے پہلے اس کے نتیجوں کے بارے میں بھی سوچ لیتے تھے۔ جب بار دولی ایجی ٹیشن میں بائیس پولیس والوں کا قتل عام کر دیا گیا تو مہاتما گاندھی نے فوراً ایجی ٹیشن روک دی ـــــ اُن کا یہ کہنا تھا کہ اگر بار دولی کی پُر امن سول نافرمانی کامیاب ہو جاتی اور انگریزی حکومت بار دولی کے ہیروز کے حق میں دست بردار ہو جاتی تو پھر

قانون شکن لوگوں پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔ وہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک کر غیر انسانی حرکتیں کر گزرتے
ایک اور مثال اسی سلسلے میں سردار پٹیل کی اس واقعے سے دی جا سکتی ہے کہ اُس نے ہندوستانی راجوں
مہاراجوں کے ساتھ انڈین یونین میں شامل ہونے کے لئے بات چیت کا راستہ اپنایا جبکہ وہ انہیں ایک
بھی پیسہ دیے بغیر اُن پر بل ڈوزر بھی چلا سکتا تھا۔ لیکن اُس کے اندر کا قانون دان اس بات کا احساس
کرتا تھا کہ اگر بطور حاکم اُس نے قانون کی عزت نہیں کی تو دوسرے لوگ بھی ویسا ہی کرنے لگیں گے۔"

وبھا کے پولیٹیکل دلائل سُن کر میں حیران رہ گیا ـــ وہ اندر سے ایک خوبصورت خاموش
بُت ہرگز نہیں تھی ـــ "آپ ٹھیک کہتی ہیں ـــ پنجاب میں جو بھی لیڈر آیا اُس نے لوگوں کی شکایتوں
پر بحث چلانے کے بجائے دھمکیوں اور بائیکاٹ کا راستہ اپنایا ـــ پھر ایسے ہی لوگوں کی ایک
پوری نسل تیار ہو گئی۔ جو امن اور شانتی سے بات ہی نہیں کرنا جانتی ـــ زبان کا مسئلہ جو پہلے سب
سے آگے تھا اب پیچھے رہ گیا ہے۔ اگر اُسی وقت اس مسئلے کو حل کر دیا گیا ہوتا تو اُس کی وجہ سے اتنی کرواہٹ
نہ پیدا ہوئی ہوتی ـــ"

میں نے وبھا کی طرف دیکھا ـــ یہ جاننے کے لئے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتی ہے ـــ!
اُس نے اپنے خیالات کے اظہار میں دیر نہ لگائی ـــ بولی۔

"زبان کسی بھی کلچر کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر اسے جڑ سے کاٹ دیا جائے تو کلچر کا ہرا بھرا پودہ
مُرجھانے لگتا ہے۔ پہلے مسلمانوں نے اپنی فارسی کا سکّہ چلایا۔ اُنہوں نے مقامی اور عام فہم زبانوں
اور بولیوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ پھر انگریزوں نے اپنا سیاسی اثر بڑھانے کے لئے ایسا کیا۔
کئی وبھاگوں میں۔ فارسی کی جگہ اُردو اور ہندی نے لے لی۔ دونوں جنتا کی زبانیں ہیں۔ ابھی ہیں لیکن
ریاستی زبانوں کو خصوصاً پنجابی کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ زبان پنجاب کے ہندوؤں، مسلمانوں
اور سکھوں کا مشترکہ ورثہ تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد پنجابی زبانوں کو سہارا دینے والے صرف سکھ
تھے۔ انہوں نے اپنے دھرم کے پرچار کے لئے بھی اسی کو استعمال کیا تھا ـــ اُس کا ایک خاص اسکرپٹ
بنا لیا تھا۔ جسے اُنہوں نے گورمکھی کا نام دیا ـــ یعنی گورو کے مُکھ سے نکلی ہوئی۔ یہ کام سولہویں صدی
میں گورو انگد دیو جی نے کیا تھا ـــ لیکن پنجابی سکھ طبقے کی دھار مک بھاشا ہونے کے علاوہ پورے
پنجاب کے لوگوں کی کلچرل بھاشا تھی جو سکھ دھرم کے آنے سے پہلے بولی جا رہی تھی ـــ یہ تو
ہندوستان میں آریوں کے آنے سے پہلے بھی پورے پنجاب اور کشمیر تک میں رائج تھی۔ اس
زبان میں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں اور پنجاب میں مقیم دوسرے فرقوں کے بھی گرنتھ موجود
ہیں۔ اس زبان کے دھرتی کے ساتھ جڑے ہوئے محاورے، اُس کی برجستگی، اُس کا کھلا پن
اور اس کا پھیلاؤ سارے پنجابیوں کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ لیکن سیاسی لوگوں
نے پنجابی ہندوؤں کو اس خوبصورت زبان سے الگ کر لیا اور سکھوں کو اسی کی حفاظت
کے لئے تنہا چھوڑ دیا ـــ یہ ناانصافی اب کئی مسائل کا رُوپ دھار کر الگاؤ وادیوں کے لئے

ایک سیاسی ہتھیار بن چکی ہے۔"

ایک خاموشی پسند عورت کا جو ذاتی دکھوں کا بھی شکار رہو، اس قدر پختہ سیاسی شعور میرے لئے نہ صرف حیرت کا باعث بنا بلکہ اُس نے مجھے کل سے اب تک کے واقعات پر بھی غور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ میں نے کس کس موقعہ پر اُسے صرف ایک خوبصورت عورت سمجھ کر اُس کے ساتھ بات کی۔ اُس کے ساتھ اظہارِ عشق کرنے میں کہیں چھچھورے پن کا ثبوت تو نہیں دیا؟ اس کے ساتھ تو مجھے پورے احترام سے پیش آنا چاہیے تھا۔

مالیر کوٹلہ جاتے ہوئے ہم نابھا سے گذرے ــــ نابھا کبھی ایک رجواڑے کی ریاست تھی۔ اُس کا محل اب اُجڑ چکا ہے ــــ اُس کا سارا اقتدار اور شان شوکت اور دبدبہ ختم ہو چکا ہے۔ جس محل کے سامنے سے عام آدمی کو گذرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے احاطے میں جھاڑ جھنکار اُگ رہا ہے۔

سڑک کے کنارے کنارے بس اسٹینڈ تک رہٹوں کے، چارہ کاٹنے کی مشینوں کے اور لوہے کے ہلوں کے بڑے بڑے کل پرزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ــ یہ ساری مشینیں اور ہل اور اُن کے پھل پنجاب کے صنعتی شہروں سے بنا کر لائے جاتے ہیں۔ وہاں ٹریکٹروں کے بھی شوروم دکھائی دیے ــ چھوٹے چھوٹے خوبصورت ریستوران بھی ــ جہاں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ جاٹ اپنے اپنے لباسوں کے فرق کے باوجود بڑے اطمینان سے کھا پی رہے تھے۔ تندور پر بھنے ہوئے مرغوں اور گوشت کے تکوں کو بڑی بے رحمی سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ کھانے والوں میں مرد اور عورتیں ہر عمر کی شامل تھیں۔ وہ سب یکساں طور پر مسرور اور مطمئن تھے۔ سفید داڑھیوں والے بھاری بدن والے سردار کچھ زیادہ ہی جوان نظر آئے۔ رنگین تہمدیں، کُرتے اور پگڑیاں، گرم چادریں اور کمبل اور امپورٹڈ نفیس قسم کے اوورکوٹ اوڑھے ہوئے۔ سینے پر کارتوس کی پیٹیاں اور بغل میں لٹکے ہوئے پستول قریب قریب ہر ایک آدمی کے پاس تھے۔ کسی کسی نے کندھوں سے بندوقیں لٹکا رکھی تھیں۔

بس اسٹینڈ پر اسکول جانے والی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ شہری لڑکیوں کے سے لباس اور میک اپ لیکن خدوخال اُن کے دیہاتی یا پس ماندہ ضلع کے ہونے کی غمازی کر رہے تھے۔ وہ سب آس پاس کے دیہات کے اسکولوں میں پڑھانے والی استانیاں تھیں جو بسوں ہی کے

ذریعے سے بڑی آزادی سے آتی جاتی تھیں ___ چھوٹے بڑے قصبوں اور شہروں میں گھوم گھوم کر مختلف فیکٹریوں و کمپنیوں کا بنا ہوا سامان بیچنے والے سیلزمین اُن استھانوں کے ساتھ کندھا رگڑ رگڑ کر ٹکٹ گھروں سے ٹکٹ لے رہے تھے اور بہت خوش نظر آتے تھے۔

پاکستان کے مغربی پنجاب سے آئے ہوئے کچھ دوکاندار پرانے گیٹ کے پاس ابھی تک لکڑی کے اسٹالوں ہی میں روٹی روزی کی جگاڑ بنائے ہوئے تھے ___ وہ نیواڑ، رنگ برنگے کھیسوں اور سوتی چادروں کی تجارت کرتے تھے۔ کچھ اسٹالوں پر کھانے پینے کا سامان بھی تھا ___ چائے، بسکٹ، انڈے، ریوڑیاں وغیرہ۔ ۱۹۴۷ء میں یہ لوگ آگ اور خون کے سیلاب پار کر کے یہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے لباسوں، ناک نقشے اور لہجے کی وجہ سے فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی نسل کے لوگ اب بھی سر پر بالوں کے پٹے رکھتے ہیں۔ داڑھی و مونچھیں خالص اسلامی طرز پر ترشواتے ہیں۔ کسی کسی کے کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی جھوم رہی تھیں اور ان کے سر پر بھاری بھاری سفید پگڑیاں سجی ہوئی تھیں۔ کچھ بڑے سلیقے سے جما جما کر بیٹھی ہوئیں اور کچھ بڑی بے پروائی سے۔

اسی نابھا کے بارے میں معاً ذہن میں ایک بولی بھی سرسرا سی گئی۔

نابھے دیئے بند بوتلے، تینوں پین گے نصیباں والے۔

بظاہر تو بڑی بے ضرر بولی ہے ___ اے نابھا کی بند بوتل، تجھے نصیبوں والے ہی پی سکیں گے۔ لیکن اس کا علامتی رمز ایک کنواری لڑکی کا تصور ذہن میں لے آتا ہے۔ عام طور پر لوگ انہی معنوں میں اسے پڑھتے اور سناتے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق شہر کا نام بھی بدل دیتے ہیں۔ انبالہ، جالندھر، پٹیالہ ___ وغیرہ۔

میں اتنی رومانی بولی یاد کر کے بھی سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ میں اور وبھا، دونوں ایک سے خاموش موڈ میں آس پاس کے ہر ایک منظر کو غور سے دیکھتے جا رہے تھے ___ ہر چہرے کی طرف بھی۔

اب مالیر کوٹلہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ اب ہم مالیر کوٹلہ ہی کے بارے میں سوچتے جا رہے تھے ___ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کی طرف جن میں ہر طرف پیلی سرسوں اُگی ہوئی تھی ___ اُن کے بیچ میں کہیں کہیں کچے و پکے مکان، نہروں پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے پُل، سائیکلوں پر جاتے ہوئے دیہاتی جو ہمیں اپنی طرف زیادہ متوجہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہم اُن کی طرف دیکھتے ضرور تھے ___ اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے ہونے کے باوجود ___

مالیر کوٹلہ کے مضافات میں پہنچ کر میں نے ایک صدمہ سا محسوس کیا ___ اب وبھا کو کسی جگہ اُتار کر مجھے آگے بڑھ جانا ہو گا۔ اتنی اچھی، حسین اور ذہین ہمسفر سے کئی گھنٹوں تک الگ رہنا ہوگا۔ کل تک کے لئے ___ لیکن میں نے اپنی یہ کیفیت وبھا پر ظاہر نہیں ہونے دی ___ اپنے چہرے پر چھائی ہوئی خوشی ہی کو قائم رہنے دیا ___ ایک سنجیدہ مسرت کو۔ ایسا کر لینے پر میں قادر تھا۔

میں نے ایک بستی کے باہر اچانک گاڑی روک لی ___ اسٹیئرنگ پر دونوں بازو پھیلا کر

وِبھا کی طرف دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے پوچھا ـــــ "کیا ہوا ؟"

"کچھ نہیں ـــــ"

"گاڑی کیوں روک لی ؟ چلئے نا !"

"کہاں چلیں ؟"

"شہر کے اندر اور کہاں ؟"

"کونسے راستے سے ؟"

"سیدھے ـــــ" اُس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُس کے بعد ؟"

میں اُس سے اُس کے بھائی کے گھر تک پہنچنے کے لئے سارا نقشہ سمجھ لینا چاہتا تھا۔

"اُس کے بعد ؟"

مجھے مسکراتا دیکھ کر بھی وہ سنجیدہ ہی رہی۔ میرا خیال تھا وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے تصوّر سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہوگی ـــــ میں خود بھی ایک طویل خاموشی کے بعد اس کیفیت کو بدلنا چاہتا تھا اسی لئے ذرا سا شوخی کا راستہ بھی اختیار کر لیا تھا ـــــ جب اُس کے چہرے کے سکوت کی برف نہیں ٹوٹی تو میں نے ایک فیصلہ کر کے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

"جہاں رکنا ہو گا بتا دیجئے گا"

میں اس شہر میں پہلے بھی دو بار آچکا تھا۔ موتی بازار میں نوجوت پریس کے سامنے ایک تیل گودام کے مالک سے جا کر ملا تھا ـــــ اب بھی وہیں جانا تھا ـــــ لیکن وہاں جانے سے پہلے وبھا کو اُس کے بھائی کے گھر چھوڑنا تھا۔ جس کا پتہ وہ خود بتائے گی۔

کسی بھی شہر میں بہت کچھ جلدی جلدی نہیں بدلتا ـــــ دس دس، بیس بیس سال کے بعد تک بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ تک وہی کا وہی رہتا ہے ـــــ مختلف طرح کے سامان سے بھری ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانیں ـــــ جوتوں، لکڑی کے رنگین پایوں والے پلنگوں، تالوں، کنجیوں، ٹارچوں، گیس کے پرانے و جدید قسم کے لیمپوں کی۔ سلائی مشینوں کی مرمت کرنے والے کاریگروں اور ٹرنک سازوں نے بھی سڑک کا بہت سا حصّہ گھیر رکھا تھا۔ اُن کے کاریگر سڑک پر ہی ٹین کی بڑی بڑی چادریں پھیلائے اُنہیں لکڑی کے ہتھوڑوں سے پیٹ پیٹ کر سیدھا کر رہے تھے۔ کپڑا بیچنے والوں نے نمونے کے طور پر جن کپڑوں کو برسوں سے دکان کے باہر لٹکا رکھا تھا اُنہیں دھوپ، ہوا اور مکھیوں نے داغدار بنا دیا تھا۔ جانوروں کے استعمال کے لئے سڑک کے کنارے رکھی ہوئی کھل اور بھوسوں کی بوریوں سے ایک خاص قسم کی بساند اُٹھ رہی تھی ـــــ ویدوں اور حکیموں کے مطبوں کے اندر ٹیڑھے میڑھے تختوں پر قطار در قطار رکھی ہوئی شیشیوں کے لیبل بے رنگ ہو چکے تھے ـــــ سارا بازار ایک ہی طرز کا تھا۔ ایک سی

دُکانیں، ایک سے ٹاٹ اور پلاسٹک کے چھجے —— یہ بازار ایک صدی پہلے یہاں کے نواب صاحب کے حکم سے بنایا گیا تھا —— اب بھی یہ یہاں کا خاص بازار سمجھا جاتا ہے —— جہاں ہندو مسلمان اور سکھ شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں —— غیر منقسم پنجاب کے کسی بھی دوسرے درجے کے شہر کا سا پرانا ماحول ابھی تک قائم ہے۔ لوگوں کے لباس بھی ایک سے ہیں —— پنجاب کا یہ واحد شہر ہے جہاں سن سنتالیس میں فساد برپا نہیں ہوا تھا —— ایسا اُس وقت کے نواب کے سختی سے پیش آنے کی وجہ سے ہو سکا تھا۔

وِبھا نے ایک جگہ گاڑی رُکوا لی ——

وہ باہر نکلی تو کتنے ہی لوگوں کی نگاہیں اُس کی جانب اُٹھ گئیں —— ایک کلینک کے اندر بہت سے مریضوں کے درمیان گھرا ہوا ایک ڈاکٹر جو سکھ تھا، اُسے دیکھتا ہی رہ گیا —— مریض بھی اُسی کی جانب دیکھنے لگے۔ میں نے دکان کے اوپر آویزاں بورڈ پر اُس کا نام پڑھا —— ڈاکٹر اقبال سنگھ ایم بی بی ایس ——

اچانک ڈاکٹر اقبال سنگھ کُرسی چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ وہی وِبھا کا بڑا بھائی تھی۔ اُس کی تصویر میں وِبھا کے دہلی والے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ آزادی سے پہلے ہر ایک ہندو اپنے ایک بیٹے کو سکھ ضرور بنا دیتا تھا۔ یہ روایت گورو گوبند سنگھ کے زمانے سے چلی آئی تھی۔ جب اُنہوں نے خالصہ فوج کی بُنیاد رکھی تھی —— آزادی کے بعد یہ رواج اب قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر اقبال سنگھ اونچے قد کا ایک وجیہہ و شکیل نوجوان تھا۔ وِبھا سے چند برس بڑا اور اُس سے کچھ لمبا بھی اُس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ دیے —— خیر مقدم کرنے کے لئے —— وِبھا نے اُس کے ساتھ میرا تعارف کرایا تو اُس نے ہم دونوں کو دکان کے اُوپر بنے ہوئے مکان میں چلنے کے لئے کہا تو میں نے معذرت پیش کر دی۔

"ڈاکٹر صاحب، مجھے فوراً آئل گودام کے مالکوں سے ملنے کے لئے جانا ہے۔ اور آج رات کو یا کل صبح کو واپس دہلی بھی جانا ہے ——"

ڈاکٹر اقبال سنگھ نے کہا —— "جو بھی کام کرنا ہے آج ہی کر لیجیے —— کل تو سارا پنجاب بند رہے گا۔ پٹیالہ کے واقعہ کی وجہ سے شیو سینا اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے یہ نعرہ دیا ہے ——"

اُسی وقت ڈاکٹر اقبال سنگھ کی پتنی بلونت کور بھی آ گئیں —— وہ وِبھا کے ساتھ مجھے بھی اچانک دیکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گئیں —— وِبھا نے جب میرا تعارف اپنی بھابھی سے کرایا تو وہ مجھے اوپر چلنے کے لئے اصرار کرنے لگیں اور مجھے وہیں قیام کرنے کے لئے بھی کہا —— لیکن میں نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کا انتظام پہلے سے کیا جا چکا ہے —— اب میں کل کسی سمے آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ جہاں مجھے جانا تھا۔ وہ جگہ زیادہ دُور نہیں تھی —— وہاں جا کر میں نے حاجی غلام حسین سے ملاقات کی۔ وہ میرا کل سے انتظار کر رہے تھے۔ میرا تار اُنہیں مل چکا تھا۔

۱۴
چودہ

حاجی غلام حسین نے بس اسٹینڈ سے ملی ہوئی اپنی ایک سو ایکڑ زمین ہماری کمپنی کے ہاتھ بیچنے کے لئے سارے کاغذات تیار کرا رکھے تھے — ان کاغذات کو ہمارے اور اُس کے دونوں وکیلوں نے خاصی چھان بین کر لینے کے بعد تیار کیا تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس زمین کی رجسٹری کرا دی گئی — یہ سارا کام بڑے اطمینان بخش طریقے سے سرانجام پایا — اب ہماری کمپنی اس سال کسی بھی مہینے فیکٹری لگانے کی شروعات کر سکتی تھی۔ اس کام کے لئے دو غیر ملکی ماہرین اور بمبئی میں مقیم چند انجینئروں، منیجروں اور دوسرے اسٹاف کو یہاں لے آنا ہوگا۔ اس فیکٹری میں دو ہزار تک چھوٹے بڑے مقامی کارندوں کو روزگار مہیا کرایا جا سکتا تھا۔

اُسی شام کو میں نے مقامی اور صوبائی اخبارات کے نمائندوں کو چائے پر بُلایا۔ اپنی قیام گاہ پر جو ڈاک بنگلہ تھی — انہیں ناناجی بھائی پٹیل کیمیکل ورکس کی مجوزہ فیکٹری کے امکانی فائدوں سے باخبر کیا — اُس موقعہ پر حاجی صاحب اور اُس علاقے کے سابق ممبر پارلیمنٹ اور سابق ممبر اسمبلی پنجاب بھی موجود تھے — اخباری نمائندوں کو میں نے کمپنی کی گذشتہ صنعتی خدمات کے سلسلے میں شائع شدہ سالانہ رپورٹ کے فوٹو اسٹیٹ بھی پیش کر دیے۔

رات کو حاجی صاحب نے اپنی قیامگاہ پر ایک شاندار ڈنر دیا۔ میرے ہی اعزاز میں — اس میں شہر کے سرکردہ اشخاص کو بھی مدعو کیا گیا تھا — ضلع مجسٹریٹ، ڈی ایس پی، تحصیلدار، چند ایڈووکیٹ، سول سرجن، کچھ ڈاکٹر، کالجوں کے پرنسپل اور پروفیسر، سابق ممبر پارلیمنٹ اور سابق ممبر اسمبلی اور تجارتی حلقوں کے بھی کچھ اہم لوگ — وبھا کے بھائی ڈاکٹر اقبال سنگھ بھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر نریش کمار سے بھی وہاں اچانک دوسری بار ملاقات ہوگئی۔ پہلی ملاقات دو روز پہلے پٹیالہ میں پروفیسر حضور سنگھ کے گھر پر ہو چکی تھی۔ وہ اُسی شام کو مالیر کوٹلہ پہنچے تھے — وہیں کے رہنے والے

تھے — اپنے بھائی بندوں سے اکثر ملنے کے لئے چلے آتے تھے۔

ڈنر بہت ہی خوشگوار ماحول میں ہوا۔ رات گئے تک خوش گپیاں چلتی رہیں — پھر سب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ وہاں سے میری ہی گاڑی میں ڈاکٹر نریش کمار اور ڈاکٹر اقبال سنگھ واپس ہوئے۔ انہیں ڈاک بنگلے کو جاتے ہوئے راستے میں اُتارنا تھا۔

ڈاکٹر اقبال سنگھ نے مجھے اگلی صبح کو اپنے یہاں ناشتے پر مدعو کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا — وہ ناشتے پر میرا ساتھ وبھا اور بلونت کور ہی دے سکیں گی۔ کیونکہ میں صبح آٹھ بجے کلنک میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اگر آپ پونے آٹھ بجے تک آ جائیں تو میں آپ کے ساتھ ایک سادہ کپ چائے پی سکوں گا۔

میں نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔

ڈاکٹر اقبال سنگھ نے نریش صاحب کو بھی چائے میں شریک ہونے کے لئے کہا — اس درخواست کے ساتھ کہ وہ وہاں آ کر اُن کی کمی کو مجھے محسوس نہیں ہونے دیں گے۔

ڈاکٹر نریش کمار کے ساتھ تو اُن کے قریبی تعلقات تھے۔ اُس نے انکار نہیں کیا۔

رات کو جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو مجھے بار بار مسز حضور سنگھ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آتی رہی — آنٹی کو ڈاکٹر نریش کمار نے بتایا تھا کہ وہ وبھا کو جانتا ہے۔ چنڈی گڑھ میں رہنے کی وجہ سے — لیکن مالیر کوٹلہ میں آ کر اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ ڈاکٹر نریش کمار اُس کے بھائی اور بھابھی کو بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

جس وقت آنٹی نے ڈاکٹر نریش کے حوالے سے یہ بات بتائی تھی وبھا کا چہرہ فوراً اُتر گیا تھا۔ اُس کی یہ کیفیت مجھ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اگرچہ اس کا سبب مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ آخر کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تو تھا خوب گہری نیند آئی۔ صبح چھ بجے آنکھ کھلی — جلدی جلدی تیار ہو کر اپنا سامان گاڑی میں رکھوا یا۔ ڈاکٹر اقبال سنگھ کے یہاں سے ہو کر مجھے وہیں سے دہلی کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔ وبھا کو ساتھ لے کر۔

ڈاکٹر اقبال سنگھ کے گھر پہنچنے سے پہلے مجھے حاجی غلام حسین کے دولت کدے پر بھی حاضری دینے کے لئے پانچ منٹ مل گئے۔ ان سے رُخصت ہو کر میں ٹھیک پونے آٹھ بجے ڈاکٹر اقبال سنگھ کے یہاں پہنچ گیا۔ اُن کے کلنک کے اُوپر بنے ہوئے مکان پر۔ اُن کا کلنک بند تھا لیکن کچھ مریض آ چکے تھے تخت پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

ڈاکٹر اقبال سنگھ میرے منتظر تھے — موٹر کا ہارن سنتے ہی نیچے اُتر آئے اور مجھے اوپر لے گئے — اپنی بیوی سے اُنھوں نے پہلی بار رسمی طور پر ملایا۔

مسز بلونت کور ستائیس اٹھائیس برس کی ایک خوش شکل و خوش مزاج خاتون تھیں — مشرقی پنجاب میں برنالہ کی رہنے والی تھیں۔ حالانکہ اقبال سنگھ کا تعلق مغربی پنجاب سے تھا۔ اُس کے والد ڈیرہ غازی خان سے آئے تھے۔ ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد —

پنجاب کے دونوں حصّوں میں بولی جانے والی زبان میں کافی فرق تھا لیکن اسے پنجابی ہی کہتے ہیں ــــ اقبال سنگھ اور بلونت کور زبان کے لہجوں کے اختلاف سے بہت بلند تھے ــــ اُنہیں آپسی محبت نے ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔ ایک مہینہ پہلے برنالہ میں بلونت کور کے پورے خاندان کو جنگجوؤں نے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ مرنے والوں میں اُس کے والدین، تین بھائی، اُن کے چار بچّے اور دو بھابیاں شامل تھیں۔ اس المناک حادثے کے گہرے اثرات بلونت کور کے چہرے پر ابھی تک موجود تھے۔ بلکہ ایسا لگتا تھا۔ اس واقعے کو وہ عمر بھر نہیں بھول سکے گی۔ اب مائکے میں اُس کا رہ ہی کون گیا تھا ــــ اب تو اُس کا شوہر ہی اُس کے لئے سب کچھ تھا ــــ سب سے بڑا سہارا ــــ جو اُس سے بے حد محبّت بھی کرتا تھا ــــ اُس پر اپنی جان تک نچھاور کر سکتا ہے ــــ یہ حالات عام حالات سے بہت مختلف ہیں ــــ عام مصائب سے بالکل دیگر ــــ جب انسان کا انسان پر سے وشواس ختم ہو جاتا ہے ــــ جب ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہے کہ کوئی شخص جو پاس بیٹھا ہوا ہے نہ جانے کب اچانک وار کر کے جان لے لے! پنجاب کی اس دھرتی نے اس طرح کے بہت دکھ سہے ہیں ــــ کئی بار یہاں خون کی ہولی کھیلی گئی ہے۔ ایک دوسرے کے بے دریغ گلے کاٹے گئے ہیں ــــ ہندو سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے تھے ــــ جب الگ ہو گئے تو وہ آپس ہی میں لڑنے لگے ہیں ــــ اُس سے زیادہ بھیانک کھیل کھیلنے لگے ہیں۔ نفرت ایک ایسا کیڑا ہے جو کسی ہرے بھرے پیڑ پر چڑھ جائے تو اس کی ساری پتّیاں چٹ کر جاتا ہے ــــ جب کھانے کو کچھ باقی نہیں رہ جاتا تو وہ پھر اپنے آپ کو کھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال سنگھ اور بلونت کور کے آس پاس بچے وچے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر بڑے تجسّس سے دیکھا ــــ اُسی کی وجہ سے میں وہاں گیا تھا۔ اُس کی موجودگی میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ ڈاکٹر اقبال سنگھ خود ہی کچن سے میرے اور اپنے لئے چائے کی ٹرے اُٹھا کر لے آئے۔ مسز بلونت کور نے کچن کے دروازے پر رُک کر کہا ــــ

"ناشتہ آپ کو تھوڑی سی دیر کے بعد ہی دے سکوں گی۔"

میں نے ہنس کر کہا ــــ "ایسا لگتا ہے مجھے اپنا ناشتہ خود ہی تیار کرنا ہوگا!"

اس پر ڈاکٹر اقبال سنگھ نے تو کھل کر قہقہہ لگایا لیکن بلونت کور مسکرا بھی نہ سکیں۔ اُن کے چہرے پر مہمان نوازی کے پُرخلوص جذبات کے ساتھ ساتھ حزن و ملال کی جھلک بھی موجود رہی ــــ میں نے یہ بھی فوراً محسوس کر لیا کہ ڈاکٹر اقبال سنگھ کا قہقہہ اگرچہ بلند و بانگ تھا لیکن اس میں جذباتیت نام کو نہیں تھی ــــ وہ حقیقی خوشی سے عاری تھا۔ یعنی محض دکھاوے کا ــــ

بلونت کور نے کہا ــــ "نہیں جی، آپ کو ایسی تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ میں ذرا سنٹی کو دودھ پلا دوں ــــ"

سنٹی کا نام پہلی بار سن کر میں چونکا ــــ لیکن میں نے ابھی تک وہاں کسی بچے کی جھلک

نہیں دیکھی تھی ــــ اتنا ضرور یاد تھا کہ وبھا نے بھی اپنے بچے کا نام سنٹی ہی بتایا تھا ــــ اور یہ بھی کہ وہ انہی کے پاس رہتا ہے ــــ اپنے ماما اور مامی کے پاس ــ لیکن وہ بھی تو ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

چائے پی کر ڈاکٹر اقبال سنگھ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے نیچے اتر گئے ــــ یہ کہتے ہوئے ــــ ''ابھی نریش کمار بھی آنا ہوگا۔ وہی آپ کا ساتھ دے گا ــــ''

بلونت کور اچانک ہمارے کمرے سے باہر جا کر کچھ ہی منٹ کے بعد سنٹی کو اٹھائے ہوئے واپس آگئیں ــــ ایک بڑے سے تولیے میں لپیٹے ہوئے ــــ اسے نہلایا گیا تھا ــــ وہ سردی سے کانپ رہا تھا اور رو بھی رہا تھا ــــ کیا وہ خود نہا رہا تھا یا اسے کسی اور نے نہلایا تھا؟ وبھا کہاں ہے؟ میں کچھ نہ جان سکا۔ میری بے چینی بڑھتی گئی۔

جب بلونت کور سنٹی کو اچھی طرح پونچھ کر کپڑے بھی پہنا چکی تو میں نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ــــ

''بہت سیانا بچہ ہے! اپنے آپ ہی نہا لیتا ہے ــــ''

بلونت کور نے اس کے سر پر پیار سے بوسہ دیا اور کہا۔

''یہ کام وبھا نے کیا ہے ــــ''

وبھا کی گھر میں موجودگی کی خبر سن کر مجھے جیسے قرار آ گیا ــــ میں بلونت کور کو بچے کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے دیکھتا رہا ــــ اس کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے ــــ جن کی اس نے دو ننھی ننھی چوٹیاں بنا کر انہیں ربن سے باندھ دیا ــــ اس نے اسے گود میں لٹا کر سارے بدن پر پاؤڈر مل دیا۔ اور پھر اس کے منہ میں فیڈر دے دیا۔

اقبال سنگھ اور بلونت کور کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی بچے کو گود لینے کا فیصلہ کر چکے تھے ــــ اسے سکھ بھی بنانا چاہتے تھے۔

پرسوں اسی بچے سے ملنے کے لئے وبھا کتنی بے قرار تھی۔ ان لوگوں نے اسے اپنے یہاں آنے سے منع کر رکھا تھا ــــ وبھا اور اس کے والد کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے یہی معلوم ہوا تھا۔ اقبال سنگھ اور اس کی بیوی نہیں چاہتے تھے کہ سنٹی پر اپنی ماں کی جذباتیت کا اب سایہ تک پڑے ــــ کیا وبھا اپنے بچے کو اتنی آسانی سے بھول سکے گی؟ کیا اس کیلئے سنٹی سے دست بردار ہو جانا ممکن ہے؟ ابھی تک اس کے بھائی اور بھابھی نے میرے سامنے کچھ نہیں کہا تھا۔

میں نے من ہی من میں اسی طرح کی کئی باتیں سوچیں ــــ پھر جیسے اکتا کر بلونت کور سے کہا۔

''بڑا پیارا بچہ ہے۔ آپ کی گود میں آتے ہی چپ ہو گیا!''

''دودھ پیتے پیتے سنٹی کو نیند آنے لگی تھی۔ بلونت کور نے اس کی کنپٹی پر کاجل سے

ایک کالا نشان بنا کر کہا — "یہ وبھا کا بچہ ہے۔ اب ہمارے پاس رہتا ہے — وبھا نے آپ کو بتایا ہوگا!"

"جی — جی ہاں، کچھ ذکر تو کیا تھا —" میں نے قدرے جھجک دکھا کر جواب دیا۔

وہ کچھ دیر خاموش سی رہ گئیں — کبھی کبھی میری طرف نظریں اُٹھا کر بھی دیکھا — ٹٹولنے کے انداز میں — وہ کیا جاننا چاہتی ہیں ؟

میں نے اُن کی آنکھوں کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا — آخر انہوں نے ہی زبان کھولی — "کیا آپ وبھا کے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں ؟"

اتنے غیر متوقع سوال نے مجھے حیران کر دیا۔ کچھ لمحوں تک میں کوئی جواب نہ دے سکا — سوچتا رہا، شاید وبھا ہی نے اُسے میرے بارے میں کچھ کہہ دیا ہو! پھر بھی میرے دل میں ایک خوشی کی لہر پیدا ہو گئی۔

میں نے کہا — "یہ تاثر کس نے آپ کو دیا ہے؟ کیا وبھا نے ؟"

"نہیں — اُس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا — صرف اتنا بتایا کہ آپ اُسی کمپنی میں بہت بڑے افسر ہیں جہاں سوشیل کی سروس تھی — آپ کے عہدے کے بارے میں اُس کے بھائی بھی کچھ کہہ رہے تھے —"

اپنے بہت بڑے افسر ہونے کی بات سُن کر میں ہنس پڑا۔ کہا — "اُس کمپنی میں میں ایک معمولی لائن افسر ہوں — لیکن آپ کے من میں یہ سوال اٹھا کیسے کہ میں وبھا کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں !"

"یوں ہی، میں نے کچھ گیس کر لیا — کیا یہ ٹھیک نہیں ہے ؟"

"آپ کے گیس ورک کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ پھر بھی اگر میں اس بارے میں کچھ سوچوں تو آپ اسے پسند کریں گے ؟"

وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو گئی — اُس وقت مجھے اُس کے سارے روّیے اُسی کشمکش ہی کا نتیجہ معلوم ہوئے — ڈاکٹر اقبال سنگھ کے چہرے پر بھی اسی کشمکش کی جھلک موجود تھی۔ جسے میں سمجھ نہیں سکا تھا۔

بلونت کور نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا — "ہم لوگ آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ ڈاکٹر صاحب ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے — اُن کے سوبھاؤ کو میں جانتی ہوں — آپ کو شاید وبھا کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔ یہ مجھے تو ایسا ہی لگا ۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی — میری طرف پھر ویسی ہی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اُس نے دیکھا۔

میرے اندر ایک طوفان سا مچ گیا۔ وہ آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ اُس نے اپنے آپ ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں وبھا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ لوگ مجھے وبھا کے بارے میں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے — کس قسم کے دھوکے میں؟ وبھا کو ہوا کیا ہے؟ اُس میں کمی کونسی ہے؟

سوائے اس بات کے کہ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی —— وہ پھر سے اپنی زندگی شروع کرسکتی تھی۔ اس کا اُسے پورا حق تھا۔

"آپ کچھ بتائیے تو! میں پہیلیاں بوجھنے کے معاملے میں خاصا کندذہن ہوں"، میں نے یہ کہہ کر ہنسنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اُن لمحوں میں مجھ پر حیرت زیادہ غالب تھی۔

بلونت کور نے سنٹی کو گود سے اُتار کر دھیرے سے دیوان پر لٹا دیا —— وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ بلونت کور نے اُسے ایک کمبل بھی اوڑھا دیا —— پھر وہ میرے سامنے بیٹھ کر بولی —— "بھائے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ وہ سمجھ سے کام لیتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا —— سوشیل کی جان بھی نہیں جاتی —— وہ بے چارا تو بے موت ہی مارا گیا۔ کتنا اچھا تھا وہ! کیسے بتاؤں؟ پڑھا لکھا، کلچرڈ، ایک معقول تنخواہ پانے والا —— اور وبھا سے بھی بے حد پیار کرنے والا —— میں کہہ سکتی ہوں، ایسے پتی کو کھوکر اُس کی بیوی بدنصیب ہی کہی جائے گی —— اور نہیں تو کیا؟ پر اُس کی عقل پر تو پتھر پڑ گئے تھے —— اور کیا کہوں میں؟ اُس نے سہگل کے ساتھ مل کر اپنے بے قصور مرد کی جان لے لی۔ جو اس پر بے حد جان چھڑکتا تھا —— یہ بات سب ہی لوگ کہتے ہیں —— خیریت ہوئی کہ معاملہ پولیس تک نہیں پہنچا۔ سوشیل کا داہ سنسکار، آخری رسمیں بہت جلدی میں کر دی گئیں —— اور اُس میں بھی سوشیل کے بھائیوں کی ہوشیاری کام آئی —— وہ نہیں چاہتے تھے کہ سوشیل کا پوسٹ مارٹم کرا کے اُس کا مُردہ خراب کرائیں —— اس کے علاوہ خاندان کی جو بدنامی ہوتی وہ الگ! وبھا اور سہگل دونوں کو پھانسی لگ جاتی۔ لوگ ابھی تک یہی کہتے پھرتے ہیں ——"

یہ سب سُن کر مجھ پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا۔ بلونت کور اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔ میں اُس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر جھوٹ بولنے والی حاسد بھابھیوں کا سا جوش نہیں تھا۔ جو کچھ اُس نے بیان کیا تھا اُس کے پیچھے مجھے بدظن کرنے کا بھی کوئی جذبہ موجود نہیں تھا —— اُس کا لہجہ بہت ہی معصوم اور سادا تھا بے حد صاف اور نکھرا نکھرا اور بالکل سچا! اُس کی پرکشش گمراہ فردہ شخصیت کے عین مطابق۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولیں

اُس کے بعد وبھا کو اُس کی سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا۔ تن کے تین ہی کپڑوں میں۔ حالانکہ وہ گربھ وتی تھی۔ آٹھویں مہینے میں —— لیکن اب وہ اُسے رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وبھا کی وجہ سے ہمیں بھی بہت پریشانی اُٹھانی پڑی۔ ایک بدنام شادی شدہ بیٹی کے مائیکے واپس آ جانے پر بدنامی تو بڑھتی ہی ہے نا! لیکن اُسے جگہ کیسے نہ دیتے! یہاں سے بھی دھکّے دے کر نہیں نکال سکتے تھے۔ وہ کہاں جاتی اس حالت میں جب بچہ پیدا ہوا تو اُسے اسپتال سے سیدھے ہم یہاں لے آئے۔ تاکہ سینٹی کو کبھی معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اُس کی اصلی ماں کوئی اور تھی۔ ہم نے ہی وبھا کو یہاں آنے سے منع کر رکھا تھا لیکن کل وہ اچانک آپ کے ساتھ چلی آئی۔ رات کو ڈاکٹر صاحب نے اُسے بہت ڈانٹا —— اُن کا غصہ بہت تیز ہے۔ اُنہیں آپ کا خیال آ گیا —— ورنہ وبھا کو گھر میں گھسنے نہیں دیتے وہ —— سچ کہتی ہوں —— اُن کا دل بہت

سخت ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر اُسے پھٹکار سُنانے لگتے ہیں ۔۔ میں ہی ہاتھ پیر جوڑ کر کسی طرح اُنہیں سمجھا لیتی ہوں۔ بے چاری وبھا پر بڑی دیا آجاتی ہے۔ اگرچہ ہم اُس کا قصور کسی طرح معاف نہیں کر سکتے۔ میرے بجائے کوئی اور اُس کی بھابھی ہوتی تو وہ اُس پر ذرا سا بھی رحم نہیں کھاتی۔ اگر ڈاکٹر صاحب وبھا کا گلا ہی دبا دینا چاہتے تو وہ انہیں کبھی نہ روکتی۔"

میں اُسی طرح ہکا بکا بیٹھا ہوا تھا ۔۔ یہ یقین کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا کہ وہ سب حقیقت ہوگی ۔۔ اور حقیقت بھی کتنی کڑوی! میں نے بلونت کور کو کوئی جواب نہ دیا۔ بس اُس کی طرف تکتا رہا اور سوچتا رہا ۔۔ شکل وصورت سے وہ بہت ہی نیک معلوم ہوتی ہے ۔۔ کافی تعلیم یافتہ بھی ہے۔ اُس نے اپنے سسرال میں موجود اتنی تکلیف اُٹھائی ، بُرائی پر سے اتنی آسانی سے پردہ کیوں اُٹھا دیا ہے؟ اور یہ سب سننا میرے لئے کتنا عجیب ہوگیا ہے۔ بھابھی اور نند میں آپسی حسد کی روایت بھی ہمارے سماج میں بہت پُرانی ہے۔ لیکن مسز اقبال سنگھ کے مہذب رویوں کو دیکھتے ہوئے ایسے حسد کے لئے کوئی ٹھوس منطق سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ کیونکہ وہ وبھا کے بچے کے ساتھ ایک سگی ماں جیسا سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔

میں بڑی الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ کیا جواب دوں؟ کاش یہ سب میں نے نہیں سنا ہوتا! کاش یہ سب نہیں ہوا ہوتا! آخر میں نے بہت سوچ سوچ کر پوچھا ۔۔

"وہ سہگل کون تھا؟"

مسز بلونت کور نے بڑی نفرت سے کہا ۔۔ "مُوا چنڈی گڑھ ہی میں ایک بنک میں اکاؤنٹنٹ تھا ۔۔ دونوں نے چوری چھپے خوب گلچھرے اُڑائے ۔۔ لیکن سُنا ہے سوشیل کے سورگ باش ہو جانے کے بعد سہگل نے وبھا کو منہ تک نہیں لگایا ۔۔ اُس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ پہلے وہی اُسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا رہتا تھا۔ وبھا اور سوشیل کو کبھی شملہ گھما لاتا کبھی کلو اور منالی۔ اُس سے ناراض ہو کر ہی وبھا اب چنڈی گڑھ نہیں جانا چاہتی۔ جبکہ آپ اُسے وہاں سروس دلانے کی آفر دے چکے ہیں۔"

میں نے کہا ۔۔ "سروس تو اُسے کہیں اور جگہ بھی دی جا سکتی ہے ۔۔ لیکن وہ قبول بھی تو کرے! میں نے اُسے دہلی کا آفر بھی دیدیا ہے۔ وہاں بھی ہمارا ریجنل آفس ہے۔"

"نا بابا نا ۔۔!" مسز اقبال سنگھ نے تڑ سے جواب دیا۔

"ہم اُسے دہلی میں سروس نہیں کرنے دیں گے ۔۔ وہاں جہاں پاپا رہتے ہیں ہماری بڑی بدنامی ہو چکی ہے ۔۔ ہمارے جان پہچان کے لوگوں تک ساری باتیں پہنچ چکی ہیں۔"

وہ میری طرف ٹھنڈے سکوت کے ساتھ دیکھنے لگی۔ اُسی ٹھنڈے سکوت کے ساتھ جو میں کل سے اُن کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اُس کشمکش سے آزاد تھی جس میں، میں مبتلا تھا۔ وہ میرے ردِّ عمل کی منتظر تھی۔ میں اُس کی باتیں سُن کر وبھا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہوں۔ لیکن میرے ذہن

میں اُن واقعات کی ایک واضح تصویر نہیں بن رہی تھی۔ مسز اقبال سنگھ نے جو کچھ کہا تھا وہ سب سُنی سُنائی باتوں پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔

اسی لئے میں نے وضاحت چاہی ''آپ نے یہ سب کہاں سے سُنا ہے؟ یہیں مالیر کوٹلہ میں بیٹھ کر یا دہلی میں!''

وہ بولی ـــــ ''میں خود چنڈی گڑھ گئی تھی۔ جب سوشیل کا سورگ باش ہوا تھا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی گئے تھے ـــــ وہ تو دوسرے ہی دن لوٹ آئے تھے پر میں وہاں ہفتہ بھر تک رہتی رہی تھی۔ سوشیل کی مرتیو کے دوسرے ہی دن سے میرے کانوں میں اسی قسم کی باتیں پڑنے لگی تھیں ـــــ وہاں افسوس کرنے کے لئے جتنی عورتیں آتی تھیں سب ہی کی زبان پر یہی قصّہ ہوتا تھا ـــــ وبھا اور سہگل کا ـــــ وہ سب سُن سُن کر میرا تو شرم کے مارے سر جھک جاتا تھا۔ یہ ہماری بڑی بے عزّتی تھی۔ آپ خود سوچئے، کوئی اپنے کسی رشتے دار کے بارے میں ایسی باتیں سُننا کہاں تک برداشت کر سکتا ہے؟''

میں نے پھر ایک سوال کیا۔ ''کیا آپ کو ان سب باتوں پر یقین آجاتا تھا؟''

یہ سُن کر بلونت کور نے میری طرف تعجّب سے دیکھا ـــ جیسے کہنا چاہتی ہو، آپ کتنے احمق ہیں، اُن پر یقین نہ کرنے کی ـــ وجہ ہی کونسی ہو سکتی تھی!

لیکن اُس نے کچھ سوچ کر جواب دیا ـــــ ''وبھا کی ایک پڑوسن تو یہاں تک بتاتی تھی کہ سوشیل کے آفس جاتے ہی وبھا چپکے سے سہگل کے فلیٹ پر جا پہنچتی تھی۔ وہ اُن کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ بالکل اکیلا تھا اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر کی لڑکیوں اور جوان عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا لینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس معاملے میں وہ بڑا اُستاد تھا۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نوکری تو وہ اپنی سماجی حیثیت بنائے رکھنے کے لئے کرتا تھا۔ گھر کا بہت کھاتا پیتا تھا جس عورت کو وہ اپنے چنگل میں پھنسانا چاہتا اُسے پہلے تحفوں سے لاد دیتا ـــــ اپنے پاس فارن سے منگوا کر رکھے ہوئے چھوٹے بڑے تحفوں سے جن کی دلکشی پر کوئی بھی مر مٹ سکتا تھا ـــــ ڈیکوریشن اور کاسمیٹکس کے علاوہ وہ اپنے پاس ایسے ریشمین کپڑوں کے ڈھیر لگائے رہتا تھا جنہیں دوسرے ملکوں سے آسانی سے منگوانا آسان نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کے فوٹو کھینچ کر انہیں پیش کر دیتا ـــــ یہ بھی اُس کی خاص ہابی تھی ـــــ لیکن کچھ ایسے فوٹو جن سے وہ انہیں بلیک میل کر سکتا تھا، اپنے پاس رکھ لیتا تھا ـــــ اُس کے گھر میں میوزک کے بے شمار کیسٹ تھے۔ وی۔ سی۔ آر پر دکھائے جانے والے ویڈیو کیسٹ بھی ـــــ بے شمار فلموں کے، مشاعروں کے، کلچرل پروگراموں کے۔ کبھی کبھی وہ اچانک بلیو فلم بھی لگا دیتا تھا ـــــ ڈرگس کا استعمال بھی اُس کا ایک خاص ہتھیار تھا۔ وبھا اسی لالچ میں وہاں جاتی رہتی تھی۔ اڑوس پڑوس کے لڑکوں تک کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ گھر سے کس وقت نکلتی ہے ـــــ وہ اُس کی تاک میں رہنے لگے ـــــ اُن کے لئے یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ سیٹی بجانا، زور زور سے کھانسنا، آوازے کسنا اور ڈھیلہ بازی تک کرنا ـــــ وہ سہگل کے اندر سے بند پڑے دروازے پر نہ صرف پتھر پھینکتے تھے بلکہ اُنہوں نے تو ایک بار باہر سے تالا بھی ڈال

دیا تھا۔ کہتے ہیں بڑی ہو ہلا مچی تھی !"

مسز بلونت سنگھ کچھ لمحوں تک خاموش رہ کر بولی —— "ایک اور پڑوسن بتاتی تھی ۔ ہم عورتیں مردوں کے کام پر چلے جانے کے بعد عام طور پر سہ پہر ہوتے ہی اپنی اپنی چارپائی یا چوکی تھا پیڑھی گھسیٹ کر گلی میں ایک جگہ بیٹھ جاتی تھیں ۔ ہر کسی کے پاس سینے پرونے یا کاڑھنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام ہوتا سویٹر وغیرہ بُننا تو ہر کسی کو اچھا لگتا تھا۔ وبھا ہمارے سامنے سے کئی بار نکل کر سہگل کے گھر میں گئی تھی۔ لیکن وہ ہمارے پاس گھڑی بھر کے لئے بھی نہیں رُکتی تھی ۔ ہمارے ساتھ کلام تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی —— پتہ نہیں، خود کو کیا سمجھتی تھی، کوئی حور پری ! جیسے آسمان سے اُتر کر آئی ہو ! لیکن سوشیل کی آنکھوں پر کیوں پردہ پڑا ہوا تھا، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی —— یہ ساری بات میں انہی کی بتائی ہوئی سنا رہی ہوں۔ سمجھے نا ! اس میں اپنی طرف سے میں نے ایک شبد بھی نہیں جوڑا ہے ۔ گورو گرنتھ صاحب جی کی سوگند ھ !

اچانک دروازے پر دستک ہوئی —— مسز بلونت کور اُٹھ کر دروازے کی طرف چل دی۔ آنے والا ڈاکٹر نریش کمار تھا۔ اُس نے میرے ساتھ بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ میری خیریت پوچھی ۔ میں بھی اُس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اگرچہ میرے اندر بے حد تناؤ تھا۔ بڑا ٹینشن تھا۔ اس پر میں بڑی کوشش سے قابو پائے ہوئے تھا۔

مسز اقبال سنگھ نے تو جیسے اپنی کشمکش سے نجات پالی تھی ۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان کی جھلک تھی ۔ اپنا دکھ دوسرے کو منتقل کر دینے سے یہی ہوتا ہے —— لیکن وہ مسرور ہرگز نہیں نظر آرہی تھی ۔

اُس نے کہا —— "آپ لوگ بیٹھئے —— میں ناشتہ بنا کر لے آتی ہوں۔ نریش جی بھی آپ کو بہت کچھ بتا سکتے ہیں —— چنڈی گڑھ میں رہتے ہیں نا !"

یہ کہہ کر وہ تو کچن کی طرف چل دی —— ہم دونوں کو ایک حیرت میں مبتلا کر گئی —— ڈاکٹر نریش کمار نے میری طرف چونک کر دیکھا —— اُسے معلوم نہیں تھا ہم کون سے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے —— لیکن میں نے اُسے زیادہ دیر تک حیرانی کی کیفیت میں نہ رکھا اور کھانس کر گلا صاف کر کے کہا ۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ مجھے سہگل کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے ؟ وہ چنڈی گڑھ کے کسی بنک میں اکاؤنٹنٹ تھا !"

سہگل کا ذکر سنتے ہی اُس کی آنکھوں کی چمک جیسے ماند پڑ گئی —— اُس کے چہرے کا تناؤ اور گہرا ہو گیا وہ کچھ لمحوں تک میری طرف خاموش نظروں سے دیکھتا رہا —— یہ تو صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سہگل کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا —— اُس نے سگریٹ سلگا کر کہا ——

"یہ اچھا ہوا کہ بلونت بھابھی نے آپ کو ان کے بارے میں بتا دیا۔ انہیں بتا ہی دینا چاہیے تھا۔ ان سے میں یہی توقع رکھتا تھا ـــــ وہ بہت ہی سمجھ دار خاتون ہیں ـــــ اچھا ہوتا وہ خود ہی آپ کو سہگل کے بارے میں بھی بتا دیتیں ـــــ! مجھے اس مشکل میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی ـــــ کیا وہ نہیں جانتیں کہ سہگل کا ذکر ہی میرے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے! لیکن خیر ـــــ سنیئے جب یہ مجھ ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے تو میں آپ کو سب کچھ بتائے دیتا ہوں ـــــ"

وہ کچھ لمحوں تک خاموش رہ کر بولے ـــــ "کسی خوبرو آدمی کو اگر آستین کا سانپ کہا جائے تو لوگ عام طور پر یقین نہیں کرتے ـــــ کیونکہ اُن کی ہمدردیاں ایک خوبصورت آدمی کے ساتھ زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے ـــــ لیکن وہ سچ مچ آستین کا سانپ تھا ـــــ محبت کرنے والے دوست کے لئے بغلی چھُری! انسان کے بھیس میں شیطان! اُسے پہلی نظر میں کوئی بھی ایسا سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی واقع ہوا ہے ـــــ وہ پڑھا لکھا اور مہذب بھی ہے۔ آپ اُس سے ملیں گے تو فوراً اُس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ اُس کے قریب ہونے پر فخر محسوس کریں گے۔ لیکن وہی شخص اندر سے کتنا خطرناک اور کمینہ ہو سکتا ہے۔ اور کتنا بڑا اڑی یا پچ، اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا ـــــ خیر، اب تو وہ پوری طرح ایکسپوز ہو چکا ہے ـــــ اُس کے بارے میں سب جان گئے ہیں۔ دوسرے چاہے اُسے معاف کریں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا ـــــ وبھا کے ساتھ اُس کے تعلقات جیسے بھی رہے ہوں مجھے اُس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے ـــــ کیونکہ میں نے انہیں کبھی ساتھ ساتھ نہیں دیکھا ہے ـــــ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ لوگوں کی ہی زبانی سُنا ہوا ہے۔ لیکن اس پر میں اس لئے یقین کر سکتا ہوں کہ اُسی کی وجہ سے میں نے بھی ایک صدمہ اٹھایا ہے ـــــ سوشیل تو کائر تھا ـــــ سوسائٹی کا ورڈ! سماج سے خوف کھانے والا۔ اُس نے اپنے آپ کو خود مار ڈالا ـــــ وہ وبھا کو سمجھا بجھا کر سہگل سے دُور بھی لے جا سکتا تھا ـــــ سہگل کو ہی سب کے سامنے ذلیل و خوار کرتا۔ اُس کا اصلی چہرہ سب کو دکھا دیتا ـــــ کیونکہ وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔ لیکن اُس بے چارے نے کچھ بھی نہ کیا ـــــ شاید اُس کے لئے ایسا کرنا ممکن تھا بھی نہیں ـــــ وہ بہت ہی کمزور دل ثابت ہوا ـــــ اُس سے یہ صدمہ برداشت ہی نہیں کیا جا سکا کہ اُس کی بیوی کسی اور شخص سے محبت کرتی ہے ـــــ اُس کے اپنے ہی ایک قابل اعتماد دوست سے! جب اُسے یقین ہو گیا تو اُس نے چپکے سے جان دیدی ـــــ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، وبھا اور سہگل نے مل کر اُس کی جان لے لی۔ یعنی اُسے کچھ کھلا پلا دیا گیا۔ مجھے یقین نہیں ہوتا ـــــ میں سوشیل کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ وہ بہت سیدھا اور سادہ مزاج آدمی تھا ـــــ سچّے دل سے محبت کرنے والا ـــــ ہر شخص پر فوراً اعتبار کر لینے والا ـــــ وہ کسی سے انتقام لینے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اس قسم کے مردوں میں سے نہیں تھا ـــــ وہ دوسری طرح کا انسان تھا ـــــ وہ ایسے

شریف النسانوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا جو بڑا بھاری صدمہ آ پڑنے پر اپنی ہی جان دیدیتے ہیں - وہ بھی اپنی ہی جان لے سکتا تھا - یہ اُس نے چپکے سے کر دکھایا ــــ نہ زہر کھایا نہ خود کو گولی ماری ــ بس اپنے دل کو ایک پہاڑ جیسے بوجھ تلے دبا دیا - اسے آپ ہارٹ اٹیک بھی کہہ سکتے ہیں !"

وہ اتنی لمبی گفتگو کر چکنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا - جیسے سانس لینے کے لئے رُک گیا ہو ــ ایک اور سگریٹ بڑے اطمینان سے سُلگائی ــــ اور پھر بولنے کے لئے تیار ہو گیا -

"اب میں آپ کو اپنا ایک قصّہ سُناتا ہوں - جو مجھ پر بیتی ہے ــ میری ایک اسٹوڈنٹ تھی ــ ہرجیت کور ــ میرے جگری دوست ڈاکٹر رام سنگھ کی بیٹی ــــ وہ میری بہت ہی ذہین اسٹوڈنٹ تھی ــ اُسے میں نے یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر پڑھایا تھا - ایم اے پارٹ ون میں اُس کے بہت اچھے نمبر آئے تھے ــ مجھے یقین تھا اور اُسے بھی کہ وہ فائینل میں گڈ سیکنڈ کلاس تو ضرور لے جائے گی - اُس کے لئے میں نے ایک لڑکا بھی دیکھ رکھا تھا - رام سنگھ نے مجھے اُس کا مستقبل سنوارنے کا پورا اختیار دے رکھا تھا - کہتا تھا، تمہاری بیٹی ہے ــ اس پر تمہیں پورا اختیار ہے ــ وہ لڑکا فیروز پور کے ایک کالج میں سائیکالوجی پڑھاتا تھا - بات پکّی ہو چکی تھی ــ ہرجیت کے لئے ہر طرح سے میچنگ تھا ــ لیکن پتہ نہیں یہ کیسے ہوا کہ ہرجیت کو کسی نے سہگل سے ملوا دیا - یقیناً اس کی کسی سہیلی نے ایسا کیا ہوگا - مجھے آج تک اُس کا نام نہیں معلوم ہو سکا ــ شاید ہرجیت کا بھی اُسی بنک میں اکاؤنٹ تھا - جہاں سہگل کام کرتا تھا ــ وہ اُس سے ملتے ہی اُس کی دلکشی میں کھو گئی - اپنے منگیتر پورندر سنگھ گھمن کو بھول گئی ــــ سہگل کے بارے میں تو یہ سب جانتے تھے کہ وہ ایک نمبر کا لیڈیز کلر ہے ! بھولی بھالی لڑکیوں کو فوراً اپنے بس میں کر لیتا ہے ــ جب اُنہیں وہ ڈرگس کا چسکا لگا دیتا ہے تو پھر وہ اُسے آسانی سے نہیں چھوڑتیں ــــ اپنی بربادی کا اُنہیں بہت دیر بعد احساس ہوتا ــ جب وہ اپنا سب کچھ کھو چکی ہوتی تھیں ــــ ہرجیت کو بھی بہت دیر بعد اس کا احساس ہوا - جو کچھ وہ اسے دے چکی تھی اُسے اب واپس لینا ناممکن تھا - جو کچھ اُس سے اُس نے لیا تھا اُس کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرنا بھی اُس کے لئے تکلیف دہ تھا - ایک روز وہ اچانک اپنے مینٹل کرائسیس میں پھنس گئی ــ سخت پریشانی کے لمحے میں ــ اُس نے خود کو جلا ڈالا ــ کپڑوں پر پیٹرول چھڑک کر اپنی ہی نادانیوں کی آگ میں خود کو بھسم کر ڈالا ــــ یہ تھا میری سب سے انٹیلی جنٹ اسٹوڈنٹ کا انجام ! جس پر نہ معلوم کیوں پردہ ڈال دیا گیا - جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو - اُس کے ماں باپ نے اچانک چُپی سادھ لی ــ بالکل گونگے ہو گئے - جیسے انہوں نے اس بیٹی کو جنم ہی نہیں دیا ہو ــ اس کی کبھی پرورش ہی نہ کی ہو ــــ دراصل انہوں نے

پنجاب کو ایک بھیانک فرقہ وارانہ فساد کی لپیٹ میں آنے سے بچالیا تھا۔ جو پہلے ہی جنگجوؤں کی وجہ سے دہشت میں مبتلا ہے۔ رام سنگھ نے مجھ سے کبھی شکایت نہیں کی کہ میں اُن کی بیٹی کو جسے وہ میری ہی بیٹی کہتے تھے گمراہ ہونے سے کیوں نہ بچا سکا میں نے اُس پر سخت کڑی نظر کیوں نہ رکھی؟ اُس "ڈی باچ" اور سنگدل سہگل کو اس بات کا ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا کہ اُس نے اپنے صوبے کی کتنی حسین اور ذہین لڑکی کو چپ چاپ موت کی گود میں سو جانے پر مجبور کر دیا۔ اُس کی زندگی کا سب سے بیش قیمت زیور چھین کر، اُس کا سب کچھ لوٹ کر، اُس کا سب سے بڑا فخر چھین کر جسے شادی ہونے تک محفوظ رکھنا ہماری بیٹیاں اپنا دھرم سمجھتی ہیں! اپنا دھرم اور آدرش! ہرجیت نے سمجھ لیا ہوگا اب وہ ایک آدرش لڑکی نہیں رہ گئی ہے ـــ اس فخر سے وہ محروم ہو چکی ہے۔ شاید اسی لئے اُس نے مرجانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

ڈاکٹر نریش اپنی جگہ سے اُٹھ کر کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلا کیا۔ جیسے وہ اندر سے بے حد مضطرب ہو۔ سخت بے چین ہو۔ پھر وہ کرسی کی پُشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا ـــ ذرا جھک کر بولا ـــ اس حادثے کے اسباب کی بھنک کسی ذریعے سے پوندر سنگھ گھمن کو بھی لگ گئی تھی۔ ہرجیت کور کے منگیتر کو۔ اُس کے غصّے کی انتہا نہ رہی ـــ ایک دن اچانک پستول لے کر سہگل کے گھر پہنچ گیا ـــ لیکن وہ اُسے نہیں ملا تو اُس کے گھر میں پرزہ ڈال گیا ـــ تیری موت میرے ہاتھوں سے لکھی جا چکی ہے۔ جس دن مل گیا تجھے مار کر کتّوں کے آگے ڈال دوں گا۔ اُس کے بعد اُس نے کالج سے استعفیٰ دیدیا ہے ـــ اور دہشت پسندوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ اب سہگل کو ہر وقت جان کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھ ہر وقت ایک مسلح باڈی گارڈ بھی رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں گھمن اُس کی جان لے کر ٹھیک ہی کرے گا ـــ اس خبر سے مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا ـــ بلکہ مجھے بڑا اطمینان ملے گا کہ ایک شیطان کو دنیا سے اُٹھا دیا گیا۔

یہ کہتے کہتے ڈاکٹر نریش کمار کی آنکھیں نمناک ہو گئیں ـــ اُس کی آواز بھی بھرّا گئی ـــ اُسی وقت مسز اقبال سنگھ بھی کچن میں سے باہر نکل آئی۔ وہ میری طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ جاننے کے لئے کہ میں نے ڈاکٹر نریش کمار کی باتوں سے کیا تاثر قبول کیا ہے! اور اب میں وبھا کے بارے میں کونسا فیصلہ کرتا ہوں ـــ!

وہاں بیٹھے ہوئے مجھے بالکونی اور کمروں کے درمیان وبھا کی جھلک دکھائی دے گئی۔ وہ باتھ روم سے نہا دھو کر اور شاید کچھ کپڑے بھی دھو کر باہر نکلی تھی۔ دھوئے ہوئے کپڑوں کو بالکونی میں دیواروں کے آرپار لگے ہوئے پلاسٹک کے تاروں پر پھیلا رہی تھی۔ کچھ مردانی قمیضیں جو یقیناً اُس کے بھائی کی ہوں گی، کچھ شلواریں اور دوپٹے جو اُس کی بھابھی کے ہی ہو سکتے تھے اور سنٹی کے بھی فراک اور نیکریں اور اُس کی چھوٹی چھوٹی بنیانیں ـــ

نہا دھو کر وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی ـــ اُس کے بھیگے ہوئے لمبے لمبے بال اُس

کی پیٹھ پر جھول رہے تھے ۔ میں اُس کی طرف دیکھتا سا رہ گیا۔ اُسے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک درد سا بھی محسوس کیا۔ جیسے کوئی چیز اچانک ٹوٹ گئی ہو۔ میرے روم روم میں چبھ رہی ہو ۔ میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن میں اپنے اضطراب کو چھپائے ہوئے بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر وبھا کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جو بالکونی میں دھوپ کے رُخ پر کھڑی تولیے سے اپنے بھیگے ہوئے بال جھٹک رہی تھی۔

پھر اچانک وہ ہماری طرف آنے کے لئے چل پڑی ـــــ بڑے شکوہ سے چلتی ہوئی آئی ـــ جسے دیکھ کر دل کو دھڑکنے سے روکنا مشکل ہو گیا۔ اُسے دیکھ کر وشواس نہیں ہوتا تھا کہ اُس جیسی حسین اور اتنی پُرسکون عورت اپنے کاندھوں پر اتنے بڑے اذیت بھرے ماضی کا بوجھ اُٹھائے ہوئے بھی اس قدر دلاویزی اور شکوہ کے ساتھ چل پھر سکتی ہے! وبھا کو دیکھ کر تو پل بھر کے لئے بھی اس طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اُس نے مجھے دُور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور بولی ـــــــــ

"آپ آ گئے!"

مجھے دیکھکر وہ واقعی خوش نظر آئی ـــ لیکن اُس کی خوشی میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر جو ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی وہ فوراً غائب بھی ہو گئی۔ خلا میں ٹوٹ کر کسی ستارے کی گم ہوتی ہوئی روشنی کی طرح ـــــ شاید وہ مسکرانا چاہتی ہی نہیں تھی ـــــ یہ بے اختیاراً اپنے آپ اُبھر آئی تھی ـــــ اُس کے اندر کہیں کسی کونے میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ ایک عرصے سے نہیں مسکرائی تھی۔ کھل کر نہیں ہنسی تھی۔ وہ ایک ایسے لمحے کی منتظر تھی جو اچانک اُسے اپنی گرفت میں لے لے ۔ اس کا سارا خوف دُور کر دے۔ یہی ہنس پڑنے کا خوف!

وبھا نے ڈاکٹر نریش کمار کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اُسی وقت اُس کی بھابھی نے ہم سب کو ڈائننگ روم میں بلا لیا۔ وہاں ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے لئے بہت کچھ پروس دیا گیا تھا۔ آملیٹ، پراٹھے، سوجی کا بھاپ دیتا ہوا خوشبودار حلوہ اور بہت سے پھل۔ لیکن میرا من کھاتے سے اُچاٹ سا ہو گیا تھا۔ مسز اقبال سنگھ کے اصرار پر میں نے تھوڑا بہت منہ مار لیا ـــ ہم سب بڑی خاموشی سے میز کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا ہماری باتیں اچانک ختم ہو گئی ہیں۔ اب کہنے سُننے کو کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

ناشتہ ختم کر کے ہم سب میز پر سے اُٹھ گئے۔ وبھا اور مسز اقبال سنگھ نے جلدی جلدی برتن سمیٹ لئے۔ اُس کے بعد میں نے وہاں سے جانے کی اجازت چاہی۔ اور وبھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"چلیئے گا، میرے ساتھ!"

وبھا نے اپنی بھابھی کی طرف دیکھا۔ بلونت کور نے اُس سے کچھ نہ کہا ـــ لیکن دونوں نے

نگاہوں ہی نگاہوں میں سوال جواب کر لئے تھے۔ دراصل وبھا ہم تینوں کی بدلی ہوئی نظروں کے درمیان اکیلی رہ گئی تھی۔ پھر بھی اُس نے سنبھل کر کہا ــــ "جی، ابھی چلتی ہوں۔ صرف پانچ منٹ اور دے دیجیے"
یہ کہہ کر اُس نے جلدی جلدی اپنا اٹیچی بند کیا ــ پھر اپنے بچّے کی طرف بڑھ گئی جو ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وبھا نے جھک کر اُس کے گال پہ بوسہ دیا ــ اُسے کچھ لمحوں تک دیکھتی رہی ــ پھر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

میں سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہا تھا ــ میرے پیچھے وبھا تھی اور اُس کے پیچھے ڈاکٹر نریش کمار اور مسز اقبال سنگھ۔ نیچے سڑک پر آ کر میں نے کلنک کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ڈاکٹر اقبال سنگھ مجھے دیکھتے ہی مریضوں کو چھوڑ کر باہر آ گئے ـ میری گاڑی تک۔ جو اُن کے کلنک کے سامنے کھڑی تھی۔

بازار میں بیشتر دکانیں کھلی ہوئی تھیں ــــ اگرچہ پٹیالہ کے واقعے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے کچھ سیاسی جماعتوں نے پنجاب بند کا نعرہ دیا تھا۔ لیکن دہشت پسندوں کے کئی گروہوں نے ہڑتال کرنے والوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے دکانیں بند رکھیں تو اُن کی دکانوں کو آگ لگا دی جائے گی ــــ اسی لئے دکانیں بھی کھلی تھیں اور لوگ بھی حسبِ معمول آ جا رہے تھے۔

اچانک ڈاکٹر اقبال سنگھ کے کلنک کے سامنے ایک پینٹر کی دکان پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ ایک سکھ دیہاتی نے جو اپنی سائیکل کے پیچھے گھاس کا ایک گٹھڑ باندھ کر لایا تھا۔ اپنی سائیکل ہری کیرت سنگھ پینٹر کی دکان کے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ اُس پر ہری کیرت سنگھ نے اعتراض کیا اور کہا کہ وہ سائیکل ذرا ایک طرف ہٹا کر کھڑی کرے ــــــ دیہاتی سکھ اُس کے ساتھ گالی گلوچ کر کے وہاں سے بھاگ گیا لیکن سائیکل وہیں چھوڑ گیا ــــ اس پہ ہری کیرت سنگھ نے شور مچا دیا۔

"اس گھاس کے اندر۔۔ بم چھپا کر رکھا گیا ہے۔ سب لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ یہاں سے ہٹ جائیں۔۔"

یہ کہہ کر اُس نے سائیکل کو وہاں سے ہٹا کر ایک بند دکان کی طرف زور سے دھکیل دیا۔ اور اُسی لمحے زور سے ایک دھماکہ ہوا۔ گھاس کے گٹھڑ میں واقعی ایک بم چھپا کر رکھا گیا تھا جس کے پھٹتے ہی سردار ہری کیرت سنگھ پینٹر کے پرخچے اُڑ گئے۔ کچھ اور لوگ بھی زخمی ہو گئے ہر طرف بھگدڑ اور ہاہا کار مچ گئی۔ میں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر وبھا کو بھیڑ میں کچلے جانے سے بچانے کے لئے کار کے اندر دھکا دے دیا۔

پندرہ ۱۵

جب کہ ہم مالیر کوٹلہ سے روانہ ہوئے تھے۔ بازار میں افراتفری کا عالم تھا۔ پولیس کی گاڑیاں ایک کے بعد ایک بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر اقبال سنگھ کو جلدی جلدی اپنا کلنک بند کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مسز بلونت کور اور ڈاکٹر نریش کمار اوپر فلیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے بالکونی میں سے اصلاح انداز میں اپنے اپنے ہاتھ لہرائے تھے اور اشارا کیا تھا کہ میں اب وہاں سے نکل جانے میں دیر نہ لگاؤں۔

یہ کیسا ماحول تھا، یہ کیسا موقعہ تھا کہ ہم چلتے وقت اُن کے ساتھ اطمینان سے دو آخری باتیں بھی نہیں کہہ سکے تھے۔

میں جلدی سے گاڑی شہر سے باہر نکال کرلے آیا۔ پٹیالہ اور انبالہ ہوتی ہوئی دہلی جانے والی سڑک پر — اُسی سڑک پر جس پر سے ہو کر آتے ہوئے میں کئی طرح کی جذباتی کیفیتوں میں سے گذرا تھا۔ گذرے ہوئے سمے کا ایک ایک لمحہ مجھے یاد تھا۔ کوئی لمحہ بور نہیں ثابت ہوا تھا اگرچہ بعض لمحے بے حد تناؤ بھرے تھے۔ میں نے اُس کے ساتھ کتنی باتیں کی تھیں، اُسے کیسے کیسے بولنے پر مجبور کر لیا تھا۔ لیکن اب میں اُس سے کچھ نہیں کہہ پا رہا ہوں۔ اب میرے ذہن میں ایک دوسرا تناؤ ہے۔ مجھ پر پشیمانیوں کے بادل اچانک اُتر آئے ہیں۔ اب اُس سے کچھ کہنے سُننے کی ضرورت ہی کیا ہے — ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جینے کی پوری آزادی حاصل ہے — وہ بھی اگر چنڈی گڑھ میں سروس کرنا چاہتی ہے تو وہیں کرے۔ ورنہ وہ جہاں جانا چاہے جا سکتی ہے۔ اُس کے لئے میں کسی دوسرے شہر کیلئے کی اپنے آپ کیوں سفارش کرتا پھروں؟ وہ اگر مجبور کرے گی تو کر دوں گا۔ لیکن ابھی تو

یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ سروس کرنے کی خواہشمند ہے بھی کہ نہیں۔ سروس تو وہ کہیں نہ کہیں ضرور کرے گی ۔ اُسے اس طرح کون گھر پر بٹھا کر کھلاتا رہے گا، آج اُس کا باپ موجود ہے۔ کل وہ نہیں رہے گا۔ بوڑھے آدمی کی زندگی کا کیا بھروسا! پھر تو وہ بالکل بے سہارا ہو کر رہ جائے گی۔! اُس کے بھائی اور بھابھی تو اُس کی مدد کرنے سے رہے!

میں من ہی من میں اس بات کے لئے کُڑھنے لگا کہ وبھا کے بارے میں وہ سب کیوں کہا گیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں اس کا جو امیج بنا رکھا تھا وہ ویسے کا ویسا رہنا چاہیے تھا ۔ میں کافی تیز رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ میں جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتا تھا ۔ کبھی کبھی گاڑی کی رفتار کم کردینی پڑتی تو میں ایسا کر تو لیتا تھا مگر اُس وقت میرے اندر غصّہ بھی بھر جاتا تھا۔

میرے اندر غصّہ دراصل کئی باتوں کی وجہ سے بھرا ہوا تھا۔ جو کچھ پٹیالہ اور مالیر کوٹلہ میں دہشت پسند کر چکے تھے اور جو کچھ بلونت کور اور ڈاکٹر نریش کمار وبھا کے بارے میں مجھ سے کہتے رہے تھے۔ اور اب تک وبھا چونکہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔

میں نے اپنے غصّے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ وبھا کے بارے میں میرا فوری ردّعمل غلط ہوگا۔ مجھے توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ میرے اندر اچانک اُٹھی ہوئی جوار بھاٹا ٹھنڈی پڑ گئی۔ میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے گاڑی روک لی۔

وبھا پچھلی سیٹ پر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے ہوئے نیم دراز تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا ۔ ربن سے بندھے ہوئے اُس کے بال اُس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے ۔ مالیر کوٹلہ سے نکلنے کے بعد میں نے ابھی تک اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اُسے جس تیزی سے گاڑی کے اندر دھکا دے کر گرایا تھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور بھابھی کو آخری بار دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔ شاید اُس وقت وہ جس پہلو سے گاڑی کے اندر گری تھی اُسی انداز سے ابھی تک پڑی ہوئی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے کندھے سے چھُوا۔ اور پکارا ۔ "وبھا جی!"

وبھا نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس کا ماتھا ایک جگہ سُوج جا ہوا تھا ۔ سُوجی ہوئی جگہ نیلی ہو گئی تھی۔ مجھے یاد آیا، میں نے بم کا دھماکہ سُن کر اور لوگوں کو بڑی گھبراہٹ کے عالم میں ایک دوسرے کے اُوپر گرتے ہوئے دیکھا تھا تو میں نے اُسے دھکا دے کر گاڑی کے اندر دھکیل دیا تھا۔ شاید اُسی میں اُس کے ماتھے پر چوٹ لگ گئی تھی۔

میں نے اُس کے ماتھے پر چوٹ کے نشان کو دھیرے سے چھوا اور کہا ۔ "آئی ایم ساری! مجھے نہیں معلوم تھا! یہ سب میری وجہ سے ہوا ۔"

وہ سیدھی اُٹھ کر بیٹھ گئی تو میں نے اُسے باہر آجانے کے لئے کہا ـــــ آگے آجائیے ـــــ"

میں نے اُسے سہارا دے کر باہر نکالا اور پھر آگے کی سیٹ پر بٹھا دیا ـــــ میرے پاس ٹھنڈے پانی کی بوتل تھی۔ اُسے کھول کر اپنا رومال بھگویا اور اُسے اس کے اوپر رکھ دیا۔ چوٹ سے سوجی ہوئی جگہ پر۔ اس سے اُسے کچھ راحت مل گئی۔ اُس نے میری طرف شکر گزار آنکھوں سے دیکھا ـــــ مگر بولی کچھ نہیں۔ میں خود کو قصوروار سمجھ کر چپ تھا۔ کچھ اور کہنا مشکل لگا۔

میرے سامنے دُور دُور تک وہی گیہوں کے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ ہرے رنگ کے اُجلے پیراہن پہنے اور سروں پر پکی ہوئی سنہری بالیوں کی کلغیاں سجائے ہوئے۔ وہاں بلند قامت تنومند جاٹ اپنی کامیابی کی خوشی میں سرشار گاتے پھرتے تھے۔ فضا میں قلابازیاں کھاتی ہوئی رنگ برنگی چڑیاں غول در غول اُڑتی پھرتی تھیں۔ میں اُن کی کلکاریاں سُن رہا تھا۔ ان کلکاریوں میں ایک خاص موسیقی تھی، ایک خاص بندش اور ردھم بھی ـــــ ان چہچہاہٹوں کو سمجھنا یا اُن کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا مشکل نہیں ہوتا جب انہیں سننے والا خود بھی اُنہی کی طرح مسرور ہو! میں اُنہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ پل بھر میں بہت اونچائی پر پہنچ کر نیلے آکاش میں نظروں سے اوجھل ہو جاتیں پھر دوسرے ہی پل تیزی سے غوطہ لگا کر پیڑوں اور پودوں کے بالکل پاس آجاتیں۔ لمحہ بھر بیٹھ کر آسمان میں پھیرا لگانے کے لئے پھر اُڑ جاتی تھیں۔ اس طرح اُن کے گیت اُن کے پروں کے ساتھ ساتھ سرسراتے ہوئے سارے بن میں پھیل پھیل جاتے تھے۔ وہ غول در غول اُڑتی ہوئی ایک دوسرے کی صفوں میں سے ایک دوسرے سے ساتھ ٹکرائے بغیر گزر جاتی تھیں۔ یہ اُن کا محبوب کھیل تھا۔ لیکن میرے اندر کوئی تحریک نہیں پیدا کر رہا تھا۔ میں اُداسی کی حد تک پرسکوت تھا۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کہ اُن کی طرح میں بھی خوش کیوں نہیں ہوں؟ جب وہ میرے بہت قریب آکر میری کار کی چھت کو بالکل چھوتی ہوئی سی ڈوبتی اُبھرتی لہریں بنا کر نکلتیں تو میرا جی لپک کر انہیں پکڑ لینے کے لئے کیوں بے قرار نہیں ہو اُٹھتا؟ یا میں ایسی آرزو کیوں نہیں کر سکتا کہ آنکھیں بند کر کے اور بازو پھیلا کر اُڑتا ہوا اُن کے بیچ میں سے نکل نکل جاؤں!

میں بہت دیر تک وبھا کے ساتھ کوئی بات نہ کر سکا۔ دس پندرہ کلومیٹر تک گاڑی خاموشی کے تیز بہاؤ پر بہتی سی چلی گئی تھی۔ میں اُس کے ساتھ نظریں ملانے کی ہمت تک کھو بیٹھا تھا ـــــ اچانک وہ میرا بازو پکڑ کر بولی،

"ذرا گاڑی روک لیجیے۔!"

میں نے اُس کی آواز حیران ہو کر سُنی۔ جس میں خاصی تھرتھراہٹ تھی۔ لیکن میں اُس کی طرف سر گھما کر نہیں دیکھ سکا۔ میں اُس کی آنکھوں میں لہراتے ہوئے خدشوں کو دیکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ان خدشوں کا اندازہ مجھے اُس کی آواز سے ہی ہو گیا تھا۔ اُسی کی جانب نظریں اُٹھا کر دیکھنا واقعی مشکل لگا۔ مجھ سے گاڑی بھی نہیں روکی جا سکی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ گاڑی کیوں رکوانا چاہ رہی ہے!

میں نے گاڑی کو اُسی رفتار سے دوڑانا جاری رکھا۔

کچھ دیر بعد اُس نے ذرا سختی سے کہا ——— "میں کہتی ہوں، گاڑی روک لیجئے ——!!"

وہ ابھی تک میرے بازو کو پکڑے ہوئے تھی۔ میں ذرا سا سر گھما کر اُس کی طرف دیکھنے کے لئے جیسے مجبور ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں مجھے وہی کیفیت نظر آئی جس کی مجھے توقع تھی ——— خدشات، شکایتیں التجائیں ——— اس ملی جلی کیفیت میں ایک عجیب سی قوت تھی۔ ایک حیرتناک کیفیت۔

"پلیز!!"

اُس نے پھر التجا کی۔ میں نے گاڑی روک لی —— جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سُلگائی۔ اُس کی طرف پھر دیکھا۔ وہ اب کیا چاہتی ہے؟ گاڑی تو میں نے روک ہی لی ہے!

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میری آنکھوں میں سیدھے ——— پھر اُسی تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں پوچھتی ہوں، آپ اسقدر چُپ کیوں ہیں؟"

"نہیں تو!" میں نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ جس کا ذائقہ مجھے اچھا نہیں لگا میرے اندر سچ بولنے کا حوصلہ ہی کہاں رہ گیا تھا۔

"کوئی کارن تو ضرور ہے! سچ سچ بتایئے۔ میری بھابھی نے کچھ کہا ہے؟"

میری نظروں کے سامنے اُس کی بھابھی کا چہرہ گھوم گیا ——— اُس سے سُنی ہوئی ساری باتیں بھی میرے ذہن میں گونج گونج گئیں۔ میں نے پوچھا ——— "آپ کو پورا وشواس تھا آپ کی بھابھی مجھ سے ضرور کچھ کہے گی؟"

اُس نے لمحہ بھر تک میرے ہونٹوں کے درمیان پھنسی ہوئی اور کانپتی ہوئی سگریٹ کی طرف دیکھا۔ جس کے سرے پر بجھی ہوئی راکھ ڈھیرے سے میری گود میں گر پڑی اور پھر راکھ کا بجھا ہوا پھول لڑھکتا ہوا میرے پاؤں کے پاس جا کر رُک گیا۔ وبھا نے پاؤں بڑھا کر اپنی چپّل کے نیچے راکھ کو دبا دیا ——— اور کہا

"میری بھابھی بہت ہی کمزور پرسنالٹی والی ہے ——— اُسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ معلوم نہیں آپ نے اس بارے میں غور کیا یا نہیں۔ میرے بھائی صاحب کے سامنے وہ خود کو بہت کم تر سمجھتی ہے۔ اسی لئے وہ عام طور پر نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ جاتی ہے۔ دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے۔ دوسرے لوگوں نے تو میرے بارے میں اتنا کچھ نہیں کہا ہوگا جتنا کچھ اُس نے اپنی طرف سے جوڑ دیا ہے۔ اسی سے اُسے ایک انجانا سا سُکھ مل جاتا ہے۔ ایسی باتیں کہہ کر ہی وہ دوسروں کا دل جیتنے کا جتن کر سکتی ہے۔"

وبھا میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتے دیکھتے چپ ہو گئی جن میں ایک ہی سوال تھا ——— میں نے اُس کی بھابھی کی شخصیت کو سمجھنے میں کیوں غلطی کی؟

مجھے اس بات کا تو احساس ہو چکا تھا کہ وہ سماجی اور سیاسی سطح پر خاصی باشعور ہے۔ وہ قومی مسائل پر ایک صحت مند نقطہ نظر رکھتی ہے۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ دوسروں کی شخصیت کے بارے میں بھی بڑی گہرائی سے سوچ سکتی ہے۔ اور بڑی مدلّل رائے کا اظہار کر سکتی ہے۔ میرے دل میں ہلکی سی خوشی کی لہر اُٹھی۔ اُس کی ذہانت سے متاثر ہو کر ہی ـــــ میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے ـــــ" اُس کی آواز پہلے سے زیادہ صاف اور مضبوط تھی ـــــ وہ میرے کانوں میں بجتی ہوئی سی لگی ـــــ جیسے میرے ذہن کے کئی تہ خانوں میں گونجتی پھری ہو۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں ویسی ہی کیفیت نمایاں تھی۔ کچھ کرب آمیز، کچھ نرم اور کچھ شاکی!

میں نے پوچھا ـــــ "سہگل کے ساتھ آپ کے تعلقات کس قسم کے تھے؟"

یہ سن کر اُس نے سر نہیں جھکا لیا۔ بلکہ میری آنکھوں میں سیدھے دیکھتی ہوئی بولی۔ "میں جانتی تھی، آپ کو بہت جلدی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسی لئے میں نے آپ سے کہا تھا میرے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام مت لیجیے گا۔"

میں نے بھی اُس کی طرف سیدھی نظر سے دیکھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ اُس کی آنکھوں میں کسی پشیمانی یا ندامت کے احساس کی جھلک تو نہیں ہے! بلکہ وہاں ایک سرد مہری ہی نظر آئی۔ لاتعلقی سی۔

میں نے کہا ـــــ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سہگل کے ساتھ آپ کے کس طرح کے تعلقات تھے؟"

اپنی بات دہرانے کے بعد میں نے اُس کی آنکھوں کو شعلہ بار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ قدرے سخت لہجے میں بولی۔ "تعلقات کتنی طرح کے ہوتے ہیں؟ آپ کے ساتھ میرا تعلق کس قسم کا ہے؟"

اُس کے سوال نے مجھے بالکل ہلا دیا۔ جھنجھوڑ دیا۔ لیکن اس سے میری تشفی نہ ہوئی۔ کیونکہ میں اُس کے بارے میں جتنا کچھ سن چکا تھا اُس کی تائید اُس کے جوابی سوال سے نہیں ہو سکتی تھی ـــــ اگرچہ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُن سُنی سنائی باتوں کو بھی فوراً قبول کر لے جو مجھے بتائی جا چکی تھیں۔ میں دراصل اُس سے قطع تعلق کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسی لئے میں نے اُس سے کہا

"میرا اور آپ کا تعلق ابھی دیری پیچیدہ رہا ہے ـــــ ابھی پہیلی ہی مصر میں ہے۔ اس کا مقابلہ آپ اُن تعلقات کے ساتھ کیسے کر سکتی ہیں جو اتنے سارے لوگوں کی زبان پر آ چکے ہیں!"

اُس نے جیسے چوٹ کھا کر فوراً جواب دیا۔ "لفظ 'لوگوں' بہت ہی گمراہ کرنے والا ہے۔ جب تک آپ اُن لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیتے جن کی باتیں آپ تک پہنچائی گئی ہیں، تب تک آپ کو میرے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں، میری کمزوری کیا ہے؟ چاہوں تو اُس کے بارے میں آپ کے ساتھ بات کر سکتی ہوں۔ لیکن پہلے مجھے یہ یقین کر لینا ہو گا کہ پوری غیر جانبداری سے میری باتوں کا تجزیہ بھی کر پائیں گے کہ نہیں! کہیں آپ بھی اُن لوگوں کی طرح تو نہیں سوچنے لگیں گے جو میری نظر میں بہت ہی پست اور نچلے درجے کی سوچ رکھتے ہیں!"

میں نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا اور کہا ـــــ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ آپ کی ہر بات کو پوری دیانت داری سے پرکھوں گا۔ میرے اندر جتنی بھی سمجھداری ہے۔ اُس سے پورا پورا کام لوں گا۔ آپ بتایئے تو وہ سب کون لوگ تھے؟ وہ کس قسم کے تھے جو آپ کے ذاتی معاملات میں اتنی زیادہ دلچسپی لیتے رہے اور وہ آپ کی پریشانی کا سبب بن گئے؟"

"اُن کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ دینا میں کافی سمجھتی ہوں جو لوگ دوسروں کے ذاتی معاملوں میں بہت زیادہ دلچسپی دکھاتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں رس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے اُن میں کوئی نہ کوئی بے کیفی ضرور ہوتی ہے۔ وہ سراسر کھوکھلے بھی ہو سکتے ہیں۔ جہاں ہم رہتے تھے وہاں لوئر مڈل کلاس کے لوگ زیادہ تھے۔ تعلیم بھی معمولی، تنخواہیں بھی کم۔ اُسی طرح اُن کی سوسائٹی بھی نچلی سطح کی۔ وہ لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں سے آکر وہاں آباد ہوئے تھے۔ ایک ایسے شہر میں آکر آباد ہوئے تھے جس کی اپنی کوئی کلچرل تاریخ نہیں تھی۔ ہزاروں ایکڑ بنجر دھرتی کی اس کے سوا کونسی تاریخ ہو سکتی ہے کہ وہاں اگر پتھر نہیں ہیں تو بارش ہو جانے پر سال میں ایک دو بار فصلیں اُگا لی جائیں۔ اگر وہاں تھوڑے سے بکھرے ہوئے گاؤں تھے بھی تو انہیں حکومت نے خرید کر ملیا میٹ کر دیا تھا اور وہاں پنجاب کی راجدھانی بنانے کے لئے ایک نیا شہر بسا دیا تھا۔ وہاں آکر بسنے والوں کی جڑیں کہاں تھیں؟ کہیں بھی نہیں ـــــ نئی جگہ پر وہ سب ایک دوسرے کیلئے اجنبی تھے۔ ایک دوسرے کی طرف بڑے تجسّس سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی ذرا ذرا سی بات کے بارے میں پوری خبر رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو بتا دینے میں بھی اپنی بڑی اہمیت سمجھتے تھے ـــــ کس کے گھر میں کتنے کا نیا صوفہ آیا ہے؟ کون نیا فرج یا واشنگ مشین لے کر آیا ہے؟ کس نے دفتر سے قرض لے کر نیا رنگین ٹی وی یا وی۔ سی آر خریدا ہے۔ کس کی بیٹی کمپیوٹر کی ٹریننگ لینے کے بہانے رات کو بہت دیر سے واپس آئی ہے۔ کونسی لڑکی کس کے گھر میں جاکر ٹیلی فون پر کسی لڑکے کے ساتھ لمبی لمبی گفتگو۔ کرتی رہتی ہے اس کے علاوہ وہ ساری چھوٹی چھوٹی باتیں بھی تھیں جن کا تعلق عورتوں کی رسوئی کے نئے نئے برتنوں اور زیبار سنگھار کی چیزوں اور اُن کے پہننے کے کپڑوں سے ہوتا ہے۔ دودھ پنیر اور ترکاریوں کی خرید کا تو ذکر ہی کیا ہے ـــــ یہ سب اُن کی آپسی باتوں کے دلچسپ ترین موضوع ہوتے تھے۔ میں نے اُن کے درمیان رہ کر یہ سب سُنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں اعلیٰ طبقے کی ہوں۔ میں بھی انہی میں سے ایک تھی۔ لیکن ایک ہی طبقے میں کچھ لوگ الگ طرح سے بھی سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میں بھی اپنی زندگی اپنے طریقے سے گذارنے کی حقدار تھی۔ یہی آزادی میں دوسروں کو بھی دیتی تھی۔ کچھ ریزرو نیچر کی ہونے کی وجہ سے میں اڑوس پڑوس کی عورتوں میں زیادہ اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس بات کا مجھے پورا حق تھا کہ نہیں؟"

وبھا بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ بس تھوڑی ہی دیر کے لئے ـــــ اُس کے بعد اُس نے پھر کہا ـــــ "میں چونکہ اُن میں زیادہ مکس نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ میرے بارے میں کانا پھوسی کرتی رہتی تھیں ـــــ یہ ایک طرح کا افواہیں پھیلانے کا شغل تھا کہ میں اپنے پتی کے کسی دوست

کے ساتھ اتنی آزادی سے کیوں ملتی جلتی ہوں۔ اُس کے ساتھ پتی کی غیر حاضری میں کیوں باہر چلی جاتی ہوں! اُنہیں تو باتیں بنانے کا کوئی موقعہ ہاتھ لگنا چاہیئے تھا۔ اُن کے آدمی بھی انہی جیسے تھے — تنگ نظر، کوک ٹیل، چغل خور اور باتونی — وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں میرے، میرے پتی سوشیل اور اُس کے دوست سہگل کے بارے میں گپ چلاتے رہتے تھے — صبح جب ڈیری پر دودھ لینے کے لیئے جاتے۔ وہاں اُنہیں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ بھینسوں اور گائیوں کا دودھ اُترنے کے انتظار میں — چھٹی کے روز کسی ایک جگہ بیٹھ کر تاش کھیلتے ہوئے۔ کسی شہر کی جب تک رفتارِ زندگی بہت سُست رہتی ہے وہاں یہ ساری خرابیاں بڑی کامیابی سے پلپتی رہتی ہیں — زندگی جیسے ہی تیز ہو جاتی ہے لوگ اس کی بھاگ دوڑ میں یہ سب بھول جاتے ہیں — "

اُس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا کہ میں اُس کی باتیں پوری دلچسپی سے سُن رہا تھا کہ نہیں۔ مجھے اپنی طرف ہمہ تن گوش پاکر وہ بولی — "اس تبدیلی سے طبقہ نہیں بدلتا۔ اُس کے رویے بدل جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اتنے تکلیف دہ انسٹی ٹیوشن میں بہت دنوں تک رہنا پڑا۔ یہ طبقہ اپنے سے الگ تھلگ رہنے والوں کی اپنے رویوں سے ہی جان لے سکتا ہے۔ یا اُسے مرنے کے قریب پہنچا دیتا ہے — آپ کو ایسی سوسائٹی میں آزاد خیال ہونے کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑ جاتی ہے۔ آپ سمجھ گئے نا! انہوں نے ایک طرف تو میرے ہسبنڈ کو خودکشی کر لینے پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف سہگل کے کریکٹر کو اتنا گھناؤنا بنا کر سب کے سامنے پیش کیا کہ وہ قریب قریب پاگل ہی ہو گیا۔ یہ تھی کردارکشی کی ایک کامیاب مثال۔ اُسے سروس سے استعفیٰ دے کر بھاگنا پڑ گیا — "

وبھا نے کچھ دیر رُک کر پھر کہا — "ایک حادثہ سہگل کی زندگی میں پہلے بھی ہو چکا تھا۔ جس کے لیئے وہ قطعی ذمہ دار نہیں تھا — لیکن اُسے اُس کا دُکھ بہت تھا۔ ایک لڑکی سے اُس کا بہت گہرا سمبندھ تھا۔ یونیورسٹی کی ایک اسٹوڈنٹ ہرجیت کور کے ساتھ — لیکن اُس کے ماں باپ اُس کی شادی ایک غیر سکھ سے کرنے کے لیئے تیار نہیں تھے لیکن انہیں اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ اُن کی بیٹی کے پیٹ میں ایک بنک اکاؤنٹنٹ کا بچّہ پل رہا ہے۔ سہگل چاہتا تھا اُنہیں یہ بات بتا دی جائے۔ لیکن ہرجیت ہی اُسے روکتی رہی — وہ اُسے کہیں اور لے جانے کے لیئے بھی تیار تھا۔ لیکن وہ لڑکی ڈرپوک نکلی — لوگ کہتے ہیں اُس نے خود کو کمرے میں بند کر کے اپنے آپ کو جلا ڈالا — میں سمجھتی ہوں اُسے اُس کے ماں باپ نے ہی جلا کر ختم کر دیا تھا۔ اسی لیئے تو انہوں نے اس واقعے کی اصلیت کو بالکل دبا دیا — خیر سچّائی کچھ بھی ہو، یہ تھی ایک بہت بڑی ٹریجڈی —! جو سہگل کو زندگی بھر کے لیئے دُکھی کر گئی۔ اگرچہ اس کے لیئے وہ سو فی صد ذمہ دار نہیں تھا۔ پھر بھی وہ خود کو ذمّہ دار ہی کہتا تھا۔ اسی لیئے خود کو ہر وقت کوستا رہتا تھا — اس کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتا تھا — میرے اور سوشیل کے سامنے وہ کئی بار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ جب بھی اُس کے سامنے ہرجیت کور کا ذکر چھڑ گیا — وہ اُس سے واقعی محبت کرتا تھا۔ وہ ہم دونوں

کا بہت اچھا دوست تھا ـــــ ہم دونوں اُسے بہت پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ہم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ وہ ہم میں سے کس کا زیادہ دوست ہے! کبھی کبھی میرے دل میں یہ سوال بھی پیدا ہو جاتا کہ میں کسے زیادہ پسند کرتی ہوں۔ اپنے پتی سوشیل کو یا سہگل کو! اس سے میرے دل میں بھونچال سا آجاتا۔ میں اپنے دھرم سے گرنا نہیں چاہتی تھی لیکن کیا میں اپنے پتی کو چاہنے کے ساتھ ساتھ اُس کو بھی نہیں چاہ سکتی؟ میرا خیال ہے ساری عورتوں کی زندگی میں ایسا ایک لمحہ ضرور آتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ بھی کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچیں۔ صرف دل میں ـــ اُس کے ساتھ بھلے ہی کوئی سمبندھ نہ جوڑیں۔ ہم عورتیں اپنی ازدواجی زندگی کو توڑنے کا خیال بھی من میں نہیں لا سکتیں لیکن ہمارے دل و دماغ میں کسی نہ کسی کے ساتھ ایک تعلق ضرور قائم ہو جاتا ہے۔ مرد تو کھلم کھلا ایسا کر لیتے ہیں اور کبھی شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ یا اُن کے سماج میں کوئی اُنہیں شرمندہ کرنے والا نہیں ہوتا۔ دل کے معاملے میں عورت دوسری طرح کی چیز ہے۔ وہ اپنے دل کا حال کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ سہگل کے ساتھ میرا ایسی قسم کا رشتہ تھا۔ اور بالکل یک طرفہ۔ یعنی اُسے میرے دل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اُس کے ساتھ ہنس بول کر میں اپنے آپ کو تسکین دے لیتی تھی۔ اور اسے غلط بھی نہیں سمجھتی تھی۔ اس لئے کہ میں اپنی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔

میں نے سترہ نمبر سیکٹر میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہاں میں نے عورتوں و لڑکیوں کے لئے ککنگ کلاسز شروع کی تھیں۔ میں ککنگ کا ڈپلوما کر چکی تھی۔ میرے پاس بہت سی لڑکیاں اور عورتیں آنے لگیں۔ اونچے اور بیچ کے طبقے کی ـــ افسروں، وکیلوں، ڈاکٹروں، پروفیسروں وغیرہ کی۔ دو ایک لڑکیاں نچلے متوسط طبقے کی بھی آتی تھیں۔ کبھی کبھی سوشیل اور سہگل بھی وہاں آجاتے تھے۔ میرا حال چال پوچھنے کے بہانے سے ـــ وہ لڑکیوں کو کھانا بناتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے ـــ وہ اُنہیں اپنے بنائے ہوئے پکوان چکھنے کے لئے دے دیتیں تو وہ تعریف کرتے وقت زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ اس طرح کی تعریف میں کچھ نہ کچھ مبالغہ ضرور ہوتا تھا لیکن اسے ہنسی مذاق کے خوشگوار ماحول میں جائز ہی سمجھا جاتا تھا۔ انہی کلاسز میں ہر جیت کی ملاقات سہگل سے ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی سوشیل بھی کسی لڑکی میں دلچسپی دکھاتا تو مجھے خوشی ہی ہوتی تھی۔ اس بات کا میں بُرا نہیں مانتی تھی۔ مجھے اُس پر پورا وشواس تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اُس کی ایسی حرکتوں کو دیکھ کر اُس پر مجھے اور بھی پیار آتا تھا۔ اُس پر اپنا پیار لٹانے میں اور بھی فراخدل ہو جاتی تھی۔

"ایک بار میری تیار کی ہوئی ایک ڈش کی تعریف سہگل نے میرا ہاتھ چوم کے کر دی تھی۔ اُس کا یہ انداز مجھے بے حد بے ساختہ اور نیچرل لگا۔ میں بہت خوش ہوئی اور اُس کی طرف پیار سے دیکھتی رہ گئی۔ لیکن سوشیل یہ برداشت نہ کر سکا۔ نہ جانے کیوں؟ شاید کبھی کبھی آدمی کسی خاص لمحے میں اپنی انجانی کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی تو ایک دو بار سہگل سوشیل کے سامنے مجھے گلے سے لگا چکا تھا۔ اچانک کسی بے پناہ خوشی سے مغلوب ہو کر۔ اُس وقت تو اُس نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ ذرا سا بھی منہ

نہیں بنا پایا تھا۔ میرا خیال ہے وہ سہگل کے خلاف اندر ہی اندر حسد کا ایک جذبہ پال رہا تھا۔ لیکن مجھے کبھی احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ جس وقت سہگل نے میرا ہاتھ چوما تو وہ اپنے پچھلے سارے خدشوں میں گھر کر رہ گیا ۔ بالکل بے بس ہو گیا۔

"جیلسی" ایک خطرناک بیماری ہے۔ ایک بار اس میں آدمی پھنس جائے تو پھر بڑی مشکل سے اُس میں سے نکل پاتا ہے۔ ایسا آدمی یا تو پاگل ہو کر تشدّد پر اُتر آتا ہے یا وہ اپنے آپ ہی کو سزا دینے لگتا ہے۔ خود کو ٹارچر کرنے لگتا ہے ۔ جب میں نے اُس کو بدلا ہوا پایا تو اُسے سمجھانے کی کوشش کی ۔ سہگل کو تو ہماری ٹینشن کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ پہلے کی طرح اپنے فطری انداز سے آکر ہمیں ملتا تھا۔ ہمارے گھر پر اور ککنگ اسکول میں بھی ۔ جہاں اب سوشیل نے آنا جانا بند کر دیا تھا۔ سہگل کو سوشیل کے دل میں پلنے والے حسد کے بارے میں کچھ بتانا بھی مجھے نامناسب معلوم ہوا۔ اپنے طور پر میں سوشیل کو پہلے سے زیادہ پیار دیتی تھی۔ اُس کا وہ حقدار بھی تھا۔ کیونکہ وہ میرا پتی تھا۔ لیکن میرا پیار پا کر وہ کڑھنے لگتا ۔ ناراض ہو جاتا ۔ میرے اس سلوک کو وہ بناوٹی اور جھوٹا قرار دیتا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا دکھ لگتا ۔ دُکھ ہوتا ۔ اُس کا یہ روّیہ میرے لئے بڑا ہتک بھرا ہوتا۔ وہ میرا وشواس کیوں نہیں کرتا تھا! ۔

"میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں؟ کوئی بھی عورت اتنی سچائی سے اپنے مرد کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتائے گی۔ میں آپ کو بتا سکتی ہوں ۔ اپنے روٹھے ہوئے پتی کا من موہنے کے لئے میں نے خود ہی اپنے کپڑے کئی بار اتار ڈالے ۔ پھر اُس کے بھی ۔ رات رات بھر اُس کے پاس بیٹھی اُس کے بدن کو سہلاتی اور چومتی رہی ۔ لیکن وہ مرد کا بچہ پڑا پڑا غصّے سے پھنکارتا رہا۔ اس سے بڑا بلیدان میں اور کونسا دے سکتی تھی؟ اس سے تو میرا بڑا اپمان ہوتا تھا کہ وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا ۔ !

"اُسی کارن میں نے ککنگ کلاسز بھی بند کر دیں۔ ہر سیشن سے مجھے جو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی اُس سے بھی میں ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب اور میں کیا کرتی؟ اس کے علاوہ میرے لئے کچھ اور ممکن بھی نہیں تھا۔ بے بس ہو کر میں نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا۔ میری قسمت میں اگر یہی لکھا تھا کہ وہ میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی تک پینا بند کر دے تو یوں ہی سہی! یہ میرے وہی ہاتھ تھے جنہیں کبھی وہ چومتے چومتے نہیں تھکتا تھا ۔ اور جو شخص میرے پیچھے پیچھے سائے کی طرح گھوما کرتا تھا، اب وہ میرے ہمائے سے بھی نفرت کرنے لگا تھا۔ اگرچہ میں اُس کا دکھ سمجھتی تھی لیکن اُسے دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی میرے سارے جتن ناکام تھے ۔ اچانک اُس نے مجھ سے بدلہ لینے کا ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ جس کی میں کبھی اُمید نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن کہیں سے ایک عورت گھر میں لے آتا۔ میری بھاؤناؤں کو زخمی کرنے کے لئے اُسے اپنے کمرے میں بند کر لیتا اور مجھ پر یہ حکم چلاتا کہ میں اُس کے ناز بھی اُٹھاؤں۔ اُس کی خاطر تواضع کروں ۔ اُس کے بستر کی غلیظ چادریں بھی دھوؤں۔ میرے لئے اس سے بڑا ٹارچر اور کونسا ہو سکتا تھا؟ جب کہ میں بالکل بے قصور تھی۔ نردوش تھی ۔ یہ سب دیکھ کر بھی

میں نے اُف تک نہیں کی ـــــ اُسے واپس پانے کے لئے اپنی محبّت کے ہار اُس کے گلے میں ڈالتی رہی۔ اُس نے مجھے اپنے سے دُور رکھنے کے لئے کوئی عورت نہ چھوڑی۔ چوڑی چمارن تک کو اپنے بستر پر لے گیا۔ اُن پر بے دریغ روپیہ بھی لٹایا۔ اُن کی بھی فرمائشیں بڑھتی چلی گئیں۔ جب ایک چالاک عورت اُس کے گلے پڑ گئی اور اُس سے جان بچانا اُس کے لئے ناممکن ہو گیا تو ایک رات کو اُس نے کئی درجن نیند کی گولیاں کھا لیں ـــــ اور بے ہوش ہو گیا۔ میں اُسے اُٹھوا کر اسپتال لے گئی ـــــ لیکن وہ بچایا نہیں جا سکا ـــــ یہ میری بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ میری اور اُس کی زندگی کی۔ ہم دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ نئی روشنی کے تھے۔ لیکن ہمارے ایٹی ٹیوڈز میں یقیناً کہیں کوئی فرق موجود تھا۔ وہ خاصا آزاد خیال ہو کر بھی قدامت سے کہیں جُڑا رہ گیا تھا۔ رُوڑھیوں سے پوری طرح الگ ہونا اُس کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے آپ سنسکار کا نام دے سکتے ہیں۔ میں تو اسے محض ٹریجڈی ہی کہوں گی ـــــ جو مرد اور عورت کے درمیان کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ جب انسان کمزور پڑ جاتا ہے، حالات کو اُن کی گہرائی تک جا کر سمجھنے میں ناکام رہ جاتا ہے تو یہی ہوتا ہے ـــــ "

وبھا اتنی دیر سے بولتے بولتے اب تھک گئی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اُس کے تھکے تھکے لہجے سے ہو گیا۔ اُس کے منہ کا لعاب بھی سوکھ گیا تھا۔ میں نے اُسے تھرموس میں سے ایک گلاس پانی پلایا۔ پانی پی کر اُس نے اپنا سر سیٹ کے ساتھ ٹکا لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں اُس کے چہرے کو تکتا رہا۔ خوبصورت ہند آریائی نقوش جن میں بلا کی کشش تھی۔ اونچی سیدھی ناک اُس کی ناقابلِ شکست خودداری کی غمازی کر رہی تھی۔ اُس کی لمبی پلکوں والی غلافی آنکھیں اپنے اندر کتنے سپنے چھپائے ہوئے تھیں ـــــ جب یہ کھلتی تھیں اور کسی کی طرف بھی سیدھے دیکھتی تھیں اُس کے لئے کچھ بھی چھپانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اُس کے خوبصورت ہونٹ ایک گلاب کی طرح سُرخ تھے اور نیم بند تھے۔ جیسے وہ کوئی بات کہتے کہتے اچانک رُک گئی ہو! ابھی کتنی دیر تک انہی ہونٹوں سے اُس نے اپنے سماج اور اپنے گردو پیش میں رہنے والوں کا ایک قابلِ یقین تجزیہ کیا تھا۔ جس کے ساتھ پورا پورا اتفاق کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے اپنے بارے میں دوسرے لوگوں کی عمداً یا غیر ارادی طور پر پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ اُس کے پیچھے کی طرف سیٹ کے ساتھ سر لٹکا لینے سے اُس کی گردن اور ٹھوڑی کی خوبصورتی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ اُس کے سیاہ بالوں کا اُس کے چہرے کے ارد گرد ایک دلکش ہالہ بن گیا تھا۔

میں نے اپنے اندر اچانک سگریٹ پینے کی خواہش محسوس کی۔ سگریٹ سُلگائی تو اُس کا کچھ دھواں وبھا کی ناک میں بھی پہنچا ـــــ اُس نے یک بیک آنکھیں کھول دیں۔ تو میں نے مسکرا کر معذرت چاہی اور ہاتھ بڑھا کر اُس کے چہرے پر تحلیل ہوتے ہوئے دھوئیں کو ہٹا دیا۔ اور سوچا وبھا نے ایک عرصے تک ماڈرن لائف گزاری ہے۔ اُس کے روّیوں میں بے تکلفی ہے۔ اُس کے فیصلوں میں ایک دلیل ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس نے کبھی سگریٹ بھی پی تھی کہ نہیں۔ میرا جی چاہا اس بارے میں اس

سے دریافت کروں۔

"معاف کیجیے گا۔" کیا آپ اسموک کرنا پسند کریں گی؟"

میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جس میں سگریٹ کی ڈبیا تھی ـــــــ اُس نے ایک جھجک آمیز نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا ـــــــ

"میں اُس کی عادی تو نہیں ہوں ـــ لیکن کبھی کبھی سوشیل کے ساتھ مذاق مذاق میں دو ایک کش لے لیتی تھی۔ وہ خود ہی مجھے پکڑ کر میرے ہونٹوں میں لگا دیتا تھا۔ اور میں بے اختیار کھانس کھانس دیتی تھی۔"

"سوشیل کی طرح میں زبردستی تو نہیں کر سکتا۔ صرف آفر کر سکتا ہوں۔"

"اگر آپ واقعی چاہتے ہیں تو!" اُس کی جھجک کم ہوتی ہوئی نظر آئی۔ "اور میں جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتی۔ اِس وقت مجھے سچ مچ اس کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے ـــــ"

یہ کہہ کر اُس نے ایک سگریٹ لے لی۔ میں نے دیا سلائی جلا کر اسے سُلگا دیا۔ اُن لمحوں میں میری نظریں اُس کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جن میں جلتی ہوئی سلائی کا شعلہ لپک لپک گیا تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہم ایک دوسرے کو جان لینے کی کوشش کر رہے ہوں!

جب ہم دو چار دھیمے دھیمے کش لے چکے تو میں نے اُس سے پوچھا ـــ سوشیل کی موت کے بعد کیا آپ سہگل کے پاس گئی تھیں؟"

"گئی تھی۔ صرف ایک بار ـــ اُسی کی وجہ سے میری رسوائی ہوئی تھی۔ اور سوشیل نے اپنی جان دے دی تھی۔ لیکن اُسے اِس بات کا کوئی علم نہیں تھا وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ ہم پتی پتنی کے درمیان جو جھگڑا تھا وہ کتنا بڑھ چکا تھا۔ میں اُسے صرف بتا دینا چاہتی تھی کہ ہمارے درمیان وہ ٹریجڈی کیوں اور کیسے ہو گئی تھی۔ لیکن اُس وقت تک اُس کا نروس سسٹم بگڑ چکا تھا۔ اُسی لڑکی ہرجیت کور کی خودکشی کے بعد سے ـــ وہ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ ایک مرد کے طور پر وہ بے حد ڈرپوک بن چکا تھا۔ اُس کے کریکٹر پر ہر طرف سے حملے کئے گئے تھے۔ ایک حملہ اُس پر ایک دہشت پسند نے بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس وقت وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس لئے بچ گیا۔ اُس کے بعد وہ خانہ قید ہو کر رہ گیا۔ اُس کے گھر پر کڑا پہرہ لگ گیا۔ میں نے اُسے آخری بار ایک بار میں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔ مسکرایا بھی تھا۔ میں نے جب اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے باڈی گارڈ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اُس نے کہا۔ ـــ

"پہرے میں رہنے والی زندگی اُدھار لی ہوئی زندگی ہوئی ہے۔ اس کی کوئی ضمانت بھی نہیں دے سکتا۔ میرا باڈی گارڈ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی ایک قیدی ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہر لمحہ جیتا ہے ہر لمحہ مرتا ہے! لیکن مجھے مار دیئے جانے کا کوئی غم نہیں ہے۔ میں ہر وقت اچھی موت کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ دیکھو آج میں اُسی کی تلاش میں یہاں چلا آیا تھا۔ وہ نہیں ملی۔ کہیں نہ کہیں

تو مل جائے گی۔،،

،،یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا تھا ـــــ میں اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا ـــــ میں نے خاموش نظروں سے ہی اُسے الوداع کہی۔ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی نہیں ملے گا ـــــ کیونکہ میں بھی چنڈی گڈھ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!،،

یہ کہہ کر وہ بھا دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کھڑکی کے باہر ـــ شاید وہ اپنی آنکھوں میں بھر آئے ہوئے آنسوؤں کو چھپا لینا چاہتی تھی۔

میری جان پہچان کے لوگوں میں وہ پہلی عورت تھی جس نے اتنی سچائی کے ساتھ اپنی آپ بیتی مجھے سنائی تھی۔ اپنے اندر کی ہر ایک کیفیت مجھ پر منکشف کر دی تھی۔ اپنی انا، اپنی ہزیمت، اپنی کامیابی اور ناکامی اور محرومی، تعصب، تیاگ اور ساری منطقیں! اُس کے سارے رڈیے میرے سامنے تھے۔ جن کے ساتھ وہ اب تک جی رہی تھی۔ آئندہ بھی انہی کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔ اور ایسا کر سکتی تھی۔

اُس نے اپنے رُوکھے اور کھلے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور پھر دونوں بازو اُٹھا کر انہیں سر کے پیچھے باندھ دیا۔ ایک بڑے سے جُوڑے کی شکل میں ـــ پھر اپنے بیگ میں سے کالا چشمہ نکالا اور آنکھوں پر لگا لیا۔ پھر اُسی طرح باہر دیکھنے لگی۔

ہمیں گاڑی روک کر باتیں کرتے کرتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ یہ باتیں تیز رفتار سے جاتے ہوئے رواروی میں نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اُس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

،،کیا ہم آگے نہیں بڑھیں گے؟،،

میں اُسی کے چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ اُس کی آواز بہت سے آنسو پی کر اب نکھر کر نکلی تھی۔ صاف اور پاکیزہ۔ اس آواز میں خدشات کی گھلاوٹ نہیں تھی۔ اُسے آگے کا راستہ صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ آئندہ حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھی۔

مالیر کوٹلہ سے نکلتے وقت میں ایک صدمے سے دوچار تھا۔ میرے سامنے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ میں نے اُس کے بارے میں بہت سی باتیں سُن لی تھیں۔ وہ میرے ہمراہ نہیں آئی ہوتی تو میں نے اُس سے اصرار نہیں کیا ہوتا۔ لیکن میں اُسے چھوڑ کر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ دہشت بھرے واقعات کے پس منظر میں اور ذاتی زندگی کے بکھراؤ کے ساتھ ساتھ جینا کتنا مشکل محسوس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی لگتا تھا ہم خود بھی ٹوٹ جائیں گے۔ ایک دوسرے سے جُڑ نہیں پائیں گے۔ جبکہ ہمیں ایک دوسرے کی شدید ضرورت تھی۔ یہ منزل وہی تھی جہاں کچھ جوڑنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

میں نے اپنے اندر اُمڈتے ہوئے جذباتی سیلاب کو روک کر کہا ـــــ ،،دیکھا جی، ہمیں آگے ہی بڑھنا ہے ـــ پیچھے کو ہرگز نہیں جانا ہے۔ لیکن میں آپ کے سامنے اپنی وہی پیشکش دہرانا چاہتا ہوں جو میں نے اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کی تھی۔ مجھے آپ کے مسائل کا اندازہ ہو چکا ہے۔

انہیں میں اپنے ہی مسائل سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے میں ایسا کر سکوں گا۔ اس میں مجھے آپ کے تعاون کی بھی ضرورت ہو گی —— پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ اور بھی بتا دوں۔ میری تنخواہ اس وقت ساڑھے پانچ ہزار ہے۔ مفت رہائش کے لئے ایک فلیٹ ملا ہوا ہے۔ اپنے مکان کے لئے بمبئی سے سو میل دور ایک ہاؤسنگ سوسائٹی سے ایک دو سو گز کا پلاٹ بھی لے لیا ہے۔ آنے جانے کے لئے کمپنی نے مجھے گاڑی کی سہولت بھی دے رکھی ہے۔ کبھی نہ کبھی اپنی گاڑی بھی ضرور خرید لوں گا۔ میری زندگی میں ابھی تک کوئی عورت نہیں آئی ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں اور آپ کو پسند کرتا ہوں۔ اُس وقت سے جب آپ کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ اُس کے بعد آپ کو بھول نہیں سکا۔ آپ پھر سے مل گئی ہیں تو آپ کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میرا مسئلہ صرف یہی ہے۔ جبکہ آپ کے مسائل ایک سے زیادہ ہیں۔ مثلاً آپ کا بوڑھا باپ جسے ہم اپنے ساتھ بمبئی لے جا سکتے ہیں۔ آپ کا بیٹا سنٹی جسے گود لے لینے کا فیصلہ آپ سے بھائی اور بھابی کر ہی چکے ہیں۔ ہم اُسے سال میں ایک دو بار ملنے کے لئے مالیر کوٹلہ آجایا کریں گے۔ کبھی کبھی انہیں بھی اپنے پاس بلا لیا کریں گے۔ سنٹی سِکھ ماں باپ کے پاس پرورش پاتا رہے تو بڑا ہو کر وہ کیا بنے گا —— ایک ڈاکٹر یا پروفیسر! ایک انجینئر یا ایک اعلیٰ افسر! یہ تو وقت ہی بتا سکے گا۔ یعنی اُس کے مستقبل کے بارے میں اب نیا پنجاب ہی کوئی فیصلہ کرے گا۔ جو ابھی تو بارود کے غبار میں گولیوں کے شور میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن اُمید کی جانی چاہیے کہ یہ گرد و غبار اور شور ایک نہ ایک دن ضرور ختم ہو جائے گا —— میں خود کو آپ کے قابل تو نہیں سمجھتا، پھر بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو ہمیشہ خوش اور سُکھی رکھنے کی پوری کوشش کروں گا ۔۔"

وہ کبھا نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں مُسکرا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ میری سچائی پر وشواس کرے۔ لیکن وہ خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں کالے چشمے کے پیچھے چھپا رکھی تھیں۔ میری باتیں سُن کر بھی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ میں اُس مسکراہٹ کو دیکھنے کے لئے بہت بے چین تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن شاید ابھی ایسا کرنا اُس کے لئے ممکن نہیں ہو رہا ہے!

وہ کتنے لمحوں تک میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسٹیرنگ پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کے اوپر۔

میرا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔ میرے اندر خوشی کی ایک لہر اُٹھی۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ بڑھا کر اُس کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا۔ اور بڑی بے تابی سے پوچھا —— "اب آگے چلیں؟"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "چلیے ——"

"کہاں؟" میں نے پھر پوچھا ——

"پہلے سیدھے دہلی!" اُس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"اُس کے بعد؟" مجھے اپنی آواز کانپتی ہوئی سی لگی۔

"پھر بمبئی ——— !" یہ کہہ کر اُس نے سر جھکا لیا۔ جسے دھیرے دھیرے اُس نے میرے کندھے پر رکھ دیا۔

میں نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

انیؔ چنڈی گڑھ سے اپنی ٹرانسفر کرا کے لکھنؤ پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ شہر کا ایک چوتھائی حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کا دفتر بھی ایک ایسی سڑک پر واقع ہے جہاں موٹروں اور بسوں کے بجائے اب کشتیاں چل رہی ہیں۔ اس علاقے میں ٹیلی فون کا سلسلہ بھی منقطع ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے سینئر زبجنل مینیجر کے ساتھ رابطہ قائم کر سکا جو اپنے دفتر سے متصل رہائش گاہ چھوڑ کر ایک دوست کے یہاں منتقل ہو چکا تھا۔ اُسی نے انیؔ کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ روز کے لیے کسی ہوٹل میں ہی ایک کمرہ کرائے پر لے کر آفس کے دوبارہ کھلنے کا انتظار کرے۔ جب تک سیلاب پوری طرح اُتر نہیں جاتا۔

سیلاب کی وجہ سے لکھنؤ کا سارا کاروبارِ حیات متأثر ہو چکا ہے۔ جہاں جہاں پانی بھرا ہوا ہے، وہاں کے دفتر بند، دکانیں بند، سینما گھر و دیگر تفریح گاہیں بند۔ سارے شہر کی تعلیم گاہیں یوں بھی بند کر دی گئی تھیں۔ کئی جگہ موٹروں اور بسوں کے اندر پانی بھر جانے کی وجہ سے انہیں یہاں وہاں سڑکوں کے درمیان ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ لوگ باگ اس صورتِ حال سے خوش نہیں ہیں۔ لیکن اندر کمار ملہوترا کچھ زیادہ ہی بے لطفی محسوس کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اس خوبصورت و تاریخی شہر میں پہلی بار آیا ہے۔

اس شہر کے بارے میں اُس کے ذہن میں کئی قسم کے تصوّرات تھے۔

تاریخی عمارتیں،

مقبرے، گلی کوچوں میں میرؔ و غالبؔ اور انشاؔ کی غزلیں گاتے پھرتے فقیر ستاون کی آزادی کی لڑائی میں شریک بیگم حضرت محل کی یادگار پارک!

واجد علی شاہ کی بارہ دری جہاں اندر سبھا کے کلاسیکی رقص اور گانے پہلی بار گونجے تھے۔

وہاں کی ٹھمریاں اور کتھک اور میر انیسؔ کی مجلسیں اور وہاں کی تعزیہ داری، لکھنؤ کے نواب جو دنیا بھر میں مشہور ہو چکے ہیں اور اُن کی عادتیں ضرب المثل بن چکی ہیں۔

اور ٹھیٹھ اُردو بولنے والے لوگ اور کبوتر اُڑانے اور مرغ لڑانے والے بے فکرے،
اور لکھنؤ کی شامِ اودھ کے قصّے جو دل میں گدگدی پیدا کر دیتے ہیں!

اِنّی نے اپنے بے تکلّف دوستوں سے سنا تھا کہ ریشمیں غرارے، ساڑیاں اور چوڑی دار پاجامے اور ریشمی کُرتے پہنے ہوئے لکھنؤ کی حسین و جمیل اور طرحدار لڑکیاں، غول کے غول بنائے امین آباد اور حضرت گنج میں گھومتی نظر آتی ہیں اور یونیورسٹیوں و کالجوں کے عاشق مزاج نوجوان لڑکے اُن کے پیچھے پیچھے اُن پر جملے کستے اور شعر پڑھتے ہوئے چلتے ہیں۔

اُس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ ایسے دل پھینک عاشقوں کو اُن کی حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے کبھی کبھی وہاں کی پولِس برقعے اوڑھ کر شاہراہوں پر گھوما کرتی ہے تاکہ کوئی انہیں لڑکی سمجھ کر چھیڑ بیٹھے تو وہ اُسے جھٹ حراست میں لے لے۔

لیکن لکھنؤ پہنچ کر اِنّی کو جو منظر دیکھنا پڑ رہا تھا اُس سے اُسے ایک جذباتی صدمہ محسوس ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ خوبصورت عمارتوں اور عالیشان دروازوں کی لکھوری اینٹیں پانی کی نمی کو چوس چوس کر اپنے بدن پر دھیرے دھیرے زہر بھرے پھوڑے سے ابھارتی جا رہی تھیں۔ ان پھوڑوں میں کائی، شورا اور پرانی اینٹوں کے سُرخ سفوف کی آمیزش تھی۔ اچھے اچھے سنیما گھر اور ریستوران زیرِ آب ہو جانے کی وجہ سے موت جیسے سکوت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ سیلاب زدہ علاقوں کی گلیوں میں اور سڑکوں پر جہاں جہاں مغموم تماشائیوں کی بھیڑ تھی اُن میں کوئی کوئی ہی پُرکشش چہرہ نظر آتا تھا۔

وہ اپنے ساتھ اپنی اسکوٹر بھی بُک کرا کے لے آیا تھا۔ وہ اُسی پر بے مقصد ہی شہر کے مختلف حصوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ جہاں جہاں وہ جا سکتا تھا۔ امین آباد کے ایک متوسط درجے کے جس ہوٹل میں اُس نے رہنے کے لئے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا وہاں پڑے پڑے بھی اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ کوئی سارا دن پڑے پڑے اخباروں اور میگزینوں کے صفحات بھی تو بار بار نہیں چاٹ سکتا۔ اخبارات بھی سیلاب ہی کی خبروں اور رپورتاژوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اِنّی چاہتا تھا، اُسے افسردہ بنا دینے والے اس ماحول سے کوئی راہِ فرار مل جائے۔ کوئی ایسا راستہ جو اُسے اس بے دلی سے نجات دلا دے۔

ایک روز اچانک چار باغ کے سویٹ ہاؤس کے سامنے اُسے کپور دکھائی دے گیا۔ سریندر کپور جو اُس کے بچپن کا دوست تھا۔ اُسے نہیں معلوم تھا وہ اب لکھنؤ میں رہتا ہے۔

سریندر کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر ملے۔ وہ لڑکی اِنّی کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اِنّی نے اُسے پہچاننے کی کوشش کی سریندر کی باہوں میں جکڑے جکڑے اُس نے پوچھا —— "تم! تم تو پنکی ہو! ہو نا!"

"جی!!!" اُس نے بڑی شوخی سے جی کو لمبا کر کے کہا۔

"میں واقعی پنکی ہوں۔ شکر ہے، پہچان تو لیا مجھے!"

وہ سریندر کپور کی چھوٹی بہن تھی۔

"اور تم اِتی ہو! تمہیں تو دیکھتے ہی میں پہچان گئی۔"

پنکی بڑی بے تکلفی سے چہک رہی تھی۔

بچپن کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں معصوم اور بے لوث اور دیرپا بھی ——— وقت ان کی چمک دمک پر اپنی گرد کی چادر تو ڈال سکتا ہے مگر ان کی بنیاد نہیں ختم کر سکتا۔ بعد کے رشتے اپنی اپنی اغراض یا مجبوریوں کی وجہ سے استوار ہوتے ہیں۔ ان پر مصروف و بے بس زندگی کے مہذب غلاف چڑھے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ جتنی جلدی بنتے ہیں اتنی جلدی ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔

"اب تم کہاں ہو اِتی! یہاں کب آئے؟"

اندر نے بہن بھائی، دونوں کو اپنے بارے میں مختصر سی روئیداد بتائی۔

"اب میں یہیں ٹرانسفر ہو کر آ گیا ہوں۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہوں۔ اور تم؟"

سریندر کپور نے کہا ——— "میں پنت نگر کی ایگریکلچرل یونیورسٹی میں لیکچرر ہوں۔ چھٹی پہ آیا ہوا ہوں۔ بلکہ بلایا گیا ہوں کہ ایک لڑکی دیکھ جاؤں۔"

"اور تمہارے ڈیڈی؟"

"وہ یہیں ہیں۔ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ممی بھی یہیں ہیں۔"

"اور تم ——— پنکی؟ تم کیا کر رہی ہو؟"

"میں نے پچھلے سال ایم ایس سی کیا تھا ——— فرسٹ کلاس میں۔ اب ریسرچ کروں گی ———"

اِتی نے پنکی کی طرف بڑی شریر نظروں سے دیکھا۔ اور سریندر سے پوچھا۔

"تو تم نے اُس لڑکی کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا؟"

"نہیں یار ——— ابھی تو اُسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ میرے یہاں آ جانے کی وہاں اطلاع بھجوائی گئی تھی۔ معلوم ہوا، لڑکی کو دو روز سے بخار آ رہا تھا۔ انہوں نے آج شام کو آنے کے لئے کہلایا ہے۔ تم بھی چلو نا نہ ہمارے ساتھ! اپنی بھابھی کو پسند کرنے کا تمہیں پورا اختیار دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

اِتی اور پنکی بھی ہنس پڑے۔ پنکی نے بڑے اصرار سے کہا،

"ہاں ہاں تم بھی ضرور چلو، ہمارے ساتھ۔ بلکہ ابھی چلو ——— ڈیڈی اور ممی تمہیں اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوں گے ——— "مالتی دیدی اور پریم جیجاجی بھی آ گئے ہیں بھلائی سے ———"

"اب یہاں سڑک پہ کھڑے کھڑے کیوں باتیں کر رہے ہیں، ہم لوگ! کیوں نہ فوراً گھر چلیں!"

سریندر نے کہا۔

پنکی بولی ——— اِتی، تمہیں ہمارے گھر تک پہنچنے کے لئے یہاں تک پانی میں سے ہو کر جانا ہو گا!"

اُس نے جھک کر اپنی پنڈلیوں کو چھُوا تو اُس کے خوبصورت ترشے ہوئے سارے بال چھلک کر اُس کے چہرے پر جھول جھول گئے۔ اس نے سر جھٹک کر انہیں پیچھے ہٹایا تو اِنّی اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ــــــــــ

"پنکی، اب تم بہت دلکش ہوگئی ہو۔ بچپن میں تو تم اتنی بھدّی تھیں کہ سریندر اور میں تمہیں کبھی ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے! اور تم خوب رویا کرتی تھیں! یاد ہے؟"

اِنّی نے جذبات سے بھرا ہوا ایک قہقہہ بھی لگا دیا۔ پنکی شرما کر رہ گئی۔ پھر بڑی مشکل سے نظر اٹھا کر اِنّی کی طرف دیکھ سکی۔ بعض لمحے بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ ساری قوتِ گویائی اچانک چھین لیتے ہیں ـــ انسان سے اُس کی ساری بے تکلّفی بھی۔ چند برس پہلے تک یہ لڑکا میرے بھائی کی طرح دبلا پتلا سا تھا۔ دونوں ایک سائیکل پر ادھر اُدھر دوڑا کرتے تھے۔ اب وہ پورا مرد بن چکا ہے۔ شرٹ، پینٹ میں کتنا بارعب دکھائی دے رہا ہے اور اُس کی جو اس مرد نے تعریف کی ہے کیا وہ سچّی ہے یا مجھے بنا رہا ہے ـــ محض!

اُسی وقت سریندر نے بھی اپنی بہن کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا اور اس کے گرد ایک بازو حمائل کرتے ہوئے بولا ـــ "میری بہن واقعی اب بہت ہی اٹریکٹو (ATTRACTIVE) ہوگئی ہے۔ اور اتنی ذہین بھی کہ اُس کے ساتھ کسی بھی ٹاپک (TOPIC) پر بحث کر کے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ پی ایچ ڈی کر لے تو یونیورسٹی اسے فوراً لے لے گی۔"

اِنّی نے کہا ـــ "اسکوٹر تو ایک ہی ہے اور ہم تین ہیں۔ جائیں گے کیسے؟"

سریندر بولا ـــ "مجھے تھوڑی دیر کے لئے سکریٹریٹ جانا ہے۔ ایجوکیشن کے ایک انڈر سیکریٹری سے ملنے کے لئے۔ تب تک تم پنکی کو لے کر گھر پہنچو۔ سب لوگوں سے ملو ـــ"

یہی طے ہوگیا۔

سریندر کپور رکشا لے کر سیکریٹریٹ کی طرف چل دیا۔ اِنّی اور پنکی دیورینک کالونی روانہ ہوگئے۔ جہاں کپور فیملی کا قیام تھا۔ اِنّی کے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھی بیٹھی پنکی راستے بھر چہکتی گئی۔ اُس کی فطری شوخی پلٹ آئی تھی۔ وہ اُسے راستہ بھی بتاتی گئی اور سڑکوں کے نام بھی ـــ کہیں کہیں کوئی تاریخی عمارت راستے میں آئی تو اُس کی پوری تاریخ بھی بیان کردی ـــ وہ سبزی منڈی کے سامنے سے گزرے تو پنکی نے لکھنؤ کے موسمی پھلوں کے ناموں کی ایک فہرست زبانی سنا دی۔ اور اُن پھلوں کی جملہ خصوصیات بھی ـــ اس کا یہ اظہار ایک عجیب سی خوشی سے مملو تھا۔ جس شہر میں اب وہ رہتی تھی اور جہاں رہ کر وہ بڑی ہوئی تھی اور اُس نے تعلیم پائی تھی، اُس کے بارے میں اُس کی باتوں سے فخر کا احساس تو جھلکتا ہی تھا۔ لیکن جس شخص کو وہ اپنے ماحول سے متعارف کراتی جا رہی تھی وہ بھی اُس کے لئے بہت اہم تھا۔ جیسے چاہتی ہو وہ بھی اس شہر کو اُسی کی نظر سے دیکھے اور پسند بھی کرے۔ کبھی کبھی کوئی انسان اپنے شہر کو اپنی ہی شخصیت کے لئے ایک ڈھال بنا کر پیش کر دینے میں بے پناہ خوشی محسوس کرتا ہے۔

اِنّی بھی خوش تھا۔ پنکی کی دلچسپ باتوں سے اُس کی کئی روز کی بے زاری جیسے بالکل اچانک

ختم ہو گئی تھی۔ اُس نے سمجھ لیا تھا، یہاں اب اُس کا وقت بہت اچھا گذرے گا۔ جہاں پنکی ہو، سریندر ہو، ان کے ممی ڈیڈی ہوں، وہاں اُس کا جی کیوں نہیں لگے گا! اور سیلاب کا پانی بھی تو ہمیشہ نہیں بھرا رہے گا۔ گومتی کے ٹوٹے ہوئے بندھ کو بھرنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔

دیور بنک کالونی کے اندر جانے کے لئے انہیں پانی میں سے ہو کر جانا پڑا۔ جیسا کہ پنکی نے اِتّی کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ وہاں اور بھی کئی لوگ گھٹنوں تک کپڑے اٹھائے اور جوتے ہاتھ میں اُٹھائے پانی میں چل کر جا رہے تھے۔ اِتّی کی اسکوٹر پنکی نے اپنی ایک فرینڈ کے مکان میں رکھوا دی تھی۔ جو عین لب سڑک واقع تھا۔ اب وہ اُس کا ہاتھ پکڑے پانی میں دھیرے دھیرے پاؤں رکھتی ہوئی اپنے مکان کی طرف لے جا رہی تھی جو ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا۔ وہ اُسے راستے میں پڑنے والے چھوٹے بڑے گڑھوں سے بچا کر بالآخر گھر میں لے گئی۔

وہاں خاصی چہل پہل تھی ـــــ نچلے حصّے میں رہنے والا کرایہ دار بیوی بچوں اور ضروری سامان سمیت انہی کے فلیٹ کے ایک کمرے میں آ گیا تھا۔ اُس کے کمروں میں تھوڑا تھوڑا پانی گھس آیا تھا۔ پنکی کی بھلائی میں رہنے والی بہن مالتی اِتّی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس نے لپک کر اِتّی کو سینے سے لگا لیا۔ جبکہ اِتّی اُس کے پاؤں چھونے کے لئے جھکنا چاہتا تھا۔ اس کا شوہر پریم کمار کھنّہ جو بھلائی میں لوہے کی ایک فونڈری کا انچارج تھا۔ حسب عادت اس سے "یس سر!" کہہ کر ملا۔ ان دونوں کی شادی میں جو کئی سال پہلے چنڈی گڑھ میں ہوئی تھی، اِتّی شریک تھا۔ اگرچہ وہ کھنّہ سے عمر میں بہت چھوٹا تھا وہ تب بھی بات بات پر اُس سے یس سر، یس سر کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔ دراصل وہ بہت ہی خوش مزاج واقع ہوا تھا۔ اور اس طرح کے تخاطب سے وہ دوسروں کو فوراً خوش کر لیتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اسی طرح مخاطب ہوتا تھا۔ اپنے اور مالتی کے بزرگوں کے سامنے بھی ـــــ سب لوگ اُس کی بے تکلفی اور خوش مزاجی سے واقف تھے اور خوش تھے۔

مالتی اور کھنّہ چند روز کے لئے لکھنؤ آ گئے تھے۔ کھنّہ کا ایک دوست، جو بھلائی میں اُس کے ساتھ کام کرتا تھا، کے ماں باپ اور ایک بہن لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اُسی دوست نے اُس سے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ اُس کی بہن کا رشتہ اپنے سالے سریندر کپور سے کرا دے۔ سریندر کو بھی اُسی نے تار دے کر پینت نگر سے بُلوا لیا تھا۔

شام کو وہ سب اُسی کالونی کے سامنے ایک اور کالونی میں گئے۔ وہاں بہت زیادہ پانی بھرا ہوا تھا۔ سیلاب نے لکھنؤ کا سارا کام کاج ٹھپ کر رکھا تھا اور بہت سی سڑکوں پر اور گلیوں میں کشتیاں چلنے لگی تھیں ریلیف کا کام بھی زوروں پر چل رہا تھا۔ کئی لوگ اپنے مکان چھوڑ کر محفوظ مقامات پر منتقل ہو رہے تھے۔ لیکن جو لوگ اپنے مکانوں میں ابھی خود کو محفوظ سمجھتے تھے وہ وہیں رہ کر اپنے معمولات کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں اُن کی چھوٹی بڑی خوشیاں بھی

شامل تھیں۔ اور غم بھی ۔۔ اِنّی نے اسی پانی میں لوگوں کو ایک ارتھی اُٹھا کر بھی لے جاتے ہوئے دیکھا۔

" رام نام ست ہے "

" رام نام ست ہے "

" ہری کا نام ست ہے "

سوگوار لوگوں کی بھیڑ پانی میں چل کر ہی ارتھی کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔

سریندر کو لڑکی دکھانے کا پروگرام بھی ملتوی نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ سریندر کو اگلے روز واپس چلے جانا تھا۔ کھنہ اور اُس کی بیوی مالتی کا بھی اُسی روز بھلائی لوٹ جانے کا پروگرام تھا۔

لڑکی کا باپ ایک ریٹائرڈ حوالدار تھا۔ حوالدار مدھوک خود ہی ایک کشتی لے کر آ گئے اور اُن سب کو اُس میں سوار کر کے اپنے گھر لے گئے۔ اِنّی کو یہ سب دیکھ کر بہت دلچسپ لگا۔ زندگی اپنے محور سے ذرا سی بھی نہیں ہٹی ہے۔ سیلاب آ جانے کے باوجود اب بھی اپنے محور پر اُسی رفتار سے گھوم رہی ہے۔

واہ، لکھنؤ!

دو

حوالدار مدھوک کے چھوٹے سے فلیٹ میں جو دوسری منزل پر ہے۔ بڑی خاموشی ہے — وہاں اتنے سارے لوگوں کے آجانے پر بھی وہ خاموشی نہیں ٹوٹی جو یہاں ہمیشہ راج کرتی ہے۔ حوالدار اس وقت عمر کے پچھتّر سال پورے کر چکا ہے۔ اُس میں اب وہ پہلا سا دم خم نہیں رہا۔ اس کی بیوی بھی عمر کی قریب قریب اُسی منزل میں ہے۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے زیادہ چل پھر نہیں سکتی۔ اُسے دیکھ کر لگتا ہے وہ کبھی بہت خوشگوار طبیعت کی رہی ہو گی۔ چہرے کے معمولی خدوخال کے باوجود۔ اب تو جیسے وہ مسکرانا ہی بھول چکی ہے۔ میاں بیوی دونوں بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے ہیں۔

پریم کمار کھنّہ اپنی ہنوڑ فطرت کے باوجود اس ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر پا رہا ہے۔ اگرچہ وہ اس خاموشی کو توڑنے کے لئے کئی بار انجانے میں "یس سر! یس سر!" کہہ بیٹھا ہے۔

اِنّی اپنے دوست سریندر کے ساتھ ایک صوفے میں بیٹھا مدھوک صاحب کی بیٹی کی آمد کا انتظار کر رہا ہے۔ سریندر کی دونوں بہنیں پنکی اور رمالتی اور ان کے ممی اور ڈیڈی بھی الگ الگ صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے اُسی لڑکی کے کمرے میں داخل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

وہاں سوائے اِنّی کے کسی کے لئے یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ ایک لڑکی خود کو پسند کرانے کے لئے سب کے سامنے پیش ہو گی — اِنّی کے لئے یہ پہلا تجربہ ہو گا۔ اگرچہ اُس نے اس رواج کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے — سریندر اُسے بتا چکا ہے کہ اُسے دو چار بار پہلے بھی اسی طرح لڑکیاں دکھائی جا چکی ہیں۔ جنہیں کبھی اُس کے گھر والوں نے اور کبھی اُسی نے ناپسند کر دیا تھا۔ اس لئے اُس کے اندر کسی قسم کی بے چینی نہیں ہے۔ لیکن اِنّی یقیناً بے چین ہے۔ بہت زیادہ بے چین!

ایک لڑکی خود کو پسند کروانے کے لئے اتنے سارے لوگوں کے سامنے آنے والی ہے۔ اُسے ہدایت کی گئی ہوگی کہ وہ خوب بن سنور کر آئے ـــــ دیکھنے والے اُس کے لباس کو بھی دیکھیں گے۔ اور اُس کے جسم کے انگ انگ کو بھی بیک وقت نظروں سے ٹٹولیں گے ـــــ اوہ! یہ سب کس قدر عجیب ہوگا! کتنا بناوٹی اور پریشان کن اور تحقیر آمیز!

شاید اسی وجہ سے اُس کے ماں باپ غیر معمولی طور پر چُپ ہیں۔ شاید اس سے پہلے بھی وہ کئی لوگوں کے سامنے یہ ناٹک کرنے پر مجبور ہو چکے ہوں گے! اُن کی بیٹی کو ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے ناپسند کر دیا گیا ہوگا۔

اِنّی نے اپنے ساتھیوں سے ایسے کئی واقعات سُن رکھے ہیں۔

ایک لڑکے نے ایسے ہی موقعہ پر لڑکی سے تین تین لباس تبدیل کرکے بار بار اپنے سامنے بلایا تھا ـــــ پہلے ساڑھی میں، پھر قمیض شلوار میں، پھر چوڑی دار پاجامے اور کُرتے میں بھی ـــــ جبکہ وہ بڑی بے تکلفی سے اسکول ڈریس میں ہی وہاں ہنستی ہوئی چلی آئی تھی۔

ایک اور لڑکے نے ضد پکڑ لی تھی کہ وہ لڑکی پسند کرنے سے پہلے اُس کو اپنے ساتھ کسی ریستوران میں لے جانا چاہتا ہے۔

ایسا لگتا ہے نچلے متوسط طبقے کا سماج اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہے اور تبدیل بھی ہو رہا ہے ـــــ ماں باپ کی پسند اب کوئی معنے نہیں رکھتی ہے۔ لڑکا سب کے سامنے زبان کھول سکتا ہے یا اُسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے جس سلیقے کی ضرورت ہے، اُس پر زیادہ غور نہیں کیا جاتا ہے۔ غلط یا صحیح جو ڈھرّا بن گیا ہے، اُسی پر چلتے رہنے میں کسی کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی۔

اِنّی اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے سر گھما کر پنکی کی طرف دیکھتا ہے جو اپنی ماں اور بڑی بہن کے درمیان بیٹھی ہے۔ وہ بھی اُسی لڑکی کی آمد کی منتظر ہے۔ جو اگر سب کو پسند آگئی تو اُس کی بھابھی بنا دی جائے گی۔

اِنّی کے من میں معاً یہ خیال اُبھرا، پنکی یہ بات کیوں نہیں سوچتی کہ اگر اُسے اُسی طرح بن سنور کر کسی کے سامنے آنے کے لئے کہا جائے تو وہ کیسا محسوس کرے گی؟ اس قسم کے رواج کی مخالفت خود لڑکیاں اور عورتیں کیوں نہیں کرتیں؟ شاید عورت ذات کو ذلیل کرنے میں خود عورت کا ہاتھ زیادہ رہا ہے۔ یہ سارے رسم و رواج زیادہ تر اُسی کے بنائے ہوئے ہیں۔

اگرچہ اِنّی کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر پنکی مسکرا دی تھی لیکن اِنّی اُس کی مسکراہٹ سے زیادہ متاثر نہیں ہو سکا۔ اگرچہ اُسے اُس کی طرف دیکھنا اچھا ہی لگا تھا۔ لیکن اُس وقت اُس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچتا ہوا کہ اس طرح کی تحقیر اس خوبصورت لڑکی کے حصے میں ہرگز نہیں آنی چاہیئے۔

اچانک پنکی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اِنّی کو اُس دروازے کی جانب متوجہ کردیا جس میں سے ایک بزرگ عورت اپرا مدھوک کو اپنے آگے آگے لئے داخل ہو رہی تھی۔

~~اپرا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھام رکھی تھی۔~~ بزرگ عورت کے ہاتھوں میں کھانے کے لوازمات سے بھری ہوئی ایک اور بڑی ٹرے تھی۔ اپرا کے قدم —— بہت دھیرے دھیرے اُٹھ رہے تھے۔ وہ بے حد خاموش نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بس ایک متوقع مایوسی سی کی جھلک تھی۔ جیسے وہ جانتی ہو کہ یہ لوگ بھی اُسے ناپسند کر کے واپس چلے جائیں گے۔

اپرا مدھوک نے ذرا بھی میک اپ نہیں کر رکھا تھا۔ اُس نے بال بھی نہیں سنوارے تھے۔ ایک لمبی کھلی کھلی سی چوٹی اُس کی پیٹھ پر پڑی تھی۔ اُس کا لباس بھی بے حد سادہ تھا —— شلوار قمیص اور کاندھوں پر آر پار پڑا ہوا دوپٹہ —— اور شکل و صورت بھی بس واجبی سی تھی۔

اِنّی نے —— ایک ہی نظر میں اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ لیا۔ پھر اُس نے سر گھما کر سریندر کی طرف دیکھا۔ سریندر اُس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر اپنی بہنوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اور اُس کی بہنیں اور اُن کے ممی و ڈیڈی ابھی تک اُس لڑکی کا جائزہ لے رہے تھے۔ حوالدار مدھوک اور اُس کی بیوی نے مہمانوں کی تیز نظروں کا احساس کر کے خود کو بظاہر لاتعلق سا بنا لیا تھا۔ لیکن ان دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ جیسے اُن کی بیٹی کا نہیں خود انہی کے بارے میں فیصلہ صادر کیا جانے والا ہو۔

اچانک حوالدار مدھوک نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کے ہاتھ سے ٹرے لے کر میز پر رکھ دی۔ بزرگ عورت اپنے ہاتھوں کی ٹرے اُسی میز پر رکھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ اپرا قدرے جھک کر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی۔ اُس کی چوٹی پھسل کر اُس کے آگے جھولنے لگی تھی۔

اچانک اِنّی نے اپنے پہلو میں چٹکی سی محسوس کی۔ سریندر آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کی رائے جاننا چاہ رہا تھا۔ اِنّی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک مرتبہ پھر اپرا مدھوک کی طرف دیکھا۔ یہ پرکھنے کے لئے کہ وہ اُس کے دوست کی بیوی کے طور پر کیسی رہے گی۔؟ لیکن اُس نے ذرا سا بھی فوری ردعمل ظاہر نہ کیا۔

اپرا چائے انڈیل چکی اور سب کے ہاتھ میں پیالیاں تھما چکی تو اچانک پنکی نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے اور مالتی کے بیچ میں بٹھا لیا۔ اور اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

اپرا مدھوک درمیانے قد کی بس گوارا سی شکل و صورت کی ہی لڑکی ہے۔ اُس کی عمر بھی اُس کے چہرے سے بول رہی ہے۔ جو کچھ زیادہ ہے۔ جبکہ سریندر اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ جس طرح پنکی اور مالتی خوبصورت ہیں۔ اِنّی نے اپنی رائے محفوظ رکھی تھی۔ لیکن سریندر کا بہنوئی کھنہ حوالدار مدھوک کے ساتھ بڑے اعتماد کے ساتھ یس سر! یس سر! کہتا ہوا کسی بات پر ہنس رہا تھا۔

چائے کا رسمی دور ختم ہو گیا ــــــ سب کی رسمی باتیں بھی اچانک ایک ہی نقطے پر پہنچ کر رک گئیں۔

لڑکی پسند ہے کہ نہیں!

اب ہر شخص بار بار نظریں اٹھا کر سریندر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس بات کا قطعی فیصلہ وہی کر سکتا ہے۔ بظاہر تو وہ خوش ہی نظر آ رہا ہے۔ اُس نے اپرا کے ساتھ ایک دو باتیں بھی کر لی ہیں۔ لیکن ابھی تک اُس نے اپنی پسند یا ناپسند کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا ہے۔

پھر وہ اپنے دوست کو وہاں سے اُٹھا کر بالکنی میں لے گیا۔ اُن کے پیچھے پنکی بھی لپک کر وہاں چلی گئی۔ اپرا مدھوک وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مالتی اور اس کے ماں باپ اور حوالدار اور اُس کی بیوی اور پریم کمار کھنہ خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جیسے وہ سب ایک بڑے ڈرامے کے چھوٹے چھوٹے کردار ہوں۔ کسی ہدایت کار کے کہنے پر اپنا اپنا پارٹ بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہوں۔

"کچھ تو بولو یار!" سریندر نے اِتی سے کہا۔

"میں کیا بولوں! فیصلہ تو تم ہی کو کرنا ہے۔" اندر کمار ملہوترا کا یہ مختصر سا جواب تھا۔

"بھیا نے تو فیصلہ آپ پر چھوڑ رکھا ہے ـــ" پنکی بولی۔

اِتی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ــــ کچھ لمحوں کے بعد بولا۔

"کسی لڑکی کو اس طرح ریجیکٹ کر دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن وہ تمہارا میچ ہے نہیں!"

یہ سن کر جیسے سریندر اور پنکی کو بڑا اطمینان مل گیا ہو۔

"یس سر!" اچانک وہاں پریم کار کھنہ بھی پہنچ گیا۔ وہ سریندر کی آنکھوں میں سیدھے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

سریندر نے دھیرے سے کہا ــــ جیجا جی، فوراً فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ گھر جا کر بتا سکوں گا۔"

تین

گھر جاکر سریندر نے صاف صاف بتا دیا ــــ "چونکہ میرے دوست کو اس کی ہونے والی بھابھی پسند نہیں آئی، اس لئے میں بھی اُسے قبول نہیں کر سکتا۔"

اس بات پر گھر میں ایک چھوٹا سا طوفان مچ گیا۔ کھنّہ اور اس کی بیوی مالتی دونوں کی خواہش تھی ــــ "چونکہ خاندان شریف ہے، لڑکی بھی ایسی بُری نہیں، اس لئے یہ رشتہ فوراً منظور کر لیا جائے۔"

وہ دونوں اسی لئے یہاں آئے تھے۔ لیکن سریندر کے ماں باپ نے سارا فیصلہ اپنے بیٹے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے۔

لیکن پنکی اپنے بھائی سریندر اور راِنی کی رائے کے ساتھ متفق تھی۔ بلکہ اُس نے سب کے سامنے اِن کی رائے کو ہی سراہا، جس پر کھنّہ سخت ناراض ہو اُٹھا۔ اُسے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ گھر کے ایک سنجیدہ مسئلے پر اُس کے بجائے ایک غیر شخص کی رائے کو اہمیت دی جائے۔ وہ اُسی وقت وہاں سے چلے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"میرا تو یہاں آنا ہی بیکار ہو گیا۔ کیوں آیا میں؟"

اُس کے اس طرح کڑھنے سے اس کی بیوی مالتی بھی دکھی ہوئی۔

کسی معاملے میں انسان بہت زیادہ توقع وابستہ کرلے اور اُس میں اُسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑ جائے تو اُس کی مایوسی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انی نے بھی ایک صدمہ سا محسوس کیا کہ اُس نے اپنی رائے کا اظہار کر کے سریندر کے بہنوئی اور اُس کی بہن کے دل میں کیوں بدمزگی پیدا کردی! یہ رشتہ طے ہو گیا ہوتا تو وہ دونوں اس وقت کتنے مسرور دکھائی دے رہے ہوتے! اُن کیلئے سریندر کی سگائی ایک اہم تقریب بن گئی ہوتی۔

اُس نے پنکی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور پوچھا،

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ اس رشتے کو منظور کر لینے کے لئے سریندر کو راضی کر لیں ؟"

پنکی چمک کر بولی ——— "جی نہیں، ہرگز نہیں ! اگر بھیا راضی بھی ہو گئے تو میں اس رشتے کی سخت مخالفت کروں گی ——— وہ لڑکی مجھے بھی پسند نہیں آئی ۔ جس طرح آپ کو پسند نہیں آئی ۔"

"لیکن آپ کے بہنوئی نے تو اسے اپنی عزت کا سوال بنا لیا ہے ! اور ممّی ڈیڈی بھی انہی کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں !"

"میں نہیں ڈرتی کسی سے بھی ——— چاہے کوئی بھی ہو ۔ جب ایک بار کہہ دیا میں یہ رشتہ منظور نہیں ہے تو پھر زور زبردستی کیوں ؟"

سریندر بھی اس رشتے کے بارے میں دوبارہ غور کرنے کے لئے بالکل راضی نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے بہنوئی کو اس بات کے لئے منانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اُس سے ناراض ہو کر آج ہی واپس نہ چلے جائیں ۔ ایک دو روز اور قیام کریں ۔ اُس نے پریم کمار کھنّہ کو اگلے روز کوالٹی میں لے جا کر ایک شاندار دعوت دینے کی بھی پیشکش کر دی ——— اور کہا ———

"یہ میری سگائی کی دعوت سے بھی بڑی ضیافت ہو گی ۔"

"بھاڑ میں جائے تمہاری ایسی ضیافت ——— مجھے بے وقوف مت بناؤ سالے صاحب ! میرے لئے تمہاری سگائی سے بڑھ کر کوئی بھی دوسری تقریب اتنی اہم نہیں ہو سکتی ۔ یہ سمجھ لو یس سر !"

یعنی اب اور کیا کہتے ہو ؟

سریندر اب لاجواب ہو گیا ۔ اُس نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے اِتّی کی طرف دیکھا ۔ اِتّی اور پنکی دونوں پاس پاس کھڑے بڑی سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے ۔ وہ ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی بے تکلفی سے دونوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ——— "اِس سے تو اچھا ہو گا کہ تم دونوں کی ہی سگائی کرا دوں ۔ کوئی تو خوشی والی بات ہو جائے آج ! پھر پتہ نہیں تم لوگ ایک دوسرے کو پسند کرو یا نہ کرو ۔ اپنا فیصلہ بتا سکو تو میں ابھی اعلان کر دیتا ہوں ۔ ممی ڈیڈی کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا ۔ شاید اسی سے ہمارے بہنوئی صاحب کا غصہ کافور ہو جائے !"

اُس نے دونوں کی آنکھوں میں ایک متوقع ردِ عمل تلاش کیا ۔ اِتّی اور پنکی اس کی تجویز سُن کر ہکّا بکّا رہ گئے ——— اِتّی کو یہ اُمید کبھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اُس کے سامنے اس قدر اچانک ایسی تجویز رکھ دی جائے گی ۔ اُس نے تو اس کے امکان کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا ۔ پنکی ایک خوبصورت، تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی ضرور ہے لیکن وہ چاہے بھی تو اُسے

کیا زبردستی اُٹھا کرلے جا سکتا ہے؟ جس طرح صدیوں پہلے کے شہزادے حسین و جمیل دوشیزاؤں کو اُٹھا کر گھوڑے پر اپنے آگے ڈال لیتے تھے اور بھگا لے جاتے تھے!

لیکن سریندر نے جو کچھ کہہ دیا تھا وہ اُس کی اندرونی پریشانی کا ایک فراریت سے بھرا ہوا اظہار محض تھا — کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بہت غور و خوض کر لینے کے بعد یہ بات زبان پر لے آتا۔

اِنّی نے اپنی پریشانی سے نجات پانے کے لئے پنکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی لئے ہوئے اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ انتظار کر رہی تھی کہ پہلے اِنّی اپنا ردعمل ظاہر کرے تو پھر وہ بھی کچھ کہے۔!

لیکن اُس نے اِنّی کو گھبرایا ہوا دیکھ کر سریندر سے کہا — "بھیّا، تم نے رشتے ناطوں کو اتنا آسان کیوں سمجھ لیا ہے۔ یہ گڈے گڑیا کا کھیل ہرگز نہیں ہے۔ اور ہاں اپنے بارے میں بھی اتنے کم ہمت مت بنو۔ جو فیصلہ ایک بار کر چکے ہو، اُسی پر قائم رہو۔ رہی پریم چچاجی کی بات تو اُن کی اور زیادہ پرواہ مت کرو۔ انہوں نے تمہارے لئے جو سوچا وہ بس سوچنے کی حد تک ہی ٹھیک تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ہم انہیں اپنی زندگی میں اور زیادہ دخل دینے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

یہ کہہ کر پنکی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سریندر اور اِنّی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"میں اپنی بہن کو اچھی طرح جانتا ہوں —" سریندر کا لہجہ پھر سے معذرت خواہانہ ہو گیا تھا

"اُس نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک ہی کہا ہے یار!" اِنّی نے اپنی ہی پریشانی سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کے لہجے سے لگتا تھا اُسے پنکی کے جواب سے ایک صدمہ سا یقیناً محسوس ہوا ہے۔ جواب کے اُس حصے سے جو اُس سے متعلق تھا۔ وہ بھلے ہی ایک بے جان گڈے کے طور پر اُس کے سامنے پیش کر دیا گیا ہو لیکن وہ اُس کے لئے اس طرح گڑیا بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا بالکونی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ حدِ نظر تک ہر گلی اور سڑک پانی میں ڈوبی ڈوبی سی تھی۔ لوگ پانی میں سے ہو کر آ جا رہے تھے۔ ایک خالی کشتی گومتی ندی کے بندھ کی طرف جا رہی تھی۔ گومتی ایک بڑے دریا کی طرح لگ رہی تھی۔ دریا کے اُس پار ڈالی گنج کا علاقہ تھا جس کے مکانوں کی اونچی برجیاں اور پیڑ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تو اُس نے سر بالکونی کے شیڈ سے باہر نکال کر منہ آسمان کی طرف اُٹھا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے اپنے چہرے پر بوندوں کا گرنا اچھا لگا۔۔۔۔۔

چار

ایک ہفتے تک لکھنؤ کے ایک چوتھائی حصے میں تباہی مچاکر گومتی ندی میں آئی ہوئی باڑھ اُتر گئی۔ اور اپنے پیچھے چھوڑ گئی —— بے پناہ کیچڑ، سیلن، بیماریاں اور گرے ہوئے یا گر پڑنے کے لئے تیار کئی پُرانے و بوسیدہ مکان۔ ! خوب تیز دھوپ نکل آئی تھی جو بوسیدہ و سیلن زدہ مکانات کے لئے بہت خطرناک تھی۔

اندر کمار ملہوترا نے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ اُسے لکھنؤ ڈویژن کے کاشتکاروں سے اناج خریدنے کے لئے ڈپٹی ڈائریکٹر لگایا گیا تھا۔ ربی اور خریف دونوں کے لئے۔ دفتر کا کام دیکھنے کے علاوہ اُسے کئی منڈیوں میں بھی گھومتا ہوگا۔ اس کام کے لئے فوڈ کارپوریشن نے اُسے کئی فیلڈ اسسٹنٹ بھی دے رکھے تھے۔ اناج کی خرید کے علاوہ —— —— اناج کی نقل و حرکت، ریاستی فوڈ کارپوریشن اور محکمہ ریلوے کے ٹرانسپورٹ افسروں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی ذمہ داری بھی اُس کے سپرد تھی۔

جس روز اس نے آفس جاکر —— اپنے عہدے کا چارج لیا، وہاں آدھے سے بھی کم اسٹاف ڈیوٹی پر حاضر تھا۔ جو لوگ سیلاب سے متاثر ہوئے تھے وہ کام پر نہیں آسکے تھے۔ جتنے لوگ آئے اُنہیں بھیگی ہوئی فائیلوں کو دھوپ میں پھیلا کر سکھانے کا کام سونپ دیا گیا۔ کتنی ہی فائیلیں پانی میں ڈوب کر اپنی سیاہی اور تحریر کھو چکی تھیں۔ بعض فائیلوں کے تو کاغذات ہی گل سڑ گئے تھے۔

اگلے روز اُس کا سارا اسٹاف اُس سے ملنے کے لئے اُس کے کیبین میں آیا۔ دس کلرک، چھ فیلڈ اسسٹنٹ اور ایک اسٹینو اور ایک چپراسی۔

وہاں اپرامدھوک کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

اس سیکشن میں وہی اُس کی اسٹینو تھی۔

اپرا بھی اُسے پہچان کر چپ سی رہ گئی۔ دونوں کی سمجھ میں فوراً کچھ نہ آسکا کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہیں؟ جس شخص کی وجہ سے سریندر کپور نے اُسے چند روز پہلے مسترد کر دیا تھا، اُس کے ساتھ رشتہ کرنا منظور نہیں کیا تھا وہی شخص اُس کے سامنے اُس کے پرانے باس کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

اُس کے ڈیڈی کے دوست کھنہ صاحب نے اُن کے گھر آکر اُنہیں اندر کمار ملہوترا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کھنہ اس بات کے لئے سخت خفا تھے کہ ایک باہر کے آدمی نے اُس کے سسرال ہی میں اُس کے وقار کو اس قدر مجروح کر دیا تھا۔ وہی باہر کا آدمی اب اپرا کے سامنے اُس کے آفس میں موجود تھا۔

دونوں کچھ لمحوں تک بالکل خاموش سے رہ گئے۔ اس نے باقی اسٹاف کو واپس بھیج دیا تھا۔ لیکن وہ اُس سے کچھ کہنے کے بجائے میز پر رکھے پیپر نائف کو بار بار الٹ پلٹ رہا تھا۔ اُس کی دھار کو بار بار اپنی انگلیوں پر محسوس کرتا اور اُسے پھر میز پر رکھ دیتا تھا۔

اپرا ملہوک اپنے ہاتھوں میں شارٹ ہینڈ کی نوٹ بک اور پنسل لئے اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ کبھی اُس کی طرف دیکھتی کبھی اندر کمار کے پیچھے دیوار پر ٹنگے فورڈ کارپوریشن کے گرین ریوولیوشن (ہرا انقلاب) کے کلنڈر کو گھورنے لگتی۔

"مس ملہوک بیٹھ جائیے"

آخر ملہوترا نے زبان کھولی۔

وہ اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اندر ملہوترا نے جیسے بڑی کوشش سے الفاظ جمع کئے۔

"مجھے بہت افسوس ہے، مس ملہوک۔ جو کچھ ہوا اُسے اب بھول جانے کی کوشش کرو۔ زندگی میں کبھی کبھی اس سے بھی بڑی اذیت برداشت کرنی پڑ جاتی ہے —— اور —— جس قسم کی سچویشن میں اس وقت ہم ایک دوسرے کے سامنے موجود ہیں، انسان کو اس سے بھی زیادہ پریشان کن سچویشن میں —— کبھی کبھی، پھنس جانا پڑتا ہے۔ کیا نہیں؟ میرا خیال ہے تم کافی سمجھدار ہو۔ تمہیں اس کا مقابلہ بڑے توازن سے کرنا چاہیئے!"

نوٹ بک پر جلدی جلدی ڈکٹیشن لینے کے انداز میں اچانک اپرا ملہوک نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ کہا۔

"سر کوئی آفیشل ورک ہو تو بتائیے ——"

اس نے اُسے کوئی جواب نہ دے سکا تو وہ اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

اس نے اب خود کو پہلے سے زیادہ مضحکہ خیز کیفیت میں مبتلا محسوس کیا۔ کتنی دیر تک وہ اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکائے بیٹھا رہا۔

وہ جب اپنے گھر میں ایک خاص مقصد کے تحت اُس کے اور دوسرے لوگوں کے سامنے آنے کے لئے مجبور کی گئی تھی اُس وقت وہ بالکل دوسری لڑکی معلوم ہوئی تھی۔ اب وہ ایک ورکنگ گرل کے رُوپ میں جب اُس کے سامنے آئی تھی وہ بالکل دوسری شخصیت بن چکی تھی۔ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی پُرکشش۔ یا قابلِ قبول ــــ! اس وقت اُس کے اندر ایک خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ اور وہ کسی پاسداری کی بھی طلبگار نہیں تھی۔ اُس کے سامنے ہوتے ہی شروع کے چند لمحوں تک وہ کسی قدر پریشان ضرور نظر آئی تھی۔ اُس کے بعد وہ مکمل طور پر ایک آزاد نسوانی شخصیت بن گئی تھی۔ شاید اُس کی کسی اندرونی اجتماعی قوت ہی نے اُسے ایسا بنا دیا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے اوپر ذرا سی بھی خفگی حاوی نہیں ــــ ہونے دی تھی۔ وہ خودداری اور حلیمی کی ایک مورت ہی بنی رہی تھی۔ جیسا کہ ایک عورت کو ہونا چاہیئے ــــ

یہ سوچ کر اندر کمار ملہوترا کو تھوڑی سی راحت ملی۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ اپرا مادھوک کا کوئی ایسا رُخ سامنے آجائے کہ جس کی مدد سے وہ اپنی خطا کے احساس میں سے باہر نکل سکے۔ اسی سے اُسے ایک اندرونی مضبوطی نصیب ہو سکتی تھی۔ اُسے یہاں اُس کا باس بن کر رہنا تھا ــــ لیکن پھر بھی اُس نے جیسے فرار ہو جانے کی بات سوچی۔ وہ اپنے ریجنل منیجر سے کہہ سکتا ہے کہ اُسے کام کرنے کے لئے کوئی دوسری ذمّہ داری سونپ دے۔ کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دے۔ تاکہ اپرا مادھوک اُس کے ماتحت کام نہ کر سکے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے اس خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ جو کچھ پیش آئے گا اُس کا سامنا کروں گا۔ یہ کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں تھا۔!

شام کو دفتر کے بند ہونے سے پندرہ منٹ پہلے پنکی اُس کے کیبن میں داخل ہوئی۔ چہرے پر مسرور اور باوقار کیفیت لئے ہونے کے ساتھ ساتھ خوش پوشی کا بھی ایک دلکش پیکر بنی ہوئی۔ اُس نے جینز کے اوپر ایک شاندار سفید ٹاپ پہن رکھا تھا جس نے اُس کے چہرے کے گیہواں رنگ کو اور روشن کر دیا تھا۔ اُس کے ترشے اور سٹ کرائے ہوئے بال اُس کے کندھوں پر بڑی دلبرائی سے لہرا رہے تھے۔

"ہیلو اِنّی! میں یونیورسٹی سے لوٹ رہی تھی۔ بس سے اچانک اُتر گئی۔ دیکھنے کے لئے کہ تم ابھی تک ہو یا چلے گئے!"

"اگر چلا گیا ہوتا ــــ!"

"تو میں بھی جھانک کر چلی جاتی۔"

"کہاں؟"

"اپنے گھر اور کہاں؟"

وہ اُسے دیکھ کر یک بیک خوش ہو اُٹھا تھا۔ اُس نے اُسے کُرسی پر بیٹھنے کا اشارا کیا مگر وہ اُس کی میز کے ہی کنارے پر بیٹھ گئی۔ بس ذرا سا ٹک کر۔ وہ اُس کے پوز کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ بولی — "تمہاری غلامی کب تک ختم ہوگی یہاں ؟"

"بس ختم ہی سمجھو — لیکن اب دوسری غلامی شروع ہو جائے گی۔ اپنے لئے تو مکتی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے !"

یہ کہہ کر اندر ہنس بھی دیا۔

"لیکن میں غلام پالنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اگر تمہارا اشارا میری طرف ہے تو !"

اندر نے محسوس کیا اُسے دیکھ کر وہ اچانک جس خوشی میں مغلوب ہو گیا تھا اُس کے اظہار کا سلسلہ دراز نہیں کرنا چاہیئے — اُس کا اُسے کوئی حق بھی نہیں ہے — اس لڑکی کی بے تکلفی میں دوستی کا جذبہ زیادہ ہے، رومانس کا کم کم۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر۔

اُس نے اپنی میز پر پھیلی ہوئی فائلیں سمیٹتے ہوئے کہا —

"پنکی، آج مجھے ایک بہت سخت الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ سنو گی ؟"

وہ اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ لیکن اُسے یہ شک بھی گذرا کہیں وہ اُس کی دلکشی سے مرعوب ہو کر کوئی نئی بات بلاوجہ تو نہیں چھیڑنا چاہتا ہے۔ جیسے ابھی اُس کی زبان پر دوسری غلامی کا ذکر بے اختیار آ گیا تھا۔

آج میں نے اس سیکشن کا چارج لیا تو معلوم ہوا، وہ لڑکی تو میری اسٹینو ہے — مدھوک صاحب کی بیٹی !"

"اوہ، نو !!" تعجب سے پنکی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اُس نے گردن گھما کر کیبن کے شیشے کی دیوار کے اُس پار دیکھا۔ جس میں سے آفس کا ایک بڑا حصّہ دکھائی دیتا تھا۔ پانچ بج جانے کی وجہ سے اسٹاف کے لوگ کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر باہر جا رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ٹفن بکس تھے، کسی کے ہاتھ میں چھاتے اور رین کوٹ اور نیوز پیپر و میگزین وغیرہ۔ اُن میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ جو باہر جانے سے پہلے اپنا میک اپ وغیرہ ٹھیک کر رہی تھیں — پنکی کو اپرا مدھوک کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ شاید وہ پہلے ہی نکل کر جا چکی تھی۔

"اسے اپنے دفتر میں دیکھ کر مجھے بڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔"

"شرمندگی کس بات کی ؟" پنکی چہک کر بولی۔ "تمہیں اُس کا کونسا قرض چکانا ہے — ہوں !"

"سنو تو — میرا خیال ہے، سریندر کو خط لکھ کر پھر سے بلایا جائے۔ اس

بار اُسے یہ لڑکی اسی آفس میں دکھائی جائے۔ ماحول بدل جانے سے بہت فرق پڑجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اسے پسند کرلے۔"

"بھیّا کے لئے اب اس لڑکی کے بارے میں کچھ سوچنا بے کار ہے۔ سمجھے! وہ پکّا فیصلہ کر کے گئے تھے۔ اس کے ساتھ شادی نہیں کریں گے۔ لیکن تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟"

"یہ کام بن جائے تو میری ایک امبیریسمنٹ ختم ہو جائے گی۔"

"امبیریسمنٹ کیسی؟ اگر اُس سے تمہیں ایسی ہی ہمدردی ہے تو خود ہی اُس کے ساتھ کیوں نہیں شادی کر لیتے؟"

"کرلوں ہم ـــــ کیا واقعی؟" اندر نے اُس کی طرف شرارت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے کہا ـــــ "اگر وہ مجھے واقعی اچھی لگی ہوتی تو میں نے سریندر ہی کے لئے کیوں ناپسند کر دی ہوتی! لیکن اُس کو ناپسند کرتے وقت میں شاید یہی محسوس کر رہا تھا کہ وہ میرے ہی لئے سامنے لائی گئی ہے۔ اُس روز واقعی یہی ٹریجڈی ہوئی۔ میں اس احساس سے ابھی تک نجات نہیں پاسکا۔"

"اب چلوگے بھی یہاں سے یا کسی بیکار سی فلم جیسے ڈائیلاگ ہی بولتے رہوگے؟"

اندر کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ دیوار میں لگے شیشے میں سے جھانکا۔ سارا آفس خالی ہو چکا تھا۔ صرف ریجنل مینیجر اپنے کیبن میں ابھی تک موجود تھا۔ اور دو چپڑاسی بھی جو کیبن کے باہر بنچ پر بیٹھے بیڑیاں پھونک رہے تھے۔

"چلو ـــــ" اندر بولا۔

پنکی اُس سے آگے چلی۔ اُسی لمحے اندر ملہوترا کا پاس فاروقی بھی اپنے کیبن میں سے باہر نکل پڑا۔ وہ اپنے سامنے سے ایک سرو قد حسین و جمیل لڑکی کو جاتا ہوا دیکھ کر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ تب تک اندر بھی اُس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اُس نے اندر کو دیکھ کر پوچھا ـــــ "ملہوترا، تم جارہے ہو؟"

"جی سر! کوئی کام؟"

"نہیں، میں بھی اب جارہا ہوں۔" اُس نے پنکی کی طرف پھر نظر اُٹھائی تو اندر نے اُس سے تعارف کراتے ہوئے کہا ـــــ "میرے دوست کی چھوٹی بہن، پنکی کپور۔"

پنکی نے وہیں ـــــ کھڑے کھڑے ہی سر کو جھٹکا دے کر 'ہیلو' کہہ دیا۔

اور پھر اُن دونوں نے فاروقی کو پہلے باہر جانے کے لئے راستہ دیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا تو اندر اور پنکی بھی دھیرے دھیرے نیچے اُتر گئے۔ ایک ساتھ ـــــ قدم اُٹھاتے ہوئے۔ اور ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر ـــــ دیکھتے ہوئے۔

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پنکی کے پاس تھیلے میں رکھا ہوا گلابی رنگ کا رین کوٹ تھا۔ اِنّی کے اسکوٹر کی باسکٹ میں بھی اُس کا رین کوٹ موجود تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے رین کوٹ پہن لیئے ــــ پر کانوں تک ٹوپیاں بھی اوڑھ لیں۔ وہ گوکھلے مارگ سے سیدھے اشوک مارگ جاتے تو وہاں اُنہیں ابھی تک کہیں کہیں بھرا ہوا پانی اور کیچڑ کی پھسلن ملتی۔ ایک ہفتہ پہلے اس سڑک پر چھ چھ فٹ پانی بھر گیا تھا۔ اور وہاں کشتیاں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ اسی سیلاب کی وجہ سے گوکھلے مارگ پر بھی کئی کوٹھیوں اور دفتروں کی چار دیواریاں بیٹھ گئی تھیں۔

انہوں نے اندر ہی اندر چھوٹی چھوٹی تنگ سڑکوں اور گلیوں کا راستہ اختیار کیا۔

اِنّی بولا ــــ "کہاں چلیں ؟"

"ہمارے گھر۔"

"وہاں نہیں۔"

"کیوں ؟"

"کوئی خاص وجہ بھی نہیں۔ بس جی نہیں چاہتا۔"

"تو کہاں جانے کو جی چاہتا ہے ؟"

"یہ بھی نہیں جانتا۔"

"عجیب آدمی ہو !"

"کیا آدمی کو عجیب نہیں ہونا چاہیئے ؟"

"ہونا چاہیے۔ پر کبھی کبھی۔"

"تو سمجھ لو، آج وہی کبھی کبھی والا ہی دن ہے !"

پنکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اسکوٹر چلتا رہا۔ لوگ سر گھما گھما کر اندر کے پیچھے بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔

"آج جی چاہتا ہے، ایک دو لوگوں کو اسکوٹر کے نیچے کچل دوں !"

"کیوں، کیوں ؟ آج اتنے مرڈرس (MURDEROUS) موڈ میں کیوں ہو ؟"

"وہ تمہاری طرف اس طرح کھا جانے والی نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں ؟۔ اسی پر مجھے غصّہ آرہا ہے۔ !"

"دیکھنے دو ــــ تمہارا کیا بگاڑ لیتے ہیں ؟" اُس کے اندر خوشی کی ایک لہر سی اُٹھی۔

"اگر اُن میں سے کسی نے تمہیں واقعی چبا ڈالا تو ؟"

"ایسا کرنا مذاق تھوڑے ہی ہے ! میں اپنے ناخنوں سے اُس کا منہ نہیں نوچ لوں گی ؟"

آج پنکی کو اِنّی کے الفاظ سے ایک نیا اعتماد مل رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ یہ سب کہہ کر در اصل اُسے فلرٹ کر رہا ہے۔ اور وہ سب جانتے ہوئے بھی انجان سی بنی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی انسان کا بے سر پیر کی باتیں کرنے کو اچانک جی چاہ اُٹھتا ہے بمقصد یہ ہوتا ہے کہ بس ڈائیلاگ چلتا رہے۔ بیچ میں خاموشی کے لمحے حائل نہ ہونے پائیں۔

اُس نے پوچھا ـــــ "اچھا اِنّی، تمھاری طرف بھی تو کوئی اتنی دلچسپی سے ضرور دیکھتا ہوگا۔!"

"کون دیکھے گا۔ میرے جیسے جانور کی طرف؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں !!" ۔

"ہر جانور کی مادہ میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے ایک خاص خوشبو! اِس بات کو تو مانتے ہو نا!"

"ہوتی ہے۔ انسانوں میں یہ کشش عورت ذات میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اُس میں صبر بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے وہ کسی کے پیچھے پیچھے بھاگنے کے بجائے انتظار کرنا زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ شاید اس لئے کہ اُسے پورا یقین ہوتا ہے کہ اُس کے پیچھے پیچھے جتنے بھی مرد بھاگتے پھرتے ہیں، اُن میں کسی کا انتخاب وہ ایک روز اطمینان سے کر ہی لے گی۔"

"یہ بات تم ساری عورتوں کے بارے میں کیونکر کہہ سکتے ہو؟"

"سب کے بارے میں تو نہیں لیکن کچھ کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں جو تمہاری طرح انٹلیکچوئل ہوتی ہیں یا جن کی تم نمائندگی کرتی ہو!"

"اچھا روکو ـــــ روک لو یہاں گاڑی!" پنکی نے اچانک جوش میں بھر کر اُس کے دونوں کندھوں کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس طرح دبوچ لیا تھا جیسے اُسے آگے بڑھنے سے وہ خود ہی اسکوٹر کو بریک لگا رہی ہو!

"کیا ہوا؟" اِنّی نے گاڑی تو روک لی لیکن بڑی حیرت سے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "کچھ گر گیا ہے؟"

"نہیں ـــــ" وہ اُس کے اسکوٹر سے اُتر کر گلی کے برآمدے کی دو تین سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی سی ایک بند مکان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور وہاں جاتے ہی کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اِنّی کو بھی وہیں آجانے کے لئے بُلا لیا۔

وہ اسکوٹر کو ایک کنارے روک کر اُس کے پاس گیا تو پنکی نے دیوار پر لگی ایک نیم پلیٹ کی طرف اشارا کیا جس پر لکھا تھا۔

"پروفیسر گرجا شنکر باجپئی۔"
اُس نے پوچھا —— "یہ کون سا جانور ہے؟"
پنکی نے بڑی تیزی سے اُس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور دھیرے سے بولی —— "ذرا ادب سے بولو۔ وہ میرا گائیڈ ہے۔ اُسی کے انڈر ریسرچ کر رہی ہوں۔"
"لیکن گائیڈ ایک جانور نہیں ہو سکتا کیا؟" اِنّی نے اپنے منہ پر سے اُس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔
"میں کہتی ہوں، آہستہ بولو۔" اُس نے اِندر کا ہاتھ جھٹک کر کہا جو وہ ابھی تک اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔
اور اُسی وقت دروازہ کھل گیا —— ایک بلند قامت اور وجیہہ شخصیت اچانک نمودار ہو گئی۔ ترشی ہوئی کھچڑی سی داڑھی و مونچھیں، گھنے گھنے بال جو اُس کے کانوں تک اُترے ہوئے تھے اور اُس کے ہونٹوں پر ایک من موہنی مسکراہٹ تھی۔
"آؤ، آؤ کرونا کپور۔ تم آج اِدھر کیسے بھول پڑیں؟" بہت ہی بھاری آواز تھی اُس کی۔
"سر، آج کئی روز کے بعد یونیورسٹی کھلی تھی۔ لیکن آپ نہیں آئے۔ یہ بھی معلوم تھا، اس علاقے میں بڑا پانی بھر گیا تھا۔ آپ خیریت سے تو رہے؟"
"بالکل خیریت سے رہا —— وہ ہنستا ہوا بولا یاں بس نچلی دو سیڑھیوں تک ہی آ کر رُک گیا تھا —— میں نے پورا ایک ہفتہ کاغذ کی کشتیاں بنا بنا کر کھیلتے ہوئے گذارا ہے۔ میرے ساتھ گلی کے دوسرے بچے بھی کھیلتے تھے۔"
وہ پھر کھل کھلا کر ہنس پڑا —— "اندر آ جاؤ۔ تم دونوں اپنے رین کوٹ اُتار کر مجھے دیدو بھئی۔" اُس کی آواز میں بڑی گمبھیرتا تھی اور مٹھاس بھی۔
پنکی نے اندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "سر، یہ میرے بڑے بھائی کے بچپن کے دوست ہیں۔ اندر ملہوترا —— اب یہیں لکھنؤ میں آ گئے ہیں۔"
"اچھا اچھا!" اُس نے اپنے بہت مضبوط ہاتھوں میں اِندر کے دونوں ہاتھ لے لئے —— لاؤ یہ کوٹ مجھے دیدو۔"
پروفیسر باجپئی دونوں کے کوٹ لے کر اندر چلا گیا۔ انہیں ہینگر میں ڈال کر اندر وَنی برآمدے میں لٹکا دیا۔ اور واپس آ کر بولا۔
"میں تم دونوں کے لئے پہلے کافی بنا کر لے آتا ہوں —— بیٹھو ——"
"سر، آپ یہ تکلیف مت کیجئے —— یہاں اندر کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیجئے ——

کافی میں بنا کرے آتی ہوں۔"

"اچھا اچھا ـــــ تم ہی بنا کرے آؤ ـــ انڈے بھی اُبال لینا ـ فریج میں ہیں۔ اور کچھ بنواؤں؟" وہ اندر پر جھک کر بولا۔ "کرونا بہت اچھی لگ ہے۔ پتہ نہیں، آپ کو معلوم ہے یا نہیں۔ میں تو جانتا ہوں۔ کیونکہ کبھی کبھی نوٹس لینے کے لئے آجاتی ہے تو میری بڑی خدمت کرتی ہے۔ میرے نہ نہ کرنے کے باوجود ـــــ!"

وہ ہنستے ہنستے سامنے ایک دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔

اندر ملہوترا اُس کی شخصیت کے سحر سے نکلنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا اسکا ڈرائنگ روم تو بس برائے نام ہی تھا۔ اُس کا زیادہ تر حصّہ سنسکرت، ہندی، انگریزی اور فارسی کی کتابوں اور مخطوطوں ہی سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف ریک اور الماریاں تھیں۔ جو کتابیں الماریوں یا ریکوں میں جگہ نہ پا سکیں، وہ الماریوں پر ہی ایک بے ترتیب ڈھیر کی صورت میں جمع ہو گئی تھیں۔ یا پھر نیچے فرش پر بچھی ہوئی دری پر جس کے ایک کونے میں ایک چوڑا گدا پڑا تھا اور اُس پر دو موٹے موٹے گاؤ تکیئے۔ وہیں ایک لکھنے پڑھنے کی چوکی بھی دھری تھی جس پر کاغذ، پیپر ویٹ، پنسلوں و قلموں سے لبالب بھرا ہوا ایک منقش لکڑی کا پیالہ اور چوکی کے نیچے بڑے سلیقے سے سمیٹ کر رکھے ہوئے کچھ اخبارات۔

اندر ملہوترا کی نظر دیوار پر ٹنگے ہوئے کلاک اور ایک تصویر کی طرف بھی بے اختیار اُٹھ گئی۔ تصویر رام کی تھی۔ جس کے فریم پر پھولوں کا ایک ہار اٹکا ہوا تھا اور وہیں کہیں دیوار کے تڑخے ہوئے پلاسٹر میں جلی ہوئی اگر بتیوں کے کئی ٹکڑے پھنسے ہوئے تھے۔

"پروفیسر پاچیئی آپ کا گھر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، یہاں صرف دو ہی ہستیاں رہتی ہیں ـــــ بھگوان اور آپ!"

یہ سُن کر پروفیسر ہنس پڑا۔ "بھگوان تو ہر کہیں ہے۔ میرے حصّے میں جتنا آسکا ہے، اُسی سے میں مطمئن ہوں ـــــ اُسی کے آشیرواد سے میں معلوم شدہ تاریخ کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ـــ"

"آپ نے شاید بیٹی کو بھی ریسرچ کے لئے اپنی پسند کا کوئی موضوع دے رکھا ہے!"

"میری پسند کا ہی کیوں، کرونا کی اپنی خواہش تھی کہ وہ مہابھارت کے زمانے کے سماج کو دریافت کرے۔ جس پر تقریباً پانچ ہزار سال کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ اور یہ کام محض رواروی میں پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کے لئے تو ریسرچ کرنے والے کے اندر بہت کچھ تلاش کرنے کی ایک لگن ہونی چاہیئے۔"

اندر بولا۔ "اگر رشی ویاس نے مہابھارت اور رشی والمیک نے رامائن کے

لاکھوں شلوک منظوم نہ کئے ہوتے تو بھارت کے قدیم سماجی فکر کا پتہ لگایا جاسکتا تھا؟"
یقیناً بہت مشکل ہوتا۔ پھر بھی دوسرے ذرائع تو ہیں ہی ـــــ محکمہ آثار قدیمہ کھدائی کے کام میں برسوں سے لگے ہوئے ماہرین اور سینہ بہ سینہ چلی آنے والی لوک کتھائیں اور لوک گیت وغیرہ۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ ہم قدیم ایپکس (EPICS) کے ناموں سے واقف نہ ہوتے۔"
پروفیسر گرجا شنکر باجپئی بڑے اطمینان سے پائپ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی بھی چھا گئی تھی۔ اور اندر کما ملہوترا جو تھوڑی دیر پہلے اُس کی شخصیت کی بے پناہ کشش سے بے حد مرعوب ہو گیا تھا، اب اُس کے اندر ایک اعتماد سا پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کا سبب یہ تھا کہ جس عالم کے سامنے وہ مؤدب ہو کر بیٹھا تھا وہ اُس کے علم میں اضافہ کرنے کے معاملے میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لے رہا تھا۔ کم سے کم ایک سرسری گفتگو میں اُسے ایک مکھی کی طرح اُڑا دینے کا قائل نہیں نظر آتا تھا۔
"پنڈت جی، بعض مغربی تاریخ داں ہمارے ایپکس کو عالمی سطح پر صدیوں پرانے انسانی سماج کی سطح پر تو دیکھتے اور پرکھتے ہی ہیں مگر وہ دونوں واقعات کے جو ان ایپکس میں بیان کئے گئے ہیں۔ زمانی فرق سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ رامائن کے واقعے کو مہا بھارت کے بعد کا واقعہ بتاتے ہیں۔ جبکہ انڈولوجی اس بات پر مُصر ہے کہ چونکہ رامائن کے ایک اہم کردار ہنومان کا ذکر مہا بھارت میں بھی موجود ہے۔ اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہا بھارت بعد کا واقعہ ہے۔"
"دیکھئے ملہوترا صاحب، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں گرنتھ پہلے پہل زبانی تخلیق کئے گئے اور اسی طرح یاد بھی رکھے گئے۔ کیونکہ اُس زمانے یا اُن زمانوں میں کاغذ، قلم اور سیاہی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ پھر بعد کے کئی دانشوروں نے اس میں اضافے بھی کئے اور اپنے اپنے وقت کے حکمرانوں سے ایسی کاوشوں کے لئے انعامات و اکرامات بھی حاصل کئے۔ یوں بات بنتی بھی رہی اور بدلتی بھی۔ ہو سکتا ہے مہا بھارت کی اوریجنل کتھا میں ہنومان کا ذکر شروع ہی سے نہ ہو اور بعد میں اُن کے کسی معتقد دانشور نے یہ اضافہ کر دیا ہو ـــ!"
"اور جناب یوروپین تاریخ داں تو بھیشم ہی کو مہا بھارت کا ہیرو قرار دیتے ہیں۔ نہ کہ یدھشٹر یا ارجن کو۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"
"وہ ٹھیک کہتے ہیں ـــ اس بارے میں ہمارا مت بھی وہی ہے ـــ بھیشم ہستنا پور کے راجا شانتنو کا بیٹا تھا۔ اگرچہ یہ بھی ایک شاعرانہ متھ ہے کہ شانتنو

نے پوتر ندی گنگا کی دیوی کو دیکھ لیا تو اُس پر عاشق ہو گیا اور اُس سے ساتھ شادی کرنے کا خواہشمند ہوا۔ گنگا نے اس ازدواجی سمبندھ کے لئے ایک شرط رکھی کہ وہ جو کچھ بھی کرے گی راجا اُس پر معترض نہیں ہوگا۔ ورنہ وہ اُسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ راجا شانتنو نے اُس کی شرط مان لی۔

"ایک ایک کر کے اُن کے سات بیٹے پیدا ہوئے اور گنگا انہیں ندی میں بہادیتی تھی۔ راجا اُسے روک نہیں سکتا تھا کیونکہ اُس کے کسی کام میں دخل انداز نہ ہونے کا وہ اُس سے قول دے چکا تھا۔ جب اُن کا آٹھواں پُتر ہوا اور گنگا دیوی نے اُسے بھی پانی میں بہادینا چاہا تو راجا نے اس کو روک دیا۔ بس! بہت ہو چکا۔ تم کیسی چڑیل ہو!!"

"اس پر ؟ دیوی نے یہ کہہ کر اُس کا مقصد پورا ہو چکا ہے اُسے چھوڑ کر دریا کے اندر واپس چلی گئی۔ سات پاک روحوں کو وہ پہلے ہی دریا کی گہرائیوں میں بھیج چکی تھی اس لئے کہ وہ اُس کے گناہ ؟ کا نتیجہ تھے۔ موت کے منہ سے بچ نکلنے والا یہی بچہ بھیشم تھا جو تاج و تخت کے وارث کے طور پر پرورش پاکر بالغ ہو گیا۔

"اُس کا باپ راجا شانتنو ایک بار پھر، ایک ماہی گیر کی بیٹی پر فدا ہو جاتا ہے جو بے حد سخت دل واقع ہوئی ہے — وہ اُس سے شادی کرنے سے پہلے اُس کے سامنے یہ شرطیں رکھتی ہے

"اُس کا اگر بیٹا پیدا ہوا تو وہی تخت و تاج کا وارث ہوگا۔"

"اُس کا بڑا بیٹا بھیشم قسم کھائے کہ وہ کبھی تخت و تاج کا دعویدار نہیں ہوگا۔

"بھیشم کو یہ عہد بھی کرنا ہوگا کہ وہ خود کبھی شادی نہیں کرے گا تا کہ مستقبل میں بھی اُس کی اولاد ہستناپور کی سلطنت کی وارث نہ بن سکے۔

"بھیشم چونکہ اپنے باپ کا ایک فرماں بردار بیٹا تھا وہ اپنی ہونے والی سوتیلی ماں کی شرطیں قبول کر لیتا ہے اُس کے باپ کی اس عورت کے ساتھ شادی ہو جاتی ہے۔ اُس کا باپ ایک شیر خوار بیٹا چھوڑ کر مر جاتا ہے جس کا بھیشم ؟ بن جاتا ہے — قائم مقام حکمران!

وہ دور کس قدر خوش حال اور پُرامن تھا اُس کا ذکر سنسکرت کے شلوکوں میں بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ لیکن میں آپ کو اس کا خلاصہ ترجمہ کر کے سناتا ہوں — سنیے،

اُن دنوں دھرتی بے انتہا فصلیں دیتی تھی اور اُن کی خوشبو سارے میں اُڑتی پھرتی تھی۔

اپنے موسم میں بادل پانی برساتے تھے اور پیڑ پھلوں و پھولوں سے لدے رہتے تھے۔

سارے جانور خوش رہتے، اور چرند و پرند خوشی سے کلکاریاں بھرتے اور چہچہاتے

پھرتے تھے۔ اور پھولوں سے ساری فضا معطّر رہتی تھی۔

شہروں اور قصبوں میں تاجروں اور سوداگروں اور ہر پیشہ کے کاریگروں و فنکاروں کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی۔

اور لوگ بہادر، تعلیم یافتہ، دیانت دار اور مسرور تھے۔

اور اُس زمانے میں چوروں و ڈاکوؤں کا دُور دور تک پتہ نہیں تھا۔ نہ گناہگاروں کا کوئی وجود تھا۔

بلکہ وہ نیکوکار، صداقت پسند واقع ہوئے تھے، قربانی دینے میں یقین رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے بھائی چارے اور محبت کو اہمیت دیتے تھے۔ اور وہ خوشحالی کے ہی ماحول میں پروان چڑھ رہے تھے۔

دریاؤں، جھیلوں، تالابوں اور ذخیروں اور جنگلوں میں جا کر شجاعت سے بھرپور مردانہ کھیل کھیلتے تھے۔

اور کوروؤں کی راجدھانی کورو (ہستناپور) میں سینکڑوں شاندار محل اور عمارتیں موجود تھیں جن کے کئی پھاٹک اور بادلوں کی طرح تاریک بے شمار محرابیں ہیں۔ اور یہ نگر بالکل امراوتی (کوئی بہشتی شہر) جیسا معلوم ہوتا تھا۔

یہ کہتے کہتے پروفیسر گرجاشنکر باجپئی ایک الماری میں سے ایک ضخیم کتاب 'امراوتی' نکال کر لے آیا اور اس کو اندر کمار کے سامنے کرتے ہوئے بولا —— "یہ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا"۔ اُسے مکمل کرنے میں مجھے دس سال لگے۔

"اس مثالی نگر، ہستناپور میں نہ تو کوئی کنجوس تھا نہ ہی کوئی بیوہ عورت —— کنوئیں اور جھیلیں پانی سے لبالب بھری رہتیں، ذخیرے درختوں سے، مکان زر و جواہرات سے اور سارے راج میں میلوں ٹھیلوں اور تقریبات کی فراوانی رہتی تھی۔ یہ سب بھیشم ہی کی وجہ سے تھا کہ اُس وقت یہ ملک صحیح معنوں میں سنہرے دَور کا نمونہ پیش کر سکا۔

"ہاں، ہاں واقعی وہ ایک گولڈن ایج، تھی —— عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے۔ اور اس کامیابی میں راجا کے ریجنٹ بھائی بھیشم اور راج ماتا ستیہ وتی کی سوجھ بوجھ کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن راجا بڑا ہو کر بادشاہوں جیسی صفات کا مالک نہ ثابت ہو سکا۔ اُس کے بیاہ کے لئے خود بھیشم ہی بنارس کے راجہ کی تین جوان راجکماریوں —— اَموا، اموبکا اور اموالیکا کو اغوا کر کے لے آیا۔ اُن کے حسن و جمال کے بارے میں ایک شلوک میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ نازک کمر دوشیزائیں تھیں جن کے کولہے بھرے بھرے و مخروطی تھے اور اُن کے کالے بال لمبے و گھنگھریالے تھے۔ لیکن اُن میں سے سب سے بڑی راجکماری نے جب یہ بتایا کہ وہ تو کسی اور کو دل

دے چکی ہے۔ تو اُسے بھیشم نے آزاد کر دیا۔ باقی دو عورتیں اپنے شوہر کو کوئی اولاد نہ دے سکیں کیونکہ وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا رہتا تھا جو اُس کی جان لے کر ہی ٹلا۔

"اس صورت حال میں تخت پر بیٹھنے والا کوئی رہ ہی نہیں گیا تھا۔ آئندہ بھی ایسی کوئی اُمید نہیں تھی۔ راج ماتا اور بھیشم دونوں ہم عمر تھے۔ راج ماتا نے اُس دور کی مشرقی روایات کے مطابق بھیشم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اب خود تخت و تاج سنبھال لے اور اپنے سوتیلے بھائی کی بیوہ سے ایک وارث بھی پیدا کرے۔ مگر اُس نے جو قسم کھا رکھی تھی وہ اُسے توڑنے پر راضی نہ ہوا۔ اُس نے کہا ــــ چاہے دھرتی اپنی خوشبو اگلنا بند کر دے، پانی اپنی نمی، روشنی اپنی چمک دمک حتیٰ کہ سورج اپنی گرمی پہنچانا بند کر دے اور چاند اپنی ٹھنڈک اور خلا اپنی اُس گونج کو بھی روک لے جو بیشمار ستاروں کے گھومنے سے پیدا ہوتی رہتی ہے تب بھی میں سچائی کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ امویکا کے لئے ایک اور شوہر تلاش کر لیا گیا لیکن اُس نے اُس آدمی کا منہ تک دیکھنا گوارا نہ کیا اور ہر دم اپنی آنکھوں کو بند رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہوا وہ جنم سے اندھا تھا۔ یہ دھرت راشٹر تھا۔ دوسری عورت امبالیکا سے پانڈو پیدا ہوا تھا جسے اس لئے تخت پر بٹھا دیا گیا کہ اُس کا بڑا بھائی اندھا تھا۔

بھیشم کے تجرّد کی وجہ سے ہی ہستناپور کے تخت کے لئے آگے چل کر رسّہ کشی کے وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو مہابھارت جیسی عظیم جنگ پر ختم ہوتے ہیں۔ دھرت راشٹر کو سو بیٹے ہوئے جن میں سب سے بڑا دریودھن تھا اور پانڈو کے پانچ بیٹے ہوئے جو یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکُل اور سہدیو کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ سب کتھا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ لیکن بھیشم کے المیہ کا ایک حصّہ یہ بھی ہے کہ سب سے بڑی راجکماری امبا کو جسے اُس نے آزاد کر دیا تھا اُس کے عاشق نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اب اُس پر اُس کو اغوا کر کے لے جانے والے کا حق زیادہ ہے۔ امبا بھیشم کے پاس واپس آ کر اُس کی پناہ کی طالب ہوتی ہے۔ لیکن بھیشم تا عمر شادی نہ کرنے کی قسم پر اب بھی قائم ہے۔ اُس کے انکار کر دینے پر امبا گھور تپ کرتی ہے۔ اور اپنے دیوتا سے بردان مانگتی ہے کہ وہ اگلے جنم میں شکنڈی بن کر بھیشم کی موت کا کارن بن سکے۔ اُس کی دعا قبول ہوتی ہے ــــ مہابھارت کی جنگ میں تم نے پڑھا ہوگا کہ بھیشم جس کے اختیار میں یہ تھا کہ وہ جب چاہے گا موت کو بُلا سکے گا ــــ اُسی شکنڈی کی وجہ سے جو آدھا مرد ہے اور آدھی عورت، اور اُسے میدانِ جنگ میں فریب سے بھیشم کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اُس پر تیر نہ چلا سکے۔ ارجن اُس پر پے در پے وار کر کے سخت زخمی کر دیتا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں تیروں کے بستر پر لیٹے لیٹے ہی بقیہ جنگ کو دیکھتا

رہتا ہے اور جب جنگ ختم ہو جاتی ہے تو وہ موت کو بلا کر اُس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے ـــــ اس عظیم رزمیے کا ہیرو در حقیقت بھیشم ہی ہے۔"

پنکی چائے، انڈے اور پکوڑے بنا کر لے آئی تو پروفیسر باجپئی چہک کر بولا ـــــ "شاگرد ہو تو کرونا کپور جیسی! ایسی سنجیدہ گفتگو کے بعد گرم گرم چائے مل جائے تو ساری تھکن آناً فاناً دُور ہو جاتی ہے۔"

اندر کو بھی ایسے میں چائے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے شکر گزار آنکھوں سے پنکی کی طرف دیکھا جو ایک چھوٹے سے تولئے سے اپنے چہرے اور گردن پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اُن لمحوں میں اندر کو صرف چائے کے گھونٹ ہی فرحت بخش نہیں معلوم ہو رہے تھے بلکہ وہاں پنکی کی موجودگی بھی ایک بے پایاں مسرت دے رہی تھی۔ اُس نے پروفیسر باجپئی کی طرف دیکھا ـــــ وہ بھی پنکی کی موجودگی سے بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اور وہ اُسے بھیشم ہی کی مانند بلند قامت، پُر وقار، طاقت ور اور ایک سچا اور کھرا انسان معلوم ہو رہا تھا۔ ......

اندر کمار اپنی اسٹینو کو دن میں کئی کئی بار اپنے کیبن میں بلا لیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا، اس طرح وہ خود کو متوازن کر سکے گا۔ اور اپرا مدھوک کو بھی بار بار اُس کے پاس آنے سے اپنی افسردگی پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔ اگرچہ فائیلوں کا کام اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اندر کمار اُسے ڈکٹیشن دینے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ نکال لیتا تھا۔ ڈکٹیشن دیتے وقت وہ کافی غور و خوض سے کام لیتا۔ ایک ایک لفظ اور جملوں کی نشست و برخاست اور گرامر کا خاص خیال رکھنے کے لئے وہ بار بار لکھواتا اور اپنی غلطی کے لئے بڑی خوشدلی سے معذرت خواہ بھی ہوتا تھا۔ اس دوران میں پہلے تو اپرا مدھوک اپنی نوٹ بک اور پنسل کی نوک پر نظریں ٹکائے بیٹھی رہتی تھی۔ لیکن جب اُسے یہ احساس ہونے لگا کہ ملہوترا صاحب محض اُس کو سامنے بٹھائے رکھنے کے لئے جان بوجھ کر ڈکٹیشن دینے میں دیر لگاتے ہیں تو اُن کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھنے لگتی تھی۔ اگرچہ اندر کمار اُس کی طرف سیدھی نظر سے بہت کم ہی دیکھتے تھے۔ یا تو فائیل پر نظریں گڑائے رہتے یا کیبن کی چھت کو گھورنے لگتے تھے۔

اپرا مدھوک بہت ہی تیز فہم اسٹینو تھی۔ اپنے کام میں پوری طرح ماہر تھی۔ اُس کے ٹائپ کئے ہوئے کام میں شاذ و نادر ہی کوئی غلطی نکلتی تھی۔ اپنے باس کے سامنے بار بار آتے رہنے کی وجہ سے اُس کے اندر اب پہلی سی جھجک بھی نہیں نظر آتی تھی۔ اُس واقعہ نے اُس کے اندر جو مایوسی پیدا کر دی تھی اُس کا تاثر بھی کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے معمول میں واپس آ چکی تھی۔ جس طرح کوئی بھی چاق و چوبند اسٹینو گرل ہوتی ہے۔ غیر شادی شدہ، تعلیم یافتہ، خوددار، اپنی اہمیت کے بارے میں پوری طرح حسّاس اور باخبر۔

یہ دیکھ کر اندر کمار کو بھی بڑا اطمینان ملا۔ جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اُس نے کسی دوسرے سیکشن میں اپنی ٹرانسفر نہیں کرالی تھی۔ جیسا کہ شروع شروع میں اُس نے پریشان ہوکر ۔۔۔ سوچا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں اپرا کے نارمل رویے کو پسند کیا۔ انسان ایک دوسرے سے کسی وجہ سے مایوس ہو کر بھی ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اپنے تعلقات کو چاہے وہ سماجی ہوں یا دفتری برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کے لئے بہت ضبط بھی کرنا پڑتا ہے۔ چپکے چپکے بہت کچھ سہنا پڑجاتا ہے۔

اِنی کو اپرا کی ظاہرہ شکل وصورت میں بھی ایک ۔۔۔ نمایاں تبدیلی ہوئی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے اپنے بال باب کرائے تھے۔ اب وہ پہلے کی طرح بڑا سا جوڑا نہیں بنا کر آتی تھی نہ ہی اپنے لمبے بالوں کی چوٹی لہراتی ہوئی۔ بلکہ اب اُس کے سیاہ چمکیلے بال اُس کے چہرے کے اردگرد جھولتے رہتے تھے۔ اپنے لباس کی طرف اُس نے خاص توجہ دینی شروع کردی تھی۔ اور رنگوں کے انتخاب کی وجہ سے بڑی دلکش نظر آتی تھی۔ قمیض، شلوار، ساڑی، بلاوز، چوڑی دار پاجامہ اور کرتا اور جینز، بیگیز اور طرح طرح کے ٹاپ ۔ جو کچھ بھی وہ پہن لیتی وہ اس کے متناسب جسم پر خوب سجتا تھا۔

اندر نے اُس کے اندر یہ حیرتناک انقلاب دیکھا تو اُس کا جی ایک بار چاہا کہ سریندر کپور کو بُلا کر اُسے دکھادے۔ چاہے اس بات کی مخالفت پنکی کتنی ہی کیوں نہ کرے۔ اِندر کو پورا یقین تھا کہ اس بار سریندر اُسے ناپسند نہیں کرسکے گا۔ وقت اور حالات انسان کے چہرے پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی تو یہ اُسے بالکل جھلسا دیتے ہیں۔ بے حد بے رونق بنادیتے ہیں اور کبھی کبھی اُسے اچانک پہلے سے کہیں زیادہ ملائمت اور خوشنمائی بخش دیتے ہیں کوئی شخص ہمیشہ اور ہر وقت نہ بدصورت رہتا ہے نہ ہی خوبصورت۔

اب تو آفس کے لوگ بھی اپرا کی طرف خاصی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اُس کے ساتھ ہمکلام ہونے کا موقعہ تلاش کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اپرا مدھوک اگرچہ پہلے سے زیادہ خوش مزاج بن گئی تھی لیکن وہ کسی کو لفٹ نہیں دیتی تھی۔ کوئی شائستگی کی حدود سے بڑھنے لگتا تو وہ اپنے چہرے پر ایسا وقار اور ایسی سنجیدگی پیدا کرلیتی کہ مخاطب بغلیں جھانکتا رہ جاتا تھا۔

اندر کے اندر ایک تجسّس سا پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اُس کی طرف ہر وقت ٹٹولتی ہوئی نظروں سے تاکتا اور سوچتا تھا ۔۔۔ اپرا سے کوئی محبت تو نہیں

کرنے لگا ہے! ہو سکتا ہے، اُس کے اندر یہ تبدیلی اُس کے کسی چاہنے والے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہو! جب کوئی کسی لڑکی کا خیال رکھتا ہے اور اُس کے اندر حفاظت کا بھی احساس پیدا کر دیتا ہے تو اس لڑکی کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں مشرقی یا مغربی معاشرے کا سوال کم کم ہے۔ عورت کی جنس ہی ایسی ہے کہ وہ ہمیشہ مضبوط بانہوں اور اچھے سلوک کی ــــ متلاشی رہتی ہے۔ ہمیشہ منتظر۔ اُسے جیسے ہی یہ سب مل جاتا ہے یا مل جانے کا یقین ہو جاتا ہے تو اس کے اندر کی خود اعتمادی۔ جیسے اچانک کروٹ بدل کر ایک نئی کشش اور نئی مضبوطی بن جاتی ہے۔

لیکن اندر نے کسی ایسے شخص کو اپرا مدھوک سے ملنے کے لئے دفتر میں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی کوئی اُسے بار بار فون کر کے بلاتا تھا۔ سوائے اُس کے ڈیڈی مدھوک کے جو کبھی کبھی اُس سے اس کی بیٹی سے بات کرا دینے کے لئے فون پر درخواست کرتا تھا۔

ایک روز مدھوک صاحب نے اپرا سے وقت سے پہلے ہی چھٹی لے کر گھر چلے آنے کے لئے کہا۔ اندر اُس وقت اپنی فائیل پر جھکا ہوا اپرا کی گفتگو سُن رہا تھا۔

"نہیں ڈیڈی، میں نہیں آ سکتی۔"

"بتایئے نا، ایسا کونسا ضروری کام آپڑا ہے اچانک!"

"نہیں ڈیڈی، آج کام بہت زیادہ ہے۔ میں کام چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔"

"نہیں، میں جانتی ہوں، سَر مجھے چھٹی نہیں دیں گے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں ڈیڈی! اچھا اچھا، آپ خود ہی اُن سے بات کر کے دیکھ لیجئے۔"

اپرا نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اِن سے بمنّت مگر دھیرے سے کہا۔

"سر، آپ ڈیڈی سے یہی کہیے، آج آفس میں کام بہت زیادہ ہے۔ چھٹی ہرگز نہیں مل سکتی۔ پلیز!"

اُس نے اِن کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ وہ پگھل کر رہ گیا۔ حالانکہ دفتر میں کام اتنا زیادہ نہیں تھا۔ وہ چاہتی تو اِن اُسے بخوشی جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ لیکن اُسے اپرا کی بات رکھنے کے لئے اُس کے ڈیڈی سے جھوٹ ــــ کہنا پڑا ــــ اگرچہ اُسے اس بات پر سخت افسوس بھی ہوا ــــ

مدھوک صاحب نے یقیناً کسی بہت ضروری سبب سے اپنی بیٹی کو گھر چلے آنے کے لئے کہا ہوگا۔

اُس نے فون رکھ کر اپرا سے پوچھا۔

"ایسی کونسی بات تھی کہ تم گھر نہیں جانا چاہتی ہو؟"

اپرا کے چہرے پر کئی رنگ ایک کے بعد ایک آئے اور چلے گئے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر بولی ـــ

"سر، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے مجھے ایک بہت بڑی پریشانی سے بچالیا۔ میں دراصل اس روز روز کے ناٹک سے تنگ آچکی ہوں۔ سر، مجھے بار بار اس طرح کا ایکٹنگ کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کیا میں نہیں جانتی کہ ڈیڈی ہر ہفتہ، دس روز کے بعد کیوں نئے نئے لوگوں کو گھر پر انوائٹ کرلیتے ہیں۔ مجھے ہر بار ان کے سامنے ایسے معصوم بن کر جانا پڑتا ہے۔ جیسے میرے ساتھ یہ پہلی بار ہو رہا ہو! یہ سب مجھے بہت بھونڈا لگتا ہے!"

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ منٹ تک سر جھکائے سسکتی رہی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاکر ـــ پھر جب ذرا متوازن ہوئی تو بولی۔

"ڈیڈی سمجھتے ہیں، میں کوئی بکاؤ مال ہوں۔ جب تک وہ لوگوں کو بار بار دکھائیں گے نہیں، کوئی مجھے خریدنے کے لئے آگے نہیں بڑھے گا۔ جبکہ حقیقت بالکل دوسری ہے۔ پہلے اپنا مال دکھایئے کسی کو پسند آجائے تو اُس کے حوالے کردینے کے ساتھ ساتھ بہت سامنہ مانگا جہیز بھی دیجئے ـــ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ میں ایسے ہر آدمی سے نفرت کرتی ہوں۔ اپنے ڈیڈی سے بھی ـ وہ میرے جذبات کو کیوں نہیں سمجھتے؟ آخر میں بھی ایک انسان ہوں!"

اِنّی پر جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر اُس کی طرف بڑی خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اب تک اُس کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی دیکھ کر جو قیافہ لگایا تھا۔ وہ سراسر غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ کسی کے لئے بھی بن سنور کر نہیں رہنے لگی تھی۔ اگر واقعی کوئی ایسا شخص نہیں تھا تو یہ وہی تھی۔ وہ خود جس نے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ محض اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے۔

اِنّی نے بولنے کے لئے کچھ الفاظ جمع کرکے کہا ـــ

"بدقسمتی سے ہمارے سماج کا ڈھانچہ ابھی تک ویسے کا ویسا ہے۔ جیسا صدیوں پہلے تھا۔ کوئی بھی خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کررہا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو سماج اتنی آسانی سے نہیں بدلے گا۔ لیکن ماں باپ بیچارے کیا کریں؟ وہ بھی اسی طرح سوچنے پر مجبور ہیں، جس طرح دوسرے سوچتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ـــ"

وہ آگے کہتے کہتے رُک گیا۔ اُسے خود اپنے الفاظ کھوکھلے سے لگے ۔ بے حد بناوٹی ۔ مکر و فریب سے بھرے ہوئے ۔ اُس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اُسے دو کافی لے آنے کے لئے کہہ کر جیسے سوچنے کے لئے کچھ اور لمحے قرض لے لئے۔

لیکن اب اُس کے لئے اپرا کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ وہ اُس کی مدد کرنا بھی چاہتا تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے جو رشتہ طے ہونے جا رہا تھا وہ محض اُسی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اگر اُس نے بے سوچے سمجھے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا ہوتا تو شاید اس وقت اپرا کی مانگ میں سیندور بھرا ہوتا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے اپرا کے سامنے سماج کے ڈھانچے کے بارے میں جو بے مقصد لیکچر جھاڑا تھا، اُس پر وہ ابھی تک ندامت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس قدر روشن خیال ہوتے ہوئے بھی بعض لمحوں میں اتنا احمق کیوں بن جاتا ہے! سماج کے آگے ہتھیار ڈال کر اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کی صدیوں پرانی روایات کو توڑنے کے لئے جس طرح سمجھوتا کافی نہیں ہے، اسی طرح اس کے خلاف خاموش برہمی یا کڑھن بھی ہرگز کافی نہیں ہو گی۔ مجبور ماں باپ کی لڑکیوں کو بھی اُنہیں دیکھنے کے لئے آنے والوں کے بارے میں اُن کے منہ پر بولنے کا حق ملنا چاہیئے۔ وہ خود اُن کے لئے بنے ہوئے اُمیدواروں سے ویسے ہی سوالات پوچھیں جس طرح کے سوالات وہ پوچھتے ہیں۔

جہیز کے مسئلے پر تو انہیں صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر آئیں گی — بھلے ہی وہ غیر شادی شدہ رہ جائیں۔ سماج کو اگر زندہ رہنا ہے تو اُسے یہ کڑوا گھونٹ بھی ضرور پینا ہو گا۔ ایک کرائسیس سے نکلنے کے لیے ایک اور کرائسیس کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا پڑے گا۔ اسی میں سے کوئی راہِ نجات ملے گی۔

اس طرح سوچتے سوچتے اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں اچانک بجلی سی چمکی اور پھر اُس نے پنکی کا جوانی اور ذہانت سے چمکتا ہوا مسرور چہرہ دیکھا — اور وہ ایک انجانی خوشی سے مغلوب ہو کر اپرا کے دکھ کو بھی بھول گیا۔ جو اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کافی کا پیالہ بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی —

"سر، کافی!"

"مس مدھوک، تم جب شام کو گھر پہنچو گی تو وہ لوگ انتظار نہیں کر رہے ہوں گے؟ جیسا کہ تم نے کہا ہے۔ تمہارے ڈیڈی نے پھر ایک ناٹک رچایا ہے۔!"

"جی، میں جانتی ہوں - یہی سوچ سوچ کر تو میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

"مدھوک صاحب، شاید انہیں جانے نہیں دیں گے! بہتر تو یہی ہے کہ تم ابھی چلی جاؤ - یا تو ایک بار پھر برداشت کر لو یا پھر وہ سب ہمت کر کے اُن کے منہ پہ کہہ دو، جو تمہارے دل میں ہے!"

ایرا نے بڑی حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"جو بات تمہارے ڈیڈی نہیں کہتے وہ سب تم ہی کہہ دو۔ صاف صاف! کیا تمہارے اندر اتنی ہمت نہیں ہے؟"

ایرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی جلدی کافی کے گھونٹ نگل کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر باہر اپنی ٹیبل پر جا بیٹھی۔ پہلے کی طرح اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اِنّی اُس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا اور ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سنتا رہا۔

آج اُس نے جان بوجھ کر بہت زیادہ کام کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ دیر تک مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ایک طرح کی اذیت پسندی تھی۔

جب وہ سارا کام ختم کر چکی تو — نوٹ بک اور پنسل لیے پھر اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"سر، کچھ اور ڈکٹیشن دیجیے گا۔"

"پہلے دیا ہوا کام ختم ہو گیا؟" اِنّی نے اُس کی طرف بڑی رحمدلی سے دیکھا۔

"جی، سر!" آپ کے پاس دو فائلیں رکھی ہیں۔ آپ نے کہا تھا اُس کی پریسیز ٹائپ کرنا ہیں۔"

"ہاں، کہا تو تھا!" جیسے اُس نے یاد کرتے ہوئے کہا — یہ کہہ کر وہ فائلیں الٹنے پلٹنے لگا۔

"آج مجھے مارکیٹ جانا ہے۔ جونیر چیمبرز کے سیکرٹری کے ساتھ ایک اپوائنٹمنٹ ہے نا!"

وہ خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

آج اُسے بنکی سے بھی سلور اوک، میں ملنا ہے، ٹھیک پانچ بجے۔ وہ ایک منٹ کی بھی تاخیر برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اُس کے مزاج سے واقف ہو چکا ہے۔

اُس نے جلدی جلدی دونوں فائلوں پر ایک نظر ڈال کر انہیں اُس کے حوالے کر دیا۔

"دونوں کی پریسیز بڑی احتیاط سے ٹائپ کر دینا۔ کل ریجنل منیجر انہیں لیکر دہلی جائیں گے۔"

اِنّی نے آفس میں سے نکلتے نکلتے دیکھا، ایرا مدھوک بڑے اطمینان سے ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ ۔ ۔ ۔

چھ/۶

جونیئر چیمبرز کا سیکریٹری ماتھر بہت ہی بور شخص تھا۔ اُس نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ پوری شام اُس کے گھر پر گذارے جہاں اُس نے اپنے کچھ خاص دوستوں کو بھی اُس سے متعارف کرانے کے لئے مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں شراب و کباب کا بھی اہتمام تھا جس کا ذکر اندؔر نے ماتھر کی باتوں سے سُن لیا۔ جب وہ دوسرے لوگوں سے فون پر محوِ گفتگو تھا۔

لیکن اُس نے تو پنکی سے ملنے کے لئے پہلے سے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ وہ پنکی کو ایسی محفل میں ساتھ لے کر نہیں جاتا تھا۔ اُسے ایسی محفلوں کے بارے میں کافی تجربہ تھا۔ تاجر لوگ سرکاری افسروں کے قریب ہونے کے لئے ایسے ہی موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں ــــ تاکہ اُن سے گھل مل جائیں۔ ایسے لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس کلچر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ اُن کی کل جمع پونجی لطیفے ہوتے ہیں۔ گھسے پٹے اور بے ہودہ لطیفے نو دو دولتیوں اور چھوٹے افسروں کا ایک طبقہ اپنے اسی سبھاؤ پر فخر کرتا ہے۔ وہ ایک ہی ملاقات کے بعد اُن افسروں، جو ان کے کام آسکتے ہوں کی کوٹھی پر ٹڑہی بے تکلفی سے جا پہنچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو فون پر ملنے کے لئے وقت دینے سے انکار کیا جائے تو اسے بڑے اختیار سے سوسائٹی کے آداب کے خلاف قرار دے دیتے ہیں۔

اندر کمار ملہوترا نے اپنی فرینڈ پنکی کے ساتھ پہلے سے طے شدہ اپوائنٹمنٹ کی وجہ سے ماتھر سے معذرت چاہی تو اس نے اور زیادہ خوش ہو کر کہا۔

"نو پرابلم ــــ یہ تو اور بھی اچھا ہوگا کہ وہ بھی اس دعوت میں شریک ہو جائے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں گی وہیں جا کر انہیں پک اپ کر لیں گے ــــ میرے یہاں لیڈیز بھی انوائیٹڈ ہیں۔ آپ دیکھئے گا، بہت ہی خوشگوار ماحول ہوگا۔"

اندر کے لئے اب انکار کرتے نہ بن پڑا۔ اگرچہ وہ پنکی سے اب بھی ڈر رہا تھا کہ

اُس نے اُس سے پوچھے بغیر یہ دعوت کیوں قبول کرلی۔ اگر وہ جانا چاہتا ہے تو چلا جائے۔ اپنے ساتھ ایک اجنبی ماحول میں اُسے کیوں زبردستی لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن جب پنکی کو جاکر بتایا گیا کہ ماتھر نے اُسے بھی دعوت دی ہے تو اُس نے کسی قسم کی پس و پیش نہ دکھائی۔ لیکن اُس کا یہ رویّہ اِنّی کو بھی خوش کرنے والا تھا۔ اور وہ اس لئے بھی سرور دکھائی دی کہ اِنّی کی اجنبیت اس شہر میں ختم ہوتی جارہی تھی۔ بہت سے لوگ اُسے جانتے ہیں اور اُس کے دوستوں کا حلقہ رفتہ رفتہ وسیع ہونے لگا ہے۔

ماتھر کی بیٹی گڈّی نے اسی کے ساتھ ایم اے کیا تھا۔ جس کی اب شادی ہوچکی تھی۔ ماتھر نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور اُسے دیکھتے ہی کہہ اُٹھا تھا —— "یہ تو ہماری بیٹی ہے۔"

آگے بڑھ کر اُسے گلے سے بھی لگا لیا تھا۔

ماتھر کی وزیر حسن روڈ والی کوٹھی میں اُن کے پہنچتے ہی مہمان آنے شروع ہوگئے۔ لاہور ٹائرز والے گیان سنگھ اور ان کی بیوی سونیا جو بہت ہی بیش قیمت جیولری پہن کر آئی تھی۔

بندوقوں کا تاجر اکرام چوہدری اور اُس کی داشتہ عطیہ جو ریڈیو کے لئے اسکرپٹ رائٹنگ کرتی تھی۔

انکم ٹیکس افسر رنجیت سنہا اور اُس کی دلکش بیوی کرونا جس کے تعلقات صوبائی پولٹیکل علقوں میں بہت گہرے تھے اور وہ کسی بھی منسٹر سے کیسا بھی کام ہو چٹکیوں میں کرالاتی تھی۔ اس کی شخصیت کی اس دلکشی کی وجہ سے اس کے بارے میں دو ایک اسکینڈل بہت مشہور تھے۔

کرونا سنہا کے ساتھ اُس کی چھوٹی بہن سشما جندل بھی آئی تھی جس نے اپنے لمبے بال کھول رکھے تھے۔ وہ بھات کھنڈے میوزک یونیورسٹی کی تربیت یافتہ کلاسیکل سنگر تھی۔

اُس محفل میں بن بلائے آنے والا سائیکلوں کے رِم بنانے والی فیکٹری کا مالک گپتا تھا جو اپنے ساتھ اپنی نئی معشوقہ دیتو پنڈت کو لے کر آیا تھا۔ دیتو پنڈت لکھنؤ اسٹیج کی ایک مشہور آرٹسٹ تھی۔ ٹی وی اور ریڈیو کے ڈراموں کی وجہ سے بھی وہ بہت مقبول ہوئی تھی۔ اُس نے حال ہی میں اپنے پتی سے طلاق لے لی تھی۔ گپتا کے بارے میں یہ بات ہر ایک کو معلوم تھی کہ وہ ناآسودہ اور ناکام جوان آرٹسٹ عورتوں کی سرپرستی کرنے میں بڑا فراخدل واقع ہوا ہے۔ انہیں نہ صرف اونچے طبقے میں متعارف کراتا ہے بلکہ اُن کی قربت سے کافی فائدے بھی حاصل کرتا ہے۔

لکھنؤ میں چکلوں پر پابندی نہ عائد کردی گئی ہوتی تو اس محفل کے لوگ سرِ شام

کوٹھوں پر پہنچ کر موسیقی ور قص سے جی بہلایا کرتے۔ اگرچہ وہاں بھی وہ اس فن کے سرپرست ہی کہلاتے۔ وہ دور ختم ہو چکا تھا لیکن عہد گذشتہ کے امیرزادوں کی جگہ اب نو دولتیوں نے لے لی تھی۔ ان کی بڑی بڑی کوٹھیوں کے عالیشان ڈرائنگ روموں اور کلبوں میں ایسے ایسے شاندار اجتماع ہوتے تھے کہ وہاں جا کر آرٹسٹ چوکڑی بھول جاتے تھے۔

ماتھر کے ڈرائنگ روم میں جھاڑ فانوس، قالینوں، ریشمیں پردوں، قیمتی صوفوں، دیش بدیش سے منگا کر سجائے ہوئے انواع اقسام کے آرٹ کے نمونوں اور مصوری کے شاہکاروں سے لے کر نایاب قسم کے پھولوں اور پودوں اور اُن کے پیتل کے گملوں تک ہر چیز موجود تھی جن کے درمیان اِنّی خود کو کھویا کھویا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت دفتر کے تھکا دینے والے ماحول میں گزرتا تھا جہاں ہر طرف ایک خاص قسم کی بُو اگلنے والی خاکستری فائیلوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ اس دفتر کے علاوہ اس کا تعلق اناج کے بڑے بڑے گوداموں سے بھی تھا جہاں اناج کو کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بدبودار گھول اور پاؤڈر چھڑکے جاتے تھے۔ وہاں وہ سینکڑوں مزدوروں کو بھاری بھاری بوریاں پیٹھ پر لاد کر ٹرکوں سے گوداموں اور گوداموں سے ٹرکوں میں پہنچاتے ہوئے دیکھتا تھا۔

اِنّی اپنی افسرانہ خوبُو بھول کر واقعی سحر زدہ سا ایک صوفے میں دھنسا ہوا بیٹھا تھا۔ کرونا سنہا اور سونیا نے ماتھر کے منی بار سے شراب کے جام لا لا کر مردوں کو پیش کئے۔ ان عورتوں نے خود بھی ایک دو گھونٹ لے لینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ جو عورتیں شراب پینے میں مضائقہ سمجھتی تھیں وہ سب کے درمیان بیٹھی پھلوں کے ٹھنڈے مشروبات سے اپنے حلق تر کرتی ہیں۔

اِنّی اور پنکی پاس پاس بیٹھے تھے۔ وہ دونوں بھی پھلوں کے رس سے جی بہلا رہے تھے۔ اگرچہ ماتھر دونوں کے پاس بار بار جام بھر کے لے آیا تھا۔ اور انہیں قبول کر لینے کے اصرار کیا تھا۔ وہ خود نشے میں آ چکا تھا اور بار بار پنکی کے سر پر بوسہ دے کر کہتا تھا۔

"تم تو میری بیٹی ہو! تم تو میری گُڑیا ہو!"

پنکی بہت گھبرائی ہوئی نظروں سے اِنّی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

دوسرے مرد اور عورتیں بھی نشہ کی کیفیت میں تھے۔ گیتا نے سب کی موجودگی کو نظر انداز کر کے ریتو پنڈت کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور وہ دونوں ایک ہی گلاس سے پی رہے تھے۔

اکرام چوہدری اپنی داشتہ عطیہ کو انکم ٹیکس افسر رنجیت سنہا کے پاس چھوڑ کر اُس کی جوان و دلکش سالی سشما چندل کو فلرٹ کرنے میں لگ گیا تھا۔ سشما چندل گھبرا کر کبھی اپنے بہنوئی کی طرف دیکھتی کبھی اپنی بہن کرونا سنہا کی طرف۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی

اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا — کرونا سونیا اور گیان سنگھ منی بار کے سامنے کھڑے ماتھر کے کسی لطیفے پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔

ابھی میز پر کھانا نہیں لگایا گیا تھا۔ اِنّی نے بہت دیر ہو جانے کا خدشہ محسوس کر کے پنکی کو باہر نکل چلنے کا اشارا کیا اور دونوں سب کی آنکھ بچا کر باہر آ گئے۔

سڑک پر بجلی کے سارے کھمبوں کے بلب روشن نہیں تھے۔ انہیں دونوں طرف کے گھنے پیڑوں کی وجہ سے بھیگے ہوئے اندھیرے کا احساس ہوا۔ سڑک کے مشرق میں دُور تک گومتی ندی کا اونچا بند رہا تھا۔ اور سیلاب کے دنوں میں اس سڑک پر دس سے پندرہ فٹ تک پانی بھر گیا تھا۔ کسی کسی کوٹھی کی چار دیواری ڈھ گئی تھی۔ اور اُن کا ملبہ ابھی تک پڑا ہوا تھا۔

اِنّی اور پنکی دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ دونوں دل ہی دل میں پچھتا رہے تھے کہ انہوں نے ماتھر کی دعوت قبول کر کے اپنی شام کا کیوں خون کر دیا تھا۔

"پنکی، اس سب کے لئے میں ہی ذمّہ دار ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔"

"اُس میں میرا بھی تو قصور ہے — اگر میں ساتھ نہ دیتی تو تم یقیناً انکار کر دیتے!"

"ضرور کر دیتا۔ لیکن تم مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں نا!"

پنکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اُس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

اِنّی بولا — "مجھے اس قسم کے ماحول کا کچھ اندازہ تو ضرور ہے لیکن ان لوگوں سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔"

پنکی پہلے کی طرح خاموش رہی۔

"ہم دونوں نے سلور اوک، میں کتنا اچھا وقت گزارا ہوتا؟"

پنکی ہونٹ سیئے چلتی رہی —

اِنّی نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"کتنا اچھا ہوتا ہم نے یہ سارا وقت پروفیسر باجپئی کے ساتھ گزارا ہوتا! کیا نہیں؟"

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا، پنکی اُس کی ہر بات پر چپ کیوں سادھے ہوئے ہے؟ پنکی چند قدم آگے بڑھ کر رُک گئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

"اب تم مجھے اُن کے یہاں چلنے کے لئے مت کہنا۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔"

دونوں پھر چل پڑے۔ اِنّی جو اُس سے پیچھے رہ گیا تھا جلدی سے اُس کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن وہ اس بات کے لئے من ہی من میں کڑھ رہا تھا کہ پنکی کو خوش کرنے کی اُس کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوئی ہے۔ اُس نے اُس کی کسی بھی بات کا اثر نہیں لیا ہے، سوائے

اس کو اُس نے آج کے واقعے کے لئے اُس کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔
حضرت گنج میں اِنّی اپنا اسکوٹر ایک اسٹینڈ پر چھوڑ آیا تھا۔ وہاں جا کر اسکوٹر اٹھانے سے پہلے اُس نے پنکی سے کہا۔
"ہم نے کھانا بھی تو نہیں کھایا ہے۔ کیا خیال ہے؟"
"میں گھر جاؤں گی۔ فوراً!"
اُس کی آواز میں کچھ تحکم تھا کچھ ناراضگی۔ اِنّی نے اُس کے سامنے خود کو بے بس سا محسوس کیا۔ مجبوراً اسکوٹر اسٹارٹ کر لیا۔ پنکی اپنے آپ اُس کے پیچھے بیٹھ گئی۔
وہ ویورینگ کالونی کی طرف جانے کے بجائے گوتم پلّی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ فاصلے تک پنکی خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اچانک بولی۔
"ادھر کہاں جا رہے ہو؟"
"سارے راستے تمہارے گھر کی طرف جاتے ہیں۔ چاہے کسی اور سے جائیں۔"
گوتم پلّی کا موڑ کاٹ کر وہ پارک روڈ کی طرف ہو لیا۔ پارک روڈ پر کئی رہائشی فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ دو منزلہ۔ جہاں جرنلسٹ، منسٹر، اسمبلی کے اراکین اور کچھ سرکاری افسر رہتے تھے۔
وہ ایک فلیٹ کے سامنے رک کر بولا۔
"میں وہاں اُوپر رہتا ہوں۔"
پنکی نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر اس کی آنکھوں میں ایک سوال ضرور اُبھر آیا تھا۔
"پھر؟"
"نیچے اترو۔"
وہ خاموشی سے اُتر گئی۔ اِنّی نے اسکوٹر سڑک کے کنارے پارک کر دیا۔ اور بولا۔
"آؤ۔ وہ جگہ تو دیکھ لو جہاں میں رہتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ آگے آگے چل پڑا۔ بغیر دیکھے کہ وہ اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے کہ نہیں! جیسے اُسے یقین ہو کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے ضرور چلی آئے گی۔ اُس کے اندر اچانک یہ جرأت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا سبب وہ نہیں جانتا تھا۔
پنکی اُس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟
اوپر جا کر اِنّی نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ بنا پردوں کے دروازے اور کھڑکیاں، دوسرکاری قسم کے پرانے صوفے، دیواریں تصاویر سے خالی۔ بس ایک خوب صورت ساہرت کرانتی، کا کئی برسوں کا پرانا کیلنڈر۔ سامنے بالکنی میں سوکھے ہوئے پودوں کے آٹھ دس گملے جن میں کوئی پانی تک نہیں ڈالتا تھا۔

پنکی ہر طرف ایک عجیب سی خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔
اور اِنّی اُس کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثر کو گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔
پھر اچانک دونوں کی نظریں ملیں اور پھر دونوں ایک دوسرے پر سے نظریں نہ ہٹا سکے۔
"پنکی، کیا اس طرح ایک دوسرے سے خفا رہنے کی کوئی وجہ ہے؟ اگر ہو بھی تو کیا اس کو اس قدر اہمیت دی جانی چاہیئے؟"
وہ اُسے خاموش لیکن اپنی طرف پوری طرح متوجہ پاکر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور بے اختیار اُسے گلے سے لگا لیا۔ پنکی بھی جیسے اندر ہی اندر ٹوٹ چکی تھی۔ اُس نے اس بات کا احساس کر لیا تھا کہ مصنوعی طور پر خفگی دکھانے کے کوئی معنی نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اُس کے ساتھ چپک سی گئی اور بولی۔
"آئی ایم سوری! میں نے تمہارا دل دُکھایا ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ دراصل یہ اُسی پور محفل کا ردِ عمل تھا۔ بس! اس کے سوا اور کچھ نہیں۔"
پھر وہ اچانک ایک جھٹکے سے اُس کی گرفت میں سے آزاد ہوتی ہوئی بولی۔
"مجھے تو بھئی، بڑی بھوک لگ گئی ہے۔ کچھ کھانے وانے کو ہے تمہارے اس ویران محل میں؟"
وہ اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی کچن میں چلی گئی۔ اور وہیں سے بولی۔
"یہاں تو مکھن ڈبل روٹی بھی ہے اور انڈے بھی ہیں۔ شاید دودھ ختم ہے۔ بنا دُودھ کے چائے پی لو گے؟"
پنکی اِنّی کے چائے کے کپ میں شکر ملا رہی تھی اور اُس سے کہتی جا رہی تھی۔
"ایک دن میرے ساتھ مارکیٹ چلو تو تمہیں اپنی پسند کے پردے خریدنے میں مدد دے دوں —— اور ایک چھوٹا قالین، کچھ پینٹنگز اور کچھ آرٹ پلیسز! تب یہ گھر واقعی ایک گھر معلوم ہوگا!"
یہ کہہ کر وہ بڑی خوشدلی سے ہنس بھی پڑی۔
"وہ تو سب ٹھیک ہے —— لیکن جب یہ گھر رہنے کے لائق ہو جائے گا تب بھی تو میں اکیلا ہی رہوں گا! جس قسم کے گھر کی تم کلپنا کر رہی ہو اُس میں تو میرے ساتھ کوئی اور بھی ہونا چاہیئے!"
اِنّی نے اُس کی طرف گہری نظروں دیکھا۔
"تو لے آنا کسی اور کو بھی ساتھ رکھنے کے لئے ——"!
پنکی بڑے وشواس سے پہلے کی طرح ہنستی ہوئی بولی —— وہ اِنّی پر اُسی طرح نظریں جمائے رہی۔
"یہ اتنا آسان تھوڑے ہی ہے! اگر میں کسی سے کہوں گا تو وہ سچ مچ میرے کہنے پر چلی آئے گی؟"
"تم جیسے کماؤ پوت کو کون انکار کرے گا بھلا! پھر تم تو اتنے خوب صورت ہو کہ لڑکیاں تمہیں دیکھ کر اپنے نام کی پرچیاں ڈالتی ہوں گی!"

یہ سن کر اِنّی کے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ کوئی خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکی کسی کو اس طرح فلرٹ کرنے پر اُتر آئے تو اُس کا دل یقیناً بے پناہ خوشی سے بھر جائے گا۔ وہ کچھ لمحوں تک خاموش سا بیٹھا رہ گیا۔ پنکی کی آنکھوں میں ڈوبا ہوا سا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

پنکی کے لئے اُس کی ایسی نظروں کی تاب لانا مشکل ہو گیا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اب میں جاؤں گی۔ چلو مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"

"نہیں رہ جاؤ ــــ کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؟ ــــ تم اسی گھر کو گھر کے قابل بنانے کی بات کر رہی تھیں نا!"

"چلو چلو! اب فلمی ڈائیلاگ ختم! مجھے گھر جاکر اتنی دیر سے لوٹنے کی وجہ بھی بتانی ہوگی۔"

وہ دروازے میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ سیڑھیوں کی بتی آن آف کرنے لگی۔

اِنّی باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا تو وہ جلدی سے نیچے اُتر گئی۔

دیویر بنک کالونی کی طرف جاتے ہوئے سارے راستے دونوں غیر معمولی طور پر خاموش رہے۔ اگرچہ دونوں اس سے پہلے بھی اسی طرح خاموش رہ گئے تھے۔ لیکن پھر اچانک دونوں نے ایک انجانی باہمی رضامندی کے تحت اُس خاموشی کو توڑ دیا تھا اور بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔ کبھی کبھی بے تکلفی بھی ایک گہری خاموشی کو اچانک جنم دے دیتی ہے۔ جس میں کوئی من مٹاؤ نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی اذیت نہیں ہوتی۔ پھر بھی بات کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اِنّی نے اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے محسوس کیا وہ اپنے پیچھے پنکی کو نہیں بلکہ سپنوں کی ایک گٹھڑی کو لادے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ آج پنکی نے جو کچھ بڑی بے ساختگی سے اُس کے سامنے کہہ دیا ہے اُس کی اُسے توقع نہیں تھی۔ کم سے کم یہ توقع تو ہرگز نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اُس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دے گی۔ جو کچھ اُس نے کہا تھا اگر اُس کا مطلب وہی تھا جو وہ سمجھا تھا تو وہ واقعی بہت خوش تھا۔ لیکن اُس کا جو ردّ عمل اُس پر ہوا تھا اور اُس نے جس بے تکلفی سے اُسے اپنے فلیٹ پر رُک جانے کی بات کہہ دی تھی۔ وہ اُسے نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ اگرچہ پنکی نے اُن کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو کو فلمی ڈائیلاگ کہہ کر مسترد کر دیا تھا لیکن ایسا کرکے اُس نے اِنّی کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی پر ایک روک لگادی تھی۔ اور اُس نے یہ ٹھیک ہی کیا تھا۔ اِنّی دل ہی دل میں کچھ پچھتا رہا تھا۔

جب وہ فلیٹ کے سامنے پہنچے۔ اور پنکی اسکوٹر سے اُترتے ہی اِنّی نے اپنی گاڑی موڑنا چاہا تو پنکی حیرت سے بولی۔

"اُوپر نہیں چلو گے؟"

"بہت دیر ہو چکی ہے۔ تمہارے ڈیڈی ممی شاید سو چکے ہیں۔"

"پھر بھی اُن سے مل تو لو ــــ"

"آج نہیں۔"
"کیوں؟"
"پتہ نہیں کیوں آج اُن کا سامنا کرنے کی میں اپنے اندر ہمت نہیں پاتا!"
"ایسی کیا بات ہوگئی؟ کوئی بھی تو نہیں!"
"شاید یہ میرے من کا ہی چور ہو!"
"پھر وہی ڈائیلاگ! آر یو کریزی؟ (ARE YOU CRAZY?)
"اچھا تو رکو۔"
وہ اسکوٹر کھڑی کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔
"لو میرا ہاتھ پکڑ لو۔"
لیکن پنکی وہاں رُکی نہیں۔ دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی اوپر جانے لگی۔ اِنّی بھی دھیرے دھیرے، محتاط سے قدم اُٹھاتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن وہ چاہتا تھا وہ ہاتھ بڑھا کر پنکی کا ہاتھ پکڑ لے — اُس کے اندر اچانک پھر بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔ سیڑھیوں کا گھپ اندھیرا جس میں کوئی آہٹ نہیں تھی اُس کے لئے پنکی ہی کا پورا وجود بن گیا تھا لیکن وہ اُس کے ہاتھ میں نہیں آرہی تھی۔ شاید کہیں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی ہوگئی تھی — وہ اندھیرے میں بڑی بے تابی سے اِدھر اُدھر ہاتھ چلا رہا تھا۔
اچانک اُس کے ہاتھوں نے بالوں سے بھرے ہوئے ایک سر کو چھو لیا۔ وہ سیڑھیوں کے درمیان ہی ایک جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اُس کے ہاتھوں کا لمس پاتے ہی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اِنّی نے اُسے کھینچ کر اپنے سینے کے ساتھ چپکا لیا۔ اُس کے خوشبو اُگلتے ہوئے بالوں میں اپنا پورا منہ ڈبو دیا۔
"پنکی، میں کہتا تھا نا آج میرے من میں کوئی چور چھپا ہے! میں نہیں چاہتا اس چور کا چہرہ کوئی اور دیکھے۔ آج تو ہرگز نہیں! آج میں بہت نروس ہوں! تم سمجھتی ہو نا کیوں؟"
لیکن اِنّی اچانک اُس کی سسکیاں سُن کر چونک گیا۔ اُس نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔
"کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو پنکی؟"
"میں — پنکی نہیں ہوں سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"
"اِنّی پر جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا۔ اُس نے جلدی سے اپرا مدھوک پر سے اپنے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ پھر ہاتھ الگ کر لیے۔ یہ آواز جو اُس نے ابھی ابھی سُنی ہے یقیناً اپرا کی ہے۔ لیکن وہ یہاں کیوں چلی آئی ہے۔؟ یہاں سیڑھیوں میں کیا کر رہی ہے؟ کیا پنکی اُس کے ساتھ ٹکرا کر اوپر نہیں گئی ہے؟ اُس نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ آخری سیڑھی تک۔

لیکن وہاں اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ اُسے کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ وہ جلدی جلدی اُوپر پہنچا۔ سوئچ تلاش کرکے اُسے آن کیا۔ لیکن پاور نہیں تھی۔ پنکی شاید دروازہ بند کرکے اندر جا چکی تھی۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

اِنّی ایک عجیب سی کیفیت میں نیچے اُترا۔ گھبرایا ہوا، بدحواس سا، بہت کچھ جلدی جلدی سوچتا ہوا۔ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟

ایرا دھوک اب اُسے سیڑھیوں کے درمیان نہیں ملی۔ وہ نیچے سڑک پر بھی نہیں تھی۔ اس سے اُس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ کب سے یہاں موجود تھی؟ وہ اتنی رات ہو جانے پر بھی اپنے گھر کیوں نہیں گئی تھی —؟

اِنّی اُسے تلاش کرنے کے لئے ایک طرف چل پڑا — وہ اُسے گومتی کے بندھ پر چڑھتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ اُس نے اسکوٹر سڑک کے کنارے روک لی۔ اور بھاگ کر اُسے جا لیا۔ وہ گومتی میں کود جانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔

سات

اگلے ایک ہفتہ تک ایرا مدھوک آفس نہیں آئی —— اُس نے چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی۔ لیکن اِنّی اُس کے بارے میں جاننے کے لئے بہت فکرمند تھا۔ پنکی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس رات ایرا پر کیا گزری تھی۔

اُس روز ایرا بہت دیر تک آفس میں کام کرتی رہی تھی۔ جب سات بج گئے۔ اور چوکیدار نے دفتر کو تالا لگا دینا چاہا تب ہی اُس نے آفس چھوڑا تھا۔ وہاں سے وہ حضرت گنج گئی تھی۔ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتی پھری تھی۔ اُس کے بعد وہ پیدل ہی گھر کو روانہ ہوئی۔ جو وہاں سے بہت دور تھا۔ وہ چاہتی تھی، اسی طرح جتنا وقت کٹ سکتا ہے، کٹ جائے۔ بلکہ وہ تھکن سے بالکل چور ہو کر کہیں گر جائے تو اچھا ہوگا۔ اُس دن وہ واقعی بے حد پریشان تھی۔ گھر جا کر وہ ڈیڈی کے بلائے ہوئے مہمانوں کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اس بات کا یقین کر لینے کے بعد ہی گھر لوٹنا چاہتی تھی کہ وہاں اب اُس کا کوئی انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔ اُس کے ممی و ڈیڈی تو یقیناً اُس پر خفا ہوں گے لیکن وہ جو کچھ بھی کہیں گے۔ اُسے وہ چپ چاپ سُن لے گی۔ لیکن گھر کو لوٹتے لوٹتے وہ اچانک ایک دوسرے راستے پر ہو لی جو پنکی کپور کے گھر کو جاتا تھا۔ اُسے معلوم تھا وہ لوگ کہاں رہتے تھے۔ لیکن وہ اُن کے فلیٹ کی کچھ ہی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بیچ میں بیٹھ گئی تھی۔

جب اِنّی اُسے گومتی کے بندھ سے گھسیٹتا ہوا سا پنکی کے گھر لے آیا تو ایرا نے وہاں سب کو روتے روتے بتایا تھا —— ”میں اُس دن بھی سخت غصے میں تھی۔ جب آپ لوگ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے میں آپ سب سے یہ پوچھنا چاہتی تھی، میرے اندر کونسی کمی ہے؟ مجھے کس کارن ناپسند کیا جا رہا ہے؟ —— پھر مجھے یاد آیا، مجھے ناپسند

تو اور بھی کئی لوگ کر چکے ہیں۔ یہ سوال تو مجھے ہر ایک سے پوچھنا چاہیئے۔ صرف آپ کے سریندر کپور سے کیوں ؟ یہی باتیں سوچتے سوچتے میری ہمت جواب دے گئی۔ میں بالکل بے دم سی ہو کر سیڑھیوں کے نیچے میں بیٹھ گئی۔ سیڑھیوں میں روشنی نہیں تھی۔ روشنی کہیں بھی نہیں تھی۔ اندھیرے میں بیٹھے رہنا مجھے اچھا لگا۔ کم سے کم اس حد تک کہ کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کوئی بھی نہ اوپر سے نیچے آیا نہ نیچے سے اوپر گیا۔ جیسے جیسے دیر ہوتی گئی میرے فیصلے میں مضبوطی آتی گئی کہ اب میں کسی صورت میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ یہاں سے اٹھ کر گومتی ندی کی طرف نکل جاؤں گی جو یہاں سے بہت دور نہیں ہے ——— آج کل بہت چڑھی ہوئی بھی ہے۔ وہ کتنے گھروں انسانوں اور جانوروں کو بہا کر لئے جا رہی ہے۔ ان میں ایک میں بھی سہی! اچانک مجھے اس طرح مر جانا بہت آسان لگا۔ ابھی میں یہاں سے اٹھنے ہی والی تھی کہ میں نے آپ لوگوں کے آنے کی آوازیں سنیں۔"

یہ کہہ کر اپرا مدھوک نے پنکی اور اِپّی کی طرف بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے تاکا تھا۔ جیسے اُس کی اس حالت کے لئے وہی ذمہ دار ہوں۔

اُس رات کو پنکی، اِپّی اور پنکی کے ممی و ڈیڈی بہت دیر تک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ اس مسئلے کا اب کونسا حل ہو سکتا ہے ؟ انہوں نے اس لڑکی کو سریندر کے لئے قبول نہ کر کے اس کا ذہنی توازن بگاڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے لئے وہ تنہا تو ذمہ دار ہر گز نہیں تھے۔ اُسے کئی اوروں نے بھی تو ناپسند کر دیا تھا۔ اور اس زمانے میں کتنی لڑکیاں اسی طرح دیکھی جاتی ہیں، مسترد کر دی جاتی ہیں اور پھر اچانک کہیں نہ کہیں اُن کا رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ جو اس لڑکی کے لئے نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے لئے صرف سریندر کو کیوں نشانہ بنا لیا جائے! وہ لوگ اپنے اس فیصلے پر ابھی تک قائم تھے کہ اس کو وہ سریندر کے لئے ہر گز قبول نہیں کریں گے۔ اس رُخ پر اُن کے دل میں اپرا مدھوک کے لئے کوئی ہمدردی موجود نہیں تھی۔ اگرچہ اِپّی چاہتا تھا کہ وہ لوگ ایسا کر کے اس لڑکی کو اس کی شدید ذہنی اذیت سے نجات دلا دیں۔ لیکن اُس کی یہ بات سننے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔

پنکی کے ڈیڈی نے صاف صاف کہہ دیا تھا ——— "مجھے پورا یقین ہے اُس لڑکی کے دماغ میں کوئی فتور ہے۔"

اس کی ماں نے بھی یہ کہہ کر اس کی تائید کر دی تھی ——— "ایسا نہ ہوتا تو یہ خواہ مخواہ اس طرح ہمارے گلے کیوں پڑتی !"

جب اپرا کے والد حوالدار مدھوک کو وہاں بلوا لیا گیا تو انہوں نے پورا واقعہ سن کر سب سے معافی مانگی اور اپنی بیٹی کو ہی قصوروار قرار دیتے ہوئے کہہ دیا ——— "اُس کا دماغ خراب نہ ہوتا تو اس نے یہ سارا تماشا کیوں کیا ہوتا ؟"

وہ اپرا کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے تھے
اِنّی کے دل میں یہ بات اب بیٹھ گئی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس حد تک بلا وجہ جذباتی نہیں ہو سکتی۔ اپرا یقیناً ایک ابنارمل لڑکی ہے۔ وہ یہ بھی تو دیکھ چکا تھا کہ اپرا اچانک اپنے لباس اور میک اپ کی طرف زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ اُس کے اندر پیدا ہو جانے والی یہ اچانک تبدیلی بھی شاید اُس کی ذہنی کیفیت کی غماز تھی۔ اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتا رہا تھا کہ اُسے سریندر کے ناپسند کر دینے کے بعد چند ہفتوں میں اُس کے اندر سے ایک نئی اپرا نمودار ہو گئی ہے جو پہلے سے زیادہ متوازن اور مضبوط ثابت ہو گی۔
وہ کئی روز سے آفس نہیں آئی تھی۔ اِنّی جاننا چاہتا تھا۔ وہ اب کیا محسوس کرتی ہے۔ اپرا مدھوک کے بغیر اُسے اپنا سیکشن خالی خالی سا لگتا تھا۔ اگرچہ اُس کی موجودگی بھی اُسے خاصا بے چین رکھتی تھی۔
ایک دن اِنّی کو سریندر کپور کا خط موصول ہوا۔
اُس نے لکھا تھا — میں نینی تال کے ایک کنٹریکٹر مکندی لال شاہ کی بیٹی کے بہت قریب ہو گیا ہوں۔ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ ہم دونوں بہت جلد شادی کر لینا چاہتے ہیں۔
اُس نے اپنے خط کے ساتھ اُسی لڑکی کی فوٹو بھی منسلک کر دی تھی۔ اور پوچھا تھا — "مجھے فوراً لکھو — تمہیں اپنی ہونے والی بھابھی کیسی لگی؟ لیکن خدا کے لئے اُسے ناپسند مت کر دینا ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔" لڑکی واقعی بہت سُندر تھی۔ سریندر کے ساتھ بالکل میچ کرنے والی۔
اُس نے خط کے آخر میں یہ بھی تجویز کر دیا تھا — "اب تک تم نے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہو تو مجھے فوراً لکھو۔ کتنا اچھا ہو کہ ہم دوستوں کی شادیاں ایک ہی دن، ایک ہی جگہ کر دی جائیں!"
خط کا یہ حصہ پڑھ کر اِنّی سوچ کے سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ سمجھ گیا سریندر کا اشارہ اُس کی اپنی چھوٹی بہن پنکی کی طرف تھا۔ لیکن پنکی اس معاملے میں ایک بند کتاب کی طرح تھی۔ جو کبھی کبھی اچانک اپنے آپ کھل بھی جاتی تو پھر فوراً ہی بند بھی ہو جاتی تھی۔ وہ اس قسم کی لڑکی ہرگز نہیں تھی کہ اُس کے ماں باپ اگر خود ہی فیصلہ کر کے اُسے کسی کے ساتھ منسلک کر دینا چاہیں تو وہ اُن کے فیصلے کا احترام بھی کرے گی! شاید اُس کے ماں باپ بھی ایسی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی کے مزاج سے واقف تھے۔
آفس بند ہونے سے کچھ دیر پہلے اچانک پنکی آ گئی۔ اُس کے پاس بھی سریندر کا خط اور اپنی پسند کی لڑکی کا فوٹو آیا تھا — پنکی اور اِنّی سریندر کے انتخاب پر

بہت خوش تھے۔ دونوں نے اُسے مبارکباد کا ایک مشترکہ خط لکھا۔ لیکن دونوں سریندر کے خط کے آخری پیراگراف میں لکھی ہوئی تجویز پر خاموش رہے۔

اِنّی کا خیال تھا پنکی خود ہی اُس سے اس بارے میں پوچھے گی اور اُسے چھیڑنے کے لئے دو ایک جملے کہے گی ـــــ لیکن اُس نے اُس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اُس کی طرف ایک بار بھی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اِنّی نے ایک صدمہ سا محسوس کیا لیکن اُسے اپنے چہرے پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

اُس روز اُس کے پاس ڈنر کے دو دعوت نامے تھے ـــ ایک اُس کے لئے دوسرا پنکی کے لئے ـــــ دامودر گپتا خود ہی آکر پہنچا گیا تھا۔ اور درخواست بھی کی تھی کہ وہ ضرور آئیں۔ اُس نے یہ ڈنر ایک مشہور فلم ہیرو راجکمار اور فلم پروڈیوسر تلواڑ کے اعزاز میں رکھا تھا جو ایک فلم کی شوٹنگ کے سلئے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ فلم کی نئی ہیروئن سریکھا بھی آئی ہوئی تھی۔

پنکی نے کارڈ دیکھا تو بولی ـــــ "سریکھا کو تو سب سے پہلے خواجہ احمد عباس نے انٹروڈیوس کیا تھا ـــ لیکن وہ فلم ہی "ناکام ہوگئی تھی۔ یہ اُس کی دوسری فلم ہے۔ شاید راجکمار جیسے بڑے اسٹار کے ساتھ کامیاب ہو جائے!"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟ ـــ چلیں؟" اِنّی نے پوچھا۔

"وہاں بوریت تو بہت ہوگی۔ وہی سب لوگ ہوں گے جن سے پہلے مل چکے ہیں۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ لیکن بوریت میں بھی ایک تفریح کا پہلو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اگر ہم خود کو محض تماشائی سمجھ کر وہاں جائیں۔"

پنکی ہنس پڑی۔ "تو ٹھیک ہے۔ جب دیکھیں گے، من نہیں لگ رہا ہے تو چلے آئیں گے۔"

اس دعوت میں ساٹھ ستّر کے قریب لوگ مدعو تھے۔ اُن میں وہ سارے لوگ شامل تھے جن سے اِنّی اور پنکی پہلے سے متعارف تھے۔ لکھنؤ کے اُوپر کے طبقے میں سو دوسو لوگ ایسے ہیں جو عموماً ہر بڑی محفل میں موجود ہوتے ہیں۔ اس موقعہ پہ عورتیں خاص طور پر زرق برق ـــــ پوشاکیں اور بھاری زیورات پہن کر آئی تھیں۔ وہ اسی وجہ سے ایک دوسری کی طرف بڑی حاسدانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اگرچہ وہاں ہر ایک مرد دوسرے کی عورت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ سب کے سب گپتا کے شکرگزار نظر آتے تھے کہ اُس نے اُنہیں ایک بڑے فلمسٹار سے ملنے کا موقعہ دے دیا تھا۔ مگر وہ دبی دبی زبان سے دامودر گپتا کی چالاکی کی داد بھی دے رہے تھے کہ اُس نے اتنی

بڑی دعوت کا اہتمام محض اپنی داشتہ ریتو پنڈت کو فلم میں چانس دلوانے کے لئے کیا تھا۔ ریتو پنڈت فلم پروڈیوسر کی نظروں میں چڑھ سکے یا نہیں، یہ الگ بات تھی لیکن اس پر دامودر گپتا کی گرفت یقیناً اور مضبوط ہو جائے گی۔

وہاں اِنّی نے ریتو پنڈت کو غور سے دیکھا۔ وہ درمیانے قد کی دُبلی پتلی سی عورت تھی۔ ستائیس اٹھائیس برس کی۔ ناک نقشہ بھی خاصا دلکش۔ اگرچہ اُسے وہ ماتھر کے گھر پر ایک بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن آج اُس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی خاص اہتمام سے پہن رکھے تھے ـــــ آسمانی رنگ کی جاپانی ریشم کی ساڑھی اور بلاؤز جو اس کے جسم کے ساتھ بالکل چپکے ہوئے تھے۔ بلاؤز بلا آستین کا تھا۔ اُس کے سڈول گورے بازو اس کے سارے جسم پر نمایاں تھے۔ اُس نے اپنے بال کھول رکھے تھے۔ آج وہ بلا کی سیکسی نظر آتی تھی۔ راجکمار کو ریسیو کرنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ساتھ اس طرح قدم سے قدم ملا کر چلی جیسے وہی اُس کی ہیروئن ہو۔ سریکھا تو پیچھے پیچھے فلم پروڈیوسر کے ساتھ سکڑی سمٹی ہوئی سی چلی آ رہی تھی۔

کھانے کی میز پر ریتو پنڈت کو راجکمار اور فلم پروڈیوسر تلواڑ کے درمیان بٹھایا گیا۔ دامودر گپتا اُن کے پاس کھڑا خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا ـــــ اُس نے راجکمار سے کہا۔

"ریتو اُردو و ہندی دونوں زبانیں جانتی ہے۔ شعر بھی کہتی ہے۔ اور گانا تو ایسا گاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے سرسوتی دیوی خود اُس کی زبان پر آ کر براجمان ہو گئی ہو۔ لیکن اس کا اصل میدان اسٹیج پر اداکاری ہے۔ میں نے اُسے ایسے ایسے ڈراموں میں پارٹ دلوایا ہے جس کا مرکزی کردار ہی عورت کا ہوتا تھا اور یہ اُن میں بے حد کامیاب رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر ریتو جی فلموں میں پہنچ گئیں تو بڑی بڑی اداکاراؤں کی چھٹی کر دیں گی۔

داموودر گپتا کی زبان سے ریتو پنڈت کے لئے اتنی زیادہ تعریف کا ردِّ عمل فلمی شخصیات پر یہ ہوا کہ وہ لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ـــ لیکن ان میں سے کسی نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

داموودر گپتا فلمی شخصیات کو پیش کرنے کے لئے کئی تحائف بھی لے آئے تھے۔ مہاتما بدھ کی مورتیاں، لکھنؤ کے نوابی حُقّے، منقش تھال اور لکھنؤ کی تاریخی عمارات کی بڑی بڑی پینٹنگز ـــ اس سے گپتا کی احسن لطافت اور ذوقِ حسن کا پتہ چلا۔ اُس نے یہ سارے تحفے ریتو پنڈت کے ہاتھوں سے مہمانوں کو پیش کروائے۔ پھر تالیوں کی گونج میں گپتا نے ریتو پنڈت سے مہمانوں کو ایک غزل سنانے کی بھی فرمائش کر دی۔

رینو پنڈت ریڈیو پر اور اسی قسم کی محفلوں میں کبھی کبھی ہلکے پھلکے گانے پیش
کرتی رہتی تھی۔ اور ہمیشہ اپنا ہی کلام سنایا کرتی تھی۔ لیکن اُس روز اُس نے لتا منگیشکر
کی گائی ہوئی ایک غزل گا کر سنادی۔ جی روٹھ کر اب کہاں جائیے گا!

اُس کا اثر مہمانوں اور دیگر سامعین پر اچھا نہیں پڑا —— اس لئے کہ لتا کی آواز اُس
کی آواز سے کہیں زیادہ منجھی ہوئی اور سُریلی تھی۔ لیکن سارا ماحول ایک اخلاقی تکلف
میں بھی مبتلا ہو چکا تھا۔ اس لئے رینو کو بھی تالیاں بجا کر داد دے دی گئی۔ دامودر
گپتا کو اس بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا کہ اتنی اچھی تقریب کی تان کہاں آکر ٹوٹی
ہے۔ وہ اپنے فوٹوگرافروں کو بار بار رینو کے مہمانوں کے ساتھ فوٹو اور ویڈیو کیسٹ
بنانے کی تلقین کرتا پھر رہا تھا۔ کبھی آنکھوں اور سر کی جنبش سے کبھی اُن کے پاس خود
جاجاکر۔

اُس کی سب سے بڑی خوشی اسی میں تھی کہ فلمی مہمانوں کی نظروں میں رینو کی اہمیت بڑھ جائے۔
اگلے روز صرف اُسی کے فوٹو اخبارات میں نظر آئیں۔ اخباروں کے نمائندوں کے ساتھ اُس
کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ وہ انہیں مختلف ذرائع سے فائدے پہنچاتا رہتا تھا۔
شہر کے ایک بڑے کلب میں جس کا وہ صدر رہتا، وہ اُن کی خاطر تواضع کرنے میں کبھی کنجوسی سے
کام نہیں لیتا تھا۔ جس کو نہ دے مولا، اُس کو دے آصف الدّولہ! دامودر گپتا، شراب و کباب
کے بھوکے اور ٹوٹتے ہوئے اخباری نمائندوں کے لئے نواب آصف الدّولہ بنا ہوا تھا۔

یہ سارے ملے خود دامودر گپتا کی زندگی میں کس قدر اہم تھے، اس کی کیفیت اُس کی مسرت سے
چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں ہی سے دیکھتے بن پڑتی تھی جو اُس کے سیاہ چہرے اور گنجے سر والی
پرسنالٹی کا ایک نمایاں حصّہ تھیں۔ وہ رینو پنڈت کو اپنی اپاہج بیوی پر کہیں زیادہ ترجیح اس لئے دیتا
تھا کہ وہ اُس سے کوئی بھی حق مانگے بغیر اُس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا
کہ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر میں بند تھا تو رینو اُس کی بند کار میں سڑک پر ہی کافی رات
گئے تک لیٹی رہی تھی۔ وہ موقعہ پاتے ہی کھسک کر باہر آجاتا اور پھر وہ اُسے لامارٹینئر کے سنسان
پارک یا اپنی فیکٹری کے آفس میں رنگ رلیاں منانے کے لئے لے جاتا تھا۔ وہ اس دن کا بے
صبری سے انتظار کر رہا تھا جب رینو پنڈت فلمی دنیا کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارہ بن
کر ابھر جائے گی۔ وہ ایسی لڑکیوں اور عورتوں کا صحیح معنوں میں قدرداں اور سرپرست ہونے میں
فخر محسوس کرتا تھا جن کے اندر موسیقی، رقص، شاعری اور مصوری میں ذرا سی بھی صلاحیت نظر
آجاتی تھی۔ ایسی ناکام و افسردہ آرٹسٹوں کو فوراً پہچان جاتا تھا اور خود ہی اُن کے پاس پہنچ
جاتا تھا۔

اِلّی اور پنکی کی وہ شام خاصی دلچسپی میں گزری۔ دونوں بے حد مسرور تھے۔ اگرچہ

اُن کی اس تقریب میں شرکت معمولی مہمانوں کی سی تھی۔ اُن کی خوشی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ بے شناخت رہ کر سارے لوگوں کے رویوں کا مطالعہ کرتے رہے تھے یوں کبھی کبھی خوش ہو اُٹھنے کا کوئی سبب بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ خوشی کا تعلق روح سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ زندگی میں اچانک پیش آ جانے والے واقعات سے بھی منتج ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی دلچسپ یا مضحکہ خیز حرکتوں کے ردّ عمل کے طور پر۔ ان لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ چپکے چپکے دوسروں کو محظوظ کرنے کے لئے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ بھلے ہی وہ لوگ اپنی نظروں میں کتنے ہی اہم بنے رہے ہوں۔ ان کے شعور کی پرورش و پرداخت ہی اسی قسم کے خود نمائی کے جذبوں کے درمیان ہوتی ہے اور وہ پوری طرح مطمئن نظر آئے ہیں۔

"ہم جو خود کو ذرا انٹلکچول سمجھنے کے زعم میں مبتلا رہتے ہیں ماحول کی ناآسودگی کا شکار ہو کر اپنی فرسٹریشن میں کیوں اضافہ کریں؟" پنکی آئس کریم کو کانٹے سے کاٹتی ہوئی بولی۔

ائی اُس کے سامنے ٹیبل پر بیٹھا کافی سپ کر رہا تھا اور پنکی کی طرف بڑی مسرور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بولا —— "ہم بھی ان لوگوں کے درمیان بیٹھ کر کیوں نہ کھل کر ہنسیں؟ بھلے ہی ہماری ہنسی کا ان سے ذرا سا بھی تعلق نہ ہو!"

پنکی نے سر گھما کر دامودر کو ہنستے ہنستے اپنی داشتہ اور فلمی لوگوں کے پیچھے کھڑے ہو کر ویڈیو فلم بناتے ہوئے دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں لاہور ٹائمز والے گیان سنگھ کی طرف اُٹھ گئیں جو ریڈیو کی اسکرپٹ رائیٹر عطیہ کے پاس خالی کرسی دیکھ کر اُس کے پاس جا بیٹھا تھا۔ عطیہ کا سرپرست اکرام چوہدری دامودر گپتا کو کوئی دلچسپ لطیفہ سُنانے کے بہانے سے ٹھیک اس جگہ جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جہاں کیمرے کی آنکھ جمی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے لطیفے سے راجکمار بھی محظوظ ہو لیکن وہ اپنی اہمیت کی وجہ سے ہونٹ سیئے ہوئے ہی بیٹھا رہا۔

پروگرام ختم ہو جانے کے بعد دامودر گپتا کے بنگلے سے موٹروں کے جو ریلے روانہ ہوئے انہی کے آس پاس اسکوٹر پر ائی اور پنکی بھی بچتے بچاتے جا رہے تھے —— بھیڑ بھاڑ اور موٹروں کی پوں پوں کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر پا رہے تھے۔ لیکن ان کی خاموشی سے یہ بات مترشح ہو رہی تھی کہ انہوں نے اپنی موجودگی سے محفل کے وقار یا اس کی کامیابی میں کوئی نمایاں اضافہ ہرگز نہیں کیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اپنے آپ ہی ہوتا رہا تھا۔ جس کے لئے نہ تو انہیں ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ نہ ہی اُس کی انہیں داد دی جا سکتی تھی۔

ویور بنک کالونی میں ایک جگہ اچانک اسکوٹر ذرا سی خرابی کی وجہ سے رُک گئی تو پنکی سڑک کے دونوں طرف دو منزلہ عمارتوں کے بلاک دیکھ کر بولی۔

"تمہاری اسکوٹر ٹھیک ایسی جگہ کیوں آ کر رک گئی جہاں ایرا مدھوک رہتی ہے!"

اِنّی اسکوٹر اسٹارٹ کرتے کرتے رُک گیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں سے کوئی جھانک رہا تھا۔ کمرے کے اندر کی لائٹ آف تھی۔ پنکی نے ایک بے بنیاد سوال پوچھا تھا۔ اگرچہ اُس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی
اسکوٹر پھر اسٹارٹ ہو گئی اور پنکی اُچک کر اِنّی کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ سر گھما کر اُسی کھڑکی کی طرف دیکھتی گئی۔ جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تو پنکی اسکوٹر کے سامنے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اسکوٹر کی پوری ہیڈ لائٹ اُس کے سراپے پر پڑ رہی تھی۔ اِنّی اُس کی طرف گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اُسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے لیکن تناؤ سے بری تھے۔ اگرچہ وہ مسکرا نہیں رہے تھے۔
اچانک اِنّی نے ہیڈ لائٹ آف کر دی۔ اور پنکی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا —— "جاؤں؟"
"جاؤ ——" پنکی نے اُس کی طرف جواباً ہاتھ نہیں بڑھایا۔
اِنّی اسکوٹر سے اُتر گیا۔
"چلو تمہیں اوپر تک چھوڑ آؤں۔"
"میں چلی جاؤں گی ——" وہ اپنے فلیٹ کی طرف جانے کے لئے گھوم گئی۔
اِنّی نے اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس رُک کر بولی —— "بائی!"
اِنّی نے اُسے الوداع کہنے کے بجائے اُسے گلے سے لگا لیا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اُس نے محسوس کیا پنکی کے ہونٹ جل رہے تھے۔ وہ اُس کا چہرہ گھپ اندھیرے کی وجہ سے دیکھ تو نہیں سکتا تھا۔ لیکن وہ اُسی پر نظریں گڑائے ہوئے تھا۔
اُس نے دھیرے سے اُس پر اپنی گرفت ڈھیلی کر کے کہا —— "بائی!"
پنکی جلدی سے اوپر بھاگ گئی۔ سیڑھیوں پر ٹھپ ٹھپ کرتی ہوئی۔ اُس کی یہ چاپ اُس کی اندرونی خوشی کی غماز تھی۔ اِنّی ابھی تک اپنی جگہ پر گڑا ہوا سا کھڑا تھا۔
پنکی نے اوپر پہنچ کر لائٹ آن کر کے نیچے جھک کر جھانکا۔ اِنّی کو ابھی تک وہیں کھڑا دیکھ کر ایک ہاتھ اُٹھا کر "ویو" کیا۔ لیکن وہ مسکرائی نہیں —— اور پھر فوراً ہی اُس نے لائٹ آف کر دی اور اپنے فلیٹ کے اندر چلی گئی۔۔۔

اگلے روز اندر کمار ملہوترا آفس گیا تو اُسے ایرا مدھوک اپنی میز پر کام کرتی ہوئی ملی۔ اس نے اندر کو پاس سے گذرتا دیکھ کر سر کی ہلکی سی جنبش سے جیسے گڈ مارننگ کہا۔ وہ اُس کی طرف غور سے دیکھتا ہوا اپنے کیبن میں چلا گیا۔

کرسی پر بیٹھ کر پہلے تو اپنے پاس فاروقی کو انٹر کوم پر "آداب عرض" کہا۔ پھر اپنے سیکشن کا حاضری کا رجسٹر دیکھا اور پھر گھنٹی بجا کر ایرا مدھوک کو طلب کر لیا۔

"مس مدھوک، تم نے ڈیوٹی جوائن کر لی؟"

"جی سر۔"

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"سر، اچھی ہوں۔ تھینک یُو۔"

"تمہارے نہ رہنے سے کافی کام جمع ہو گیا ہے۔"

وہ اُس کے لباس اور میک اپ اور ہیر ڈو کا بھی جائزہ لیتا رہا۔ وہ بڑی اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔

ایرا نے جواب دیا ــــ "سر، آپ ڈکٹیشن دیجیے۔ میں کوشش کروں گی کہ سارا کام جلد سے جلد نپٹا دوں۔"

"ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم اپنی رفتار سے کام کرتی رہو۔ کوئی ارجنٹ فائیل ہو گی تو پہلے کر دینا۔ اچھا بیٹھو۔ ایک لیٹر لکھو۔ جنرل منیجر کے نام ــــ ریفرینس نمبر فلاں فلاں ــــ وغیرہ وغیرہ"

لنچ کے وقفے میں اندر فاروقی کے کیبن میں گیا تو اُس نے اُس کے لئے بھی کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

"ملہوترا، میں نے تمہاری اسٹینو کے بارے میں ایک بات سُنی ہے۔ کوئی ــــ سائیکل پارٹس بنانے والی فیکٹری کا مالک ہے وہ۔ شاید گپتا یا اگروال! اُسی کے ساتھ وہ اکثر دیکھی گئی ہے وہ دفتر بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ اس پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں وہ نہ آنے پائے۔ ہوسکے تو اسٹینو کے ڈیڈی کو بھی خبردار کر دو۔ وہ خود اپنی بیٹی کو اسکارٹ کر لیا کریں تو اچھا ہے۔"

اِن کچھ لمحوں تک بالکل خاموش بیٹھا رہ گیا ــــ فاروقی نے جو کچھ کہا تھا وہ ممکن ہے، سچ ہو ــــ لیکن اُس نے گپتا کو کبھی آفس کے احاطے میں نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسا تھا بھی تو پرا مدھوک کو کیا اس بات کا اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی شخص کے ساتھ دوستی رکھے! جس طرح اس دفتر کے کسی بھی مرد کو یہ حق حاصل تھا۔ جب تک کہ حالات ایک حد سے نہ گزر جائیں۔ اور محکمے کو ضابطۂ اخلاق کے تحت کوئی کاروائی کرنی پڑ جائے۔

اِندر نے یہ بھی سوچا، اُس پر اپنے باس کی باتوں کا جو فوری طور پر ردِّ عمل ہوا ہے وہ اُس کے آفس میں کام کرنے والی ایک لڑکی کی ذاتی آزادی کے لئے زیادہ ہے ــــ اس کا تعلق ایک لڑکی کے تحفّظ سے کم ہے۔ فاروقی نے یہ سمجھ کر کہ آفس میں کام کرنے والی کوئی بھی لڑکی اپنے باس کے اس قدر ضرور قریب ہو جاتی ہے کہ وہ اُس کا ایک طرح سے سرپرست بن جاتا ہے ــــ اُس کو اُس کی ذمّہ داری کا احساس کرایا ہے ورنہ اُس کے پاس کوئی تحریری شکایت اس لڑکی کے خلاف آئے گی تو فاروقی خود بھی مناسب کاروائی کرنے کے مجاز ہوں گے۔

اندر اس طرح سوچنے سے کچھ پریشان سا ہو اُٹھا تو فاروقی نے پوچھا ــــ

"کیا بات ہے، تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"نو سر! میں ضرور نظر رکھوں گا۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے ــــ لیکن یہ بھی تو دیکھنا ہوگا کہ اس لڑکی کی ذاتی آزادی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہ ہو۔ ممکن ہے مس مدھوک کی اُس شخص میں ذاتی دلچسپی بھی ہو!"

"ٹھیک ہے۔ تب مجھے اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ پھر بھی ایک لڑکی کا معاملہ تو ہے۔ اور مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ اپرا مدھوک نے ایک ریستوران میں اُس کی بدتمیزی پر اُسے تھپڑ بھی جڑ دیا تھا۔"

یہ کہہ کر فاروقی چپ ہو گیا ــــ کافی سپ کرنے لگا۔ اِندر کا جی چاہا، اپنے باس کو وہ سارے واقعات بھی بتا دے جو اب تک اُس کے اور مس مدھوک کے درمیان گزر چکے ہیں۔ لیکن وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس خوف سے کہ وہ خود ہی اپنے باس کی نظروں سے نہ گر جائے۔

وہ کچھ دیر بعد اپنے کیبن میں واپس چلا آیا۔ اُس نے شیشے کی دیوار میں سے ایرا کی طرف دیکھا ــــ وہ بڑی تندہی سے ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ بہت ہی سنجیدہ اور باوقار بھی نظر آرہی تھی۔ وہ سوچنے لگا، اس لڑکی کا رنگ دن بدن نکھرتا جارہا ہے۔ اس کے چہرے پر زندگی کی ایک بھرپور چمک ہے۔ اور ایک ایسی اندرونی قوت وضبط کا تاثر بھی نمایاں ہے جو انسان کو کڑے تجربات میں سے گذرنے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی تو اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ اُدھر سے اُسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ لیکن اُس نے اپنا نام ظاہر کرنے کے بجائے ایرا دھوک سے ہی بات کرانے کی درخواست کی ــــ وہ سمجھ گیا۔ وہ کون ہو سکتا تھا ــــ اندر کمار نے بھی اُس سے مزید کچھ نہ پوچھا اور گھنٹی بجا کر ایرا کو اپنے کیبن میں بُلا لیا۔

جب ایرا اُس کے ساتھ بات کر رہی تھی تو اندر بظاہر ایک فائیل پر جھکا ہوا تھا۔

"ہیلو! . . . . میں بول رہی ہوں! آپ کون ہیں؟ جی نہیں، مجھے آپ کی اتنی بے تکلفی پسند نہیں آئی . . . . . ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے ــــ آپ پہلے بھی تو معافی مانگ چکے ہیں۔ اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے ــــ جی نہیں ــــ جی نہیں ــــ میں اب آپ کی کوئی بات نہیں سُنوں گی۔"

یہ کہہ کر اُس نے ریسیور رکھ دیا اور اپنا غصّے سے تمتماتا ہوا چہرہ لئے واپس اپنی سیٹ پر چلی گئی۔

اندر کے سامنے دامودر گپتا کا پورا چہرہ گھوم گیا۔ کالا لیکن پُرکشش ــــ وہ عورتوں کو پھانسنے میں شاید ہی ناکام رہتا ہو گا۔ جس طرح گڑگڑا کر اُس نے ایرا کے ساتھ گفتگو کی تھی ایسی اداکاری اُس نے کئی دوسری لڑکیوں کے سامنے بھی کئی بار کی ہو گی ــــ اُس کے چہرے کی ساخت میں التجا، منّت، ترغیب وغیرہ کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ گنجا سر، چھوٹی چھوٹی عقابی آنکھیں اور ہر وقت مسکراتے رہنے والے پتلے پتلے سیاہ ہونٹ! ہر وقت کچھ طلب کرتے ہوئے سے! جس طرح کچھ لوگ پیسہ، کپڑا اور روٹی کی بھیک مانگتے ہیں۔ دامودر گپتا عورتوں کی دلکشی سے لطف اندوز ہونے کی بھیک مانگنے میں بڑا استاد واقع ہوا ہے۔ عورتوں کے ہجوم میں وہ ایک بناوٹی معذرت خواہی کے ساتھ گھس پڑتا ہے ــــ "اوہ! معاف کیجئے گا۔" اور ذراسی دیر میں وہ اُن میں سے کسی نہ کسی کے جسم سے اپنا بدن چھو لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے ــــ اور اُن کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر اُسے ٹٹول بھی لیتا ہے یا اپنے من کی بات کہہ لیتا ہے۔ اُس کا یہ انداز بھی ایک بھیک بھکاری جیسا ہی ہوتا ہے۔ بھیک مانگتے وقت اس کی آنکھیں

بھی دوسرے بھکاریوں کی آنکھوں کی طرح سکڑتی اور پھیلتی ہیں اور اچانک کسی غیر متوقع اُمید سے چمک چمک اُٹھتی ہیں۔ اُن سب کی آنکھوں کے دیئے ایک ہی انداز سے جلتے اور بجھتے ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک ہی جیسی مسکراہٹ یا بے بسی یا بے چارگی نمودار ہوتی اور غائب ہو جاتی ہے —— کچھ دو، کچھ دو! میں بھوکا ہوں! بھگوان تمہارا بھلا کرے! خدا تمہیں اور دے گا! خدا کے پاس کس شے کی کمی ہے؟ داتا کے نام پر جتنا لٹاؤ گے اتنا اور پاؤ گے!"

اچانک اندر مسکرا دیا اپنے آپ ہی۔ پھر وہ خود کو اس طرح مسکراتا ہوا پا کر شرمندہ بھی ہوا۔ دراصل اُس کے سامنے گیتا کا چہرہ ابھی تک موجود تھا۔ جس کے لئے اُس کے دل میں بے پناہ نفرت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ آدمی کسی سے سخت نفرت کرتے ہوئے بھی مسکرانے پر مجبور ہو سکتا ہے؟ شاید اُس وقت جب وہ اپنے رقیب کو اپنے طور پر قعرِ منزلت میں گرتا ہوا دیکھ لیتا ہے —— لیکن دامودر گیتا اُس کا رقیب ہرگز نہیں تھا۔ وہ اُس سے صرف نفرت کرتا تھا۔ صرف نفرت —— جس کی بظاہر اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اُس کی نظر میں پست اخلاق تھا۔

اُس روز اندر کی شام خالی تھی۔ پنکی اُس سے ملنے کے لئے نہیں آرہی تھی۔ اُس نے اندر کو بتا دیا تھا کہ آج وہ اپنے پروفیسر کے ساتھ جائے گی۔ ہالینڈ کا انڈولوجی کا ایک پروفیسر یونیورسٹی کے مہمان خانے میں قیام پذیر تھا۔ اُسے بھی غیر ملکی پروفیسر سے متعارف ہونے کا موقعہ ملتا تو وہ بہت خوش ہوتا۔ لیکن اس کیلئے اُس نے پنکی سے اصرار بھی نہیں کیا تھا —— وہ اُس کی آزادی پر خود کو بوجھ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس نے محسوس کیا وہ بہت کچھ علم رکھتے ہوئے بھی اُس کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اگرچہ پنکی نے اُسے اپنے سے کبھی کمتر نہیں سمجھا تھا پھر بھی کبھی کبھی اچانک اُس کے اندر احساس کمتری پیدا ہو ہی جاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ پنکی نے ابھی تک خود کو پورے کا پورا اُس کے حوالے نہیں کیا تھا۔

وہ شام کو آفس سے نکلا تو اُس نے خود کو اپنے فلیٹ کی طرف لے جانے کے لئے تیار نہ پایا۔ ایک اکیلے گھر میں رکھا ہی کیا تھا! تھوڑی سی دفتر سے متعلق کتابیں اور پمفلٹ۔ ٹی وی، ٹیپ کئے ہوئے موسیقی کے کیسٹ اور تاش کی گڈی اور بس! اسے اپنے اندر ایک خالی پن سا محسوس ہوا۔ اُس کے لئے جیسے سارے شہر کی دلچسپیاں اچانک ختم ہو گئیں۔ یہاں آتے ہی اُس کی ملاقات پنکی سے ہو گئی تھی۔ پنکی سے ملتے ہی جیسے یہ شہر اُسے اپنا شہر محسوس ہونے لگا تھا۔ جبکہ وہ بھی سارا شہر نہیں تھی —— شہر تو بہت بڑا تھا اور وہ اُس کے مقابلے میں ایک بہت چھوٹا سا نقطہ محض! پھر بھی اُس سے مل کر اندر کی ساری اجنبیت آناً فاناً ختم ہو جاتی تھی —— وہ خود کو اس شہر کا ایک اہم شخص تصور کرنے لگتا تھا۔ زمین سے کچھ اونچا

اور دوسروں سے بہت مختلف ۔

وہ سمجھتا تھا، پنکی اُس سے ہر روز ملا کرے گی ۔ اُس سے ملنے کے لئے ویسی ہی بے تابی دکھائے گی جیسی بے تابی اُس کے اندر موجود تھی ۔ لیکن آج پہلا دن تھا کہ اُس نے اُسے اپنے نہ آنے کی اطلاع دے رکھی تھی اور یہ بات اب اُس سے کسی طرح برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

اُس نے سوچا، وہ پنکی کے گھر جا کر اُس کے والدین کے ساتھ باتیں کرنے میں وقت گزارے ۔ جب تک وہ لوٹ کر نہیں آجاتی ہے ۔ وہ اُسے کھانے پر روک لیں گے ۔ پھر وہ پنکی کے ساتھ کچھ دیر گھومنے کا موقعہ حاصل کرلے گا ۔

یہ احساس کر کے کہ پنکی اُس کے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے اُسے خوشی بھی محسوس ہوئی ۔ اور حیرانی بھی کہ پنکی اُس کی زندگی میں کس قدر جلد داخل ہو گئی ہے ۔۔۔ اُس کے بغیر وہ واقعی ایک حقیقی کمی محسوس کر رہا ہے ۔ وہی اُس کی بہترین ساتھی بن سکتی ہے ۔ اس لئے کہ وہ بہت اچھی گفتگو کر سکتی ہے جو اُس کے ذہن کو بے پناہ آسودگی بخشتی ہے ۔ شاید اس میں اس کے خوبصورت جسم کو بھی دخل حاصل ہے ۔ جسے چھو کر اُسے بڑی راحت نصیب ہوتی ہے ۔ وہ بھی اُس کی طرف جب محبت بھری نظروں سے تاکتی ہے یا اُسے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتی ہے اور پھر اچانک کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے یا بلا وجہ خاموش ہو جاتی ہے تو اُسے بہت اچھا لگتا ہے ۔ اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اُسے ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے ۔

ابھی وہ چھ منزل تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک ایک کار نے آگے بڑھ کر اُس کی اسکوٹر کا راستہ روک لیا ۔ اُس میں سے دو جانے پہچانے چہرے جھانک رہے تھے مُسکراتے ہوئے ۔

"ملہوترا صاحب، کہاں جا رہے ہیں ؟ ہمیں تو آپ کی بڑی تلاش تھی ۔ کل تو ہم ضرور آپ کے آفس میں آتے ۔۔۔ اچھا ہوا، آپ آج ہی مل گئے ! "

دامودر گپتا کار میں سے باہر نکل آیا اور اُس کی اسکوٹر کے ہینڈل پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا ۔ اُس نے اپنے کندھوں کا سارا بوجھ اپنے بازوؤں پر ڈال دیا تھا ۔۔۔ ایک مکار آدمی کی مخصوص ادا کے ساتھ ۔

اُسے دیکھ کر اندر کا خون کھول اُٹھا ۔۔۔ اُس کا جی چاہا اُسے تھپڑ مار کر بے ہمت کر دے ۔۔۔ اُسے آج اُس کی داشتہ کے سامنے ہی ذلیل کرنا ٹھیک ہو گا ۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا ۔ زمین پر ایک پاؤں ٹکا کر اسکوٹر پر خاموش بیٹھا رہ گیا ۔

"ہمارے ساتھ چلئے نا ملہوترا صاحب ! جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں جا کر آپ سچ بہت خوش ہوں گے ۔ لیکن یہ نہ پوچھیے کہ کہاں ! ورنہ سارا سسپنس ہی ختم ہو جائے گا ۔۔۔ "

" ہاں، ہاں ملہوترا صاحب ! آپ وہاں چل کر بالکل بور نہیں ہوں گے ۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں "۔ یہ بات ریتو پنڈت نے کار میں آگے بیٹھے بیٹھے کھڑکی میں سے سر نکال کر کہی ۔

اندرا اپنی بیزاری ختم کرنے کے لئے سڑک پر جا رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں فوراً نہیں آسکا کہ انکار کر دے یا پھر ساتھ ہو لے !

"لیکن میرے پاس تو اسکوٹر ہے اور آپ لوگ گاڑی میں ہیں ۔"

"اِسے آپ میڈیکل کالج کے اسٹینڈ پر رکھ دیجئے — چلئے، ہم آپ کو وہیں سے پک اپ کرتے ہیں ۔"

"اچھا — "اس نے بڑی بے دلی سے کہا اور اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

راستے میں وہ ریور بینک کالونی کے سامنے سڑک پر سے گزرا تو اُس کا جی چاہا کہ وہ انہیں غچہ دے کر پنکی کے گھر کی طرف چل دے — لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ اُن کے پیچھے پیچھے ہی چلتا رہا۔ وہ لوگ میڈیکل کالج کے گیٹ پر پہنچ کر اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اپنی اسکوٹر اسٹینڈ پر چھوڑ کر اُن کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔

چوک سے گزر کر وہ ہردوئی روڈ کے ایک بہت بڑے مکان کے سامنے رُک گئے — عمارت بہت ہی قدیم تھی لیکن اُس میں کافی جدید کاری کی گئی تھی اور بے اندازہ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ سنگِ مرمر کی منقش ٹائلیں دیواروں اور فرش پر جا بجا جمائی گئی تھیں۔ محرابوں اور گیلریوں پر بھی کئی کئی رنگوں کے نقش و نگار تھے۔ مکان کے سامنے والے حصے پر چھت پر ایک بہت بڑا ہوائی جہاز بنا یا گیا تھا۔ جو اندر سے دراصل ایک بہت بڑا ہال تھا۔ بڑے سلیقے سے سجایا ہوا۔ دیواروں پر شیروں کی کھالیں آویزاں تھیں۔ نوابی عہد کی کئی پینٹنگز اور تصاویر بھی۔ بھُس سے بھرے ہوئے دو شیر اور ہرن بھی ایک کونے میں ایک پیڈسٹل پر رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر قیمتی قالین، اُگالدان، دیوان، گاؤ تکئے اور گہرے صوفے بچھے ہوئے تھے۔ دروازے کے پاس ایک بہت بڑے مگرمچھ کی مضبوط کھال پھیلی ہوئی تھی۔ اور ایک کونے میں ایک بہت بڑا پیتل کا قدیم حُقہ بھی سجا ہوا تھا جس کی دس بارہ فٹ لمبی ناڑی اُس کے گرد کسی سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

وہاں کئی لوگ جمع تھے۔ ان میں سے کئی ایک تو وہی تھے جن سے وہ کہیں نہ کہیں پہلے بھی مل چکا تھا۔ بعض چہرے بالکل نئے تھے۔ جب اُن سے تعارف کرایا گیا تو معلوم ہوا وہ سب بڑے بڑے بیوپاری ہیں۔ سیمنٹ، فرٹلائزر، اسٹیل اور لوہے کے — کچھ ایڈووکیٹ اور سرکاری افسر بھی تھے۔ بعض کے ساتھ حسبِ معمول ان کی دلکش عورتیں بھی تھیں۔ انہی کے درمیان صاحبِ خانہ براجمان تھے۔ شیخ ابراہیم بخش جو عمارتی لکڑی کے ایک بہت بڑے گودام کے مالک تھے — یہ کوٹھی اُن کے باپ دادا کی موروثی تھی جو کبھی بڑے بڑے جنگلوں کے ٹھیکیدار تھے۔ اُن کا شمار شہر کے متمول ترین خاندانی رئیسوں میں ہوتا تھا۔ کئی ٹرسٹوں میں اُن کا عمل دخل تھا — اُن کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں کئی قصے مشہور تھے۔ ایک بیاہتا بیگم کے علاوہ ان کی چند رکھیلیں بھی تھیں جنہیں وہ الگ الگ فلیٹوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ چار بھائی تھے۔ سب کے

سب شریف اور عیاش بھی وہ چاروں الگ الگ سیاسی جماعتوں کے ہمدرد تھے۔ عملی سیاست
سے دُور رہ کر بھی ان کی روپے پیسے سے دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ اتر پردیش میں حکومت کئی بار
بدلی لیکن شیخ بھائیوں کا امیج کبھی نہ بگڑا ـــــ ان کا کاروبار اور اُن کی مقبولیت بڑھتی ہی رہی۔

اس مکان میں جسے ہوائی جہاز محل کہا جاتا تھا اتنے زیادہ لوگوں کا اجتماع دراصل
دامودر گپتا ہی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ ریتو پنڈت اپنے شوہر سے طلاق لینے کے بعد کافی
قرضدار ہوگئی تھی۔ اگرچہ دامودر گپتا اُس کی کافی مدد کر دیتا تھا لیکن وہ قسطوں پر لئے اپنے
فلیٹ کو بڑے آرٹسٹک ڈھنگ سے سجانے میں لگی رہتی تھی۔ بطور آرٹسٹ وہ ابھی اور مالی تحفظ
چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے ریتو پنڈت بنیفٹ فنڈ، کے نام پر رونددالیہ میں ایک ناٹک
پیش کیا جارہا تھا اس میں ریتو پنڈت کا رول ہیروئن کا تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لئے ٹکٹوں
کے دام بہت زیادہ رکھ کر اب ان کو بکوانے کا مسئلہ تھا جو سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس کے بڑے
افسروں کے تعاون کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان افسروں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک سو کے
قریب بیوپاریوں کو سو سو اور پچاس پچاس کے ٹکٹ خرید لینے کے لئے فون پر ہی کہہ دیا۔ اور
اُن پر یہ ذمہ داری بھی ڈال دی کہ وہ اپنے اپنے حلقے کے دوسرے لوگوں کو بھی اس ناٹک کی سرپرستی
کے لئے کہہ دیں۔

شیخ ابراہیم اس پروگرام کے سرپرست اعلیٰ تھے۔ انہوں نے اڑھائی ہزار روپوں کا گرانقدر
عطیہ وہیں نقد پیش کر دیا۔ اور بھی کئی لوگوں نے دس دس اور بیس بیس کے کئی کئی ٹکٹ
خرید لئے یا انہیں بکوانے کی ذمہ داری قبول کرلی ـــــ اندر کمار ملہوترا کو بھی پانچ پانچ روپوں کے
پچاس ٹکٹوں کی ایک گڈی لے لینی پڑی۔ اُس نے سوچا ان ٹکٹوں کو وہ اپنے اسٹاف میں
بانٹ دے گا۔ اس کے ماتحت کام کرنے والے لوگ اس کا لحاظ کر کے یہ ٹکٹ خرید ہی لیں گے۔
اس طرح وہیں پر ایک ہی میٹنگ میں پورے ہال کی سیٹوں کی ٹکٹنگ کا پیشگی انتظام کرلیا گیا۔

کوئی بھی کلچرل پروگرام ان لوگوں کے تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے آرٹسٹ
اُن کے پیچھے پیچھے گھوما کرتے ہیں۔ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے وہ انہی کے مرہونِ منت
رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو وہ جب تک کوئی امتیازی حیثیت نہیں دیتے۔ ان کے نام پوسٹروں
پر نمایاں طور پر نہیں چھاپتے یا اپنے سووینروں میں اُن کی تصاویر اور اُن کے پیغامات نہیں
شائع کرتے تب تک یہ لوگ اُن کی مالی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہ لوگ اپنے
اثرات اور اپنی طاقت سے پوری طرح باخبر ہیں۔ جانتے ہیں کہ ان کی سہایتا کے بنا کوئی بھی
کلچرل پروگرام پیش کرنے کا منصوبہ بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ بچارے فنکاروں کے پاس
تو ہال کا کرایہ تک دینے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ وہ ڈراموں کے سیٹ بھی نہیں بنوا سکتے
ہیں۔ آپس میں چندہ کر کے کچھ کر بھی لیں تو ٹکٹ بکوانے کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ عام

آدمی فلم دیکھنے کا زیادہ شوقین ہے۔ ڈرامے میں اُس کی دلچسپی بہت کم ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ـــــ اسٹیج کے فن کو زندہ رکھنے کا شوق آرٹسٹوں کا ذاتی معاملہ بن کر رہ گیا ہے۔

اتنے بڑے بڑے بااثر سرپرستوں کے درمیان ڈرامے کے مصنف، ڈائریکٹر اور آرٹسٹوں کو چوہوں کی مانند سہما ہوا بیٹھا دیکھ کر انّی کو بہت افسوس ہوا۔ اسی کیفیت کے تحت اُس نے ان کی کچھ ٹکٹیں بکوانے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

ریتو پنڈت ایک کلاکار تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک عورت بھی تھی۔ ایک اچھے کھاتے پیتے بیوپاری کی رکھیل بھی ـــــ جسے اپنی جسمانی دلکشی کا پورا احساس تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو سیٹھ سوریا کے پاس بیٹھی رہی اور رلکا پیتی رہی۔ جبکہ سیٹھ موریا کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کے افسروں کے بیچ میں جا بیٹھی اور اُن کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتی رہی۔ دامودر گپتا کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ ریتو پنڈت ان افسروں کے ساتھ تعلقات بڑھائے وہ اسے اپنے کاروبار کے لئے ایک بہت بڑا وسیلہ سمجھتا تھا۔

انّی وہاں سے چپکے سے کھسک لیا۔ وہاں اور زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے کی اُسے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئی اُس کی آج کی شام کا بہترین حصّہ غارت ہو چکا تھا۔

اُس نے پنکی کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ اگر وہ جاگ رہی ہو گی تو اُس کے ساتھ گپ شپ کرے گا۔ تھوڑی سی دیر کے لئے ہی سہی ـــــ ہو سکتا ہے وہ اُس کے ساتھ گومتی ندی کے تٹ پر ٹہلنے کے لئے بھی راضی ہو جائے۔ ایسا ناممکن نہیں تھا۔ وہ بھی اُس سے ملنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔

لیکن وہ ریور بنک کالونی میں پہنچا تو اُن کے مکان کی ساری بتّیاں بجھی ہوئی نظر آئیں۔ وہ لوگ سو چکے تھے۔ لیکن اُسے اچانک پنکی کے کمرے میں شیشوں کے پیچھے سے بہت مدّھم روشنی دکھائی دے گئی۔ وہ شاید ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ابھی پڑھ رہی تھی۔ وہ دروازے پر دستک دینے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُس کے والدین جاگ جاتے۔ وہ کتنی دیر تک سڑک پر کھڑا کھڑا سوچتا رہا۔ کیا کرے ـــــ اُس کے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی خوب صورت شام کے زیاں کا نعم البدل یقیناً پنکی ہو سکتی تھی۔

اُس نے ایک دو بار اسکوٹر کا ہارن بھی بجایا جس کی آواز سنّاٹے میں دُور دُور تک گونجتی ہوئی چلی گئی۔ فٹ بال کی طرح لڑھکتی ہوئی سی۔ لیکن پنکی کی کھڑکی نہیں کھلی۔ اُس کی رگوں میں اضطراب اور بڑھ گیا۔ پنکی سے ملاقات ضرور ہونی چاہیے ـــــ ابھی فوراً ! وہ اُس سے ملے بغیر گھر نہیں جائے گا۔

اُس نے زمین پر سے ایک دو کنکر تلاش کئے۔ ایک چھوٹا سا پتھر اُس کے ہاتھ لگا۔ اُسے پنکی کی کھڑکی پر پتھر پھینکنے کا خیال بہت عجیب سا لگا۔ لیکن وہ خود کو روک نہ سکا۔ ایک شیشہ ٹھن سے ٹوٹ گیا۔ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ اُس نے جیسے اپنے دل کی دھڑکن روک لی۔ اُس نے یہ غلط حرکت کی تھی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی ہر طرف گونج گونج گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اُس کے والدین بہت گہری نیند سو رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جاگا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی چوکنے نہ ہوئے۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کسی کا شیشے کا جگ یا گلاس فرش پر گر کر ٹوٹ گیا ہوگا۔ لیکن پنکی سمجھ گئی۔ یہ حرکت اِنّی کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنا ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

اُس نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کھولی اور اندھیرے میں جھانکا۔ کچھ لمحوں تک نیچے سڑک پر دیکھتی رہی۔ اِنّی اُسے ایک سائے کی طرح معلوم ہوا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے نیچے آجانے کے لئے اشارے کر رہا تھا۔ پنکی پھر بھی بے حس و حرکت رہی۔ اُسے بس گھورتی رہی۔ یہ وقت ملنے کے لئے مناسب نہیں تھا۔ اُس کے ممی ڈیڈی کی آنکھ کھل گئی تو کیا ہوگا؟

پھر اُس نے کھڑکی بند کر دی۔ یہ دیکھ کر اِنّی کو بڑا دھکا لگا۔ وہ سٹ پٹا کر رہ گیا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ وہ کتنے لمحوں تک سخت اضطراب کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے! اُسے پشیمانی بھی ہو رہی تھی۔ وہ یہاں تک آیا ہی کیوں ہے؟ اس کی یہ حرکت تو اور بھی اوچھی تھی۔ شیشے کو پتھر مار کر توڑنے کی۔ پنکی اُسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

وہ وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اُسے سیڑھیوں کے نچلے حصّے پر کوئی کھڑا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ پنکی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑی احتیاط سے نیچے اتر کر آئی تھی۔ شاید ننگے پاؤں ہی! وہ لپک کر اُس کے پاس پہنچا —— وہ واقعی پنکی تھی۔ لیکن بہت ہی غصّے میں

پنکی نے اُس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور پھسپھسا کر بولی —— "تم مجھے کسی روز پٹوا کر ہی رہوگے! معلوم ہے۔ ممی ایک بار مجھے سخت ڈانٹ پلا چکی ہیں۔ مجھ سے ملنے کا کیا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا؟ شرم نہیں آتی تمہیں!"

اِنّی ابھی تک اُسی جذباتی صدمے میں مبتلا تھا —— "تم نہیں جانتیں آج مجھ پر کیا گذری! میں نے تمہاری کمی اتنی شدت سے پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ میں اپنی حرکت پر شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اب تم مجھ سے دُور دُور مت رہا کرو —— مجھے سمجھنے کی کوشش کرو —— مجھ سے دن میں ایک بار ضرور مل لیا کرو۔ پلیز!"

کچھ خوشامد کر کے وہ اُسے اپنی باہنوں میں لے لینے میں کامیاب ہوگیا۔ دونوں وہیں سیڑھیوں کے درمیان بیٹھ گئے —— ایک دوسرے سے لپٹ کر —— اُس نے پنکی کو پہلی بار اتنی بے تابی سے چوما اور بار بار ایسا کیا تو پنکی دم گھٹنے سے گھبرا اُس سے الگ ہو گئی۔

"بس بس! بہت ہو چکا۔ اب جاؤ۔"

لیکن اِتی نے اُسے پھر قریب کر لیا۔ اپنے ساتھ پوری طرح جکڑ لیا۔ اُس کے نرم نرم گھنے بالوں میں اپنا چہرہ ڈبو سا لیا۔ پھر اُس کے کان پر اپنا منہ رکھ کر بولا —— "تمہیں اغوا کر کے لے جاؤں؟ یہ وقت اس کام کے لئے کتنا موزوں ہے! کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہو گی!"

"ہٹو اب! تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو!" وہ جلدی سے چند سیڑھیاں اوپر چلی گئی۔ پھر ذرا جھک کر آہستہ سے بولی —— "یہاں سے اسکوٹر اسٹارٹ کر کے مت لے جانا۔ سمجھے! نہیں تو سب جاگ جائیں گے۔"

جب وہ اسکوٹر کو دھکیلتا ہوا اُس سے دُور جا رہا تھا تو وہ اس بات سے بے حد مسرور تھا کہ اُس کے نتھنوں میں پنکی کے سارے جسم کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر پنکی کی ساری مٹھاس موجود تھی۔ اُس کی دن بھر کی بے زاری ختم ہو چکی تھی۔

نو/۹

جس شام کو رویندر الیہ کے جدید اسٹیج پر اودھ آرٹس کلب کی طرف سے ڈراما روشنی روشنی پیش کیا گیا وہاں اِندرا اور پنکی ساتھ گئے تھے۔ سارا ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن انٹرول میں یہ دیکھ کر رانی حیران ہوا کہ آگے کی قطار میں ایک سیٹ پر اپرا مدھوک بھی موجود تھی۔ آگے کی ہر ایک سیٹ سو سو روپے میں بیچی گئی تھی۔ اتنے روپے وہ یقیناً خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ چونکہ وہ بہت پیچھے کی ایک قطار میں بیٹھے تھے اس لئے اندر فوراً نہ جان سکا کہ اپرا کے دائیں بائیں کون کون لوگ تھے۔ اُس نے پنکی کو اشارے سے اپرا مدھوک کے بارے میں بتایا جواب اپنے دائیں طرف کے کسی شخص سے بات کرنے لگی تھی۔

"اس کا نام مت لو رانی!"

پنکی نے نفرت سے منہ پھیر کر کہا اور رانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ڈراما ختم ہونے تک وہ اُس کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی اور اُس کے کان میں چپکے چپکے ڈرامے کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔

ڈراما واقعی اچھا تھا۔ موضوع اور پیش کش کے نقطۂ نظر سے کام کرنے والوں کی اداکاری بھی معیاری تھی اور سیٹ بھی حقیقی لگتا تھا۔ سارا ڈراما ایک مکان کے سامنے اُجاڑ پڑے لان پر ہوتا رہا تھا۔ ریٹو پنڈت کا رول اُس میں ایک ہیلتھ وِزٹر کا تھا جسے اُس نے بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔

پنکی نے بتایا —— "میں جب آئی ٹی کالج میں پڑھتی تھی تو میں نے بھی شیکسپیئر کے ڈرامے 'میکبتھ' میں ایک چھوٹا سا رول کیا تھا۔"

اندر نے پوچھا —— "کیا اب بھی تم کسی ڈرامے میں کام کرنا پسند کرو گی؟"

"ہاں !! !" اُس کے منہ سے ایک لمبی ہاں نکلی ـــــ "کیوں نہیں کروں گی ! اگر اسی ڈرامے کو پھر سے پیش کیا جائے اور مجھے ریتو پنڈت ہی کا رول دے دیا جائے تو !"

اس پیچھے بیس زیادہ تر لوگ آرٹ اور ادب سے گہری دلچسپی رکھنے والے ہی تھے ان کے درمیان ریتو پنڈت کو ایک مرکزی کشش کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ شاید یہ دیکھ کر پنکی کے اندر حسد کی چنگاری بھڑک اُٹھی تھی۔

ڈراما ختم ہو چکا تھا ـــ وہ دونوں جب باہر نکل رہے تھے تو اسٹیج کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر انہیں ریتو پنڈت دکھائی دے گئی جو بے شمار مدّاحوں سے داد وصول کر رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ابھی تک گہرا میک اَپ پُتا ہوا تھا اور وہ ابھی تک خون آلود لباس پہنے ہوئے تھی۔

اِندر کا جی چاہا کہ وہ بھی آگے بڑھ کر اُسے مبارکباد پیش کر دے۔ لیکن پنکی نے اُس کا بازو دبا کر روک لیا۔

بھیڑ کے پیچھے ایک جگہ انہیں اپرا مدھوک بھی دکھائی دی جو دامودر گپتا کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اندر کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پھر سے کتنی جلدی گپتا کے قریب ہو گئی ہے۔ اگرچہ وہ اسی بات کی توقع بھی رکھتا تھا۔

اپرا نے اندر کو دیکھا تو سر جھکا لیا۔ اُس نے اپنے باس کو نمسکار تک نہیں کیا۔ اندر کے چہرے پر خفگی کے آثار اُبھرتے دیکھ کر پنکی نے ایک راحت سی محسوس کی۔ اس نے بازو کو اور کس کر پکڑے پکڑے وہ اُسے باہر لے گئی۔ ۔ ۔ ۔

آفس میں اپرا مدھوک کی اندر ملہوترا سے ملاقات دن میں کئی کئی بار ہوتی تھی۔ وہ اُس کے کیبن میں آکر ڈکٹیشن، لے جاتی تھی۔ لیکن اندر نے اُس سے دامودر گپتا کے ساتھ اُس کی دوستی کے بارے میں کبھی کچھ نہ پوچھا ـــــ اُسے پوچھنے کا حق ہی کیا تھا! اگر اُس نے دامودر گپتا کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے ہیں تو یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن ایک روز انہیں ایک کلب میں موجود دیکھ کر اُسے واقعی دکھ پہنچا۔

جیم خانہ کلب میں وہ کبھی کبھی جا نکلتا تھا ـــــ بلیرڈ کھیلنے اور بیئر پینے کے لئے۔ کبھی کبھی کسی خاص دوست سے ملنے کے لئے بھی ـــ بنکی اُسے ہر روز شام کو نہیں مل سکتی تھی۔ اسی لئے وقت گذاری کے لئے وہ اس کلب کا ممبر بن گیا تھا۔

وہاں بھی زیادہ تر لوگ تجارت پیشہ تھے۔ بلیک کی کمائی کو وہ وہاں شراب و کباب پر بے دریغ لٹاتے تھے ـــــ برج اور تاش کے دوسرے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ جس میں روپیہ ہارا یا جیتا جاتا ہے ـــــ اس شوق کو پورا کرنے والوں میں موٹر ٹائر والے، گھڑیوں والے، دوا ساز، امپورٹ ایکسپورٹ کے نام پر اسمگلنگ کا دھندا کرنے والے، کچھ نوجوان وکیل، ریس میں دلچسپی لینے والے، سیاسیات کے نئے اُمیدوار اور غیر اہم کالم نویس، پریس ایڈیٹر اور ٹھیکیدار اور سرکاری محکموں کے ایسے افسر جنہیں رشوت لینے کے بے پناہ مواقع ملتے تھے ـــــ سب ہی طرح کے لوگ شامل تھے کوئی کوئی ایسا با اثر و صاحب اقتدار بھی آ نکلتا تھا جو اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ وہ اس لئے وہاں جانے پر مجبور تھے کہ اپنے گھر پر وہ آزادی سے شراب نہیں پی سکتے تھے۔

ڈرامے کی پیشکش کے فوراً بعد ریتو پنڈت بمبئی چلی گئی تھی۔ کسی فلم میں کام حاصل کرنے کے لئے وہ لکھنؤ کے ایک بااثر شخص کا سفارشی خط بھی لے کر گئی تھی جو کبھی کبھی فلم سازوں کو سود پر روپیہ فراہم کر دیتا تھا ــــ وہ جنگلات کا ٹھیکیدار تھا۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔

ریتو پنڈت کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ دامودر گپتا کی رکھیل ہے۔ اُسی نے جنگلات کے ٹھیکیدار سے کہہ سُن کر ریتو کو بمبئی بھجوا دیا تھا۔ اب وہ اکیلا تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ ایک نئی لڑکی کو دیکھ کر اُس کے جاننے والوں کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ انہیں معلوم تھا یہ شخص زیادہ دیر تک کبھی اکیلا نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے ایک نیا ساتھی ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

اپرا مدھوک کو اُس نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے دوستوں سے متعارف کرایا۔ لیکن وہ اُسے اندر ملہوترا کے ساتھ ملاتے ہوئے جھجک گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا وہ اُس کی اسٹینو ہے۔ پھر بھی وہ دھیرے سے کہہ گیا ــــ "ملہوترا صاحب، اِس لڑکی کی چھپی ہوئی خاصیتیں ابھی مجھے دریافت کرنی ہیں۔ اس کی بھی حوصلہ افزائی کرنا میرا پرم دھرم ہوگا۔"

اِنّی نے اپرا کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ اپرا بھی اُسے کچھ لمحوں تک گھورتی رہی۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جس میں وقار اور خود اعتمادی کی جھلک بھی تھی۔

اِنّی نے کلب کے ماحول میں خود کو افسر بنائے رکھنا مناسب نہ سمجھا ــــ اپنے دوستوں سے تو وہ یہاں بڑی بے تکلفی سے ملتا تھا۔ یوں بھی اُس نے سرکاری افسروں والی روائتی بُو باس اپنے پاس کبھی بھٹکنے نہیں دی تھی۔ اپرا مدھوک کی موجودگی میں وہ سب کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ بیئر کا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے یا بلیرڈ کھیلتے ہوئے۔ لیکن وہ خود کو یہ سوچنے سے بھی باز نہیں رکھ سکا کہ اس لڑکی کا اُس کی اسٹینو ہونا کسی روز اُسے پریشانی میں مبتلا کر سکتا ہے ــــ اُس کے آفس والے ایک نہ ایک دن جان ہی جائیں گے کہ وہ دونوں جیم خانہ کلب میں اکثر دیکھے گئے ہیں۔ اتنے بڑے کلب میں معمولی تنخواہ پانے والی ایک اسٹینو بغیر کسی کی سرپرستی کے کیونکہ جا سکتی ہے۔ وہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھیں گے کہ اپرا مدھوک کا حقیقی سرپرست اُن کا باس نہیں بلکہ دامودر گپتا ہے۔

اندر ملہوترا کا باس مقیم احمد فاروقی بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس نے زیادہ سوچنا ضروری نہ سمجھا۔ سر جھٹک کر اس چنتا کو ذہن سے نکال دیا۔ ہر شخص اپنی ذاتی زندگی اپنے طور پر گذارنے کے لئے آزاد ہے۔ اپرا مدھوک کو وہ خود کبھی ساتھ لے کر

نہیں جاتا ہے۔ وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ وہاں جایا کرتی ہے۔

اُس روز اُسے یہ احساس یقیناً ہو رہا تھا کہ وہ خلافِ معمول بہت اچھا کھیل رہا ہے۔ اپرا مدھوک ایک میز پر بیٹھی اُس کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ اُس دن اُس نے دامودر گپتا کو بھی اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی مہربان پایا۔ وہ اُس کے لئے دو بار بئیر لے کر آیا تھا۔ جسے اُس نے شکریہ کہہ کر قبول کر لیا تھا۔ دامودر گپتا چاہتا تھا وہ اُس کے اور اپرا مدھوک کے آپسی تعلقات پر تعرض نہ کرے۔ لیکن ایسا کرنے والا میں ہوتا ہی کون ہوں! اندر ملہوترا نے اپنا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف کر لیا تھا۔

۱۱
گیارہ

اُس کے بعد تو اِیرا مدھوک کا یہ معمول بن گیا۔ وہ ہر شام کو گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے دامودر گپتا کے ساتھ کلب ضرور پہنچتی تھی۔ وہاں اور بھی کئی عورتیں جاتی تھیں — ادھیڑ اور جوان — اور کبھی کبھی کوئی نوخیز لڑکی بھی وہاں دکھائی دے جاتی جو اپنے ماں باپ ہی کے ساتھ ہوتی تھی۔ ان سب عورتوں کے ساتھ اِیرا مدھوک کی دوستی ہو گئی تھی۔ اُن کے مردوں کے ساتھ بھی اُس کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اُس ماحول میں یہ کوئی نہیں دیکھتا تھا کہ کون سی عورت کس مرد کی بیوی ہے یا اُس کی محض داشتہ — وہاں گونجنے والے قہقہوں میں ساری اخلاقیات ساری پس و پیش ڈوب کر رہ جاتی تھی۔ اِیرا مدھوک بھی وہاں کھل کر ہنستی تھی۔ اُس کے قہقہے اندر کے کانوں میں برابر پہنچتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کسی بات پر اُس کے ساتھ بھی بڑی بے تکلفی سے ہنس بول لیتی تھی۔ اگرچہ آفس میں وہ ایک دوسرے کے سامنے پھر سے سنجیدہ بن جاتے تھے۔ اِیرا کے اندر یہ تبدیلی دیکھ کر اِندر کو اب صدمہ نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس بات کا متمنی رہا تھا کہ وہ کسی آدمی کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہو جائے۔ لیکن وہ آدمی اُسے ایک داشتہ کے طور پر نہیں، بیوی کے رُوپ میں قبول کرے۔ اِسی ماحول میں کئی لڑکیوں کو اپنے پسندیدہ جیون ساتھی مل گئے تھے۔

وہ چاہتا تھا کہ کسی روز اِس مسئلے پر اِیرا مدھوک کے ساتھ سنجیدگی سے بات کرے — اُسے وہ سمجھا دے کہ وہ اتنی آزاد تو یقیناً ہے کہ کہیں بھی اور کسی کے بھی ساتھ ہر جگہ آ جا سکتی ہے — لیکن اگر وہ ذرا ہوشیاری سے کام لے، بلکہ کسی قدر چالاکی سے بھی تو کسی اچھے مرد کو اپنے قریب لے آئے۔

اندر نے خود بھی اُسے ایک دو بار غیر شادی شدہ نوجوان افسروں سے متعارف

کرایا تھا۔ اپنا ایک فرض سمجھ کر — اور یہ توقع رکھ کر بھی کہ وہ کسی دن اچانک اپنی شادی طے ہو جانے کی خوشخبری لے کر اُس کے پاس آئے گی۔ اُس کے من پر پڑا ہوا بوجھ تب ہی اُتر سکے گا جسے وہ ابھی تک محسوس کرتا تھا۔ اس لڑکی کی زندگی میں مایوسی لے آنے کے لئے کسی حد تک وہ خود کو بھی ذمّہ دار سمجھتا تھا۔

۱۲
بارہ

ریتو پنڈت بمبئی میں لگ بھگ دو ماہ گذار کر واپس آگئی۔ وہاں اُسے فلموں میں کام ملنے میں کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی لیکن وہاں سے وہ اپنے ساتھ ایک نوجوان مراٹھی شاعر بیکنٹھ شولاپورکر کو ضرور لے آئی جو اسٹیج پر ڈراما پیش کرنے کی خاصی صلاحیت رکھتا تھا۔

بیکنٹھ شولاپورکر کی کلاکار بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب اُسے اپنی زندگی کی خلا کو پُر کرنے کے لئے ایک اور باذوق عورت کی ضرورت تھی۔ وہ ریتو پنڈت سے چند برس چھوٹا تھا۔ پھر بھی وہ اُسے بے طرح چاہنے لگا تھا۔

ریتو نے لکھنؤ پہنچتے ہی اپنے حلقے میں سب کو بتا دیا تھا کہ وہ جلد ہی بیکنٹھ شولاپورکر کے ساتھ شادی کرنے والی ہے۔ اس خوشخبری کا سب سے زیادہ گرمجوشی سے خیرمقدم دامودر گپتا نے کیا۔ جیسے وہ واقعی یہی چاہتا تھا کہ ریتو پنڈت جلد از جلد کسی نہ کسی کے ساتھ شادی کر لے! ریتو ایک عرصہ سے اس بات پر اُس سے احتجاج کر رہی تھی کہ اب وہ اور زیادہ مدت تک اُس کی رکھیل نہیں بنی رہنا چاہتی۔ وہ اُسے مجبور کیا کرتی تھی کہ وہ اُسے بیوی کا درجہ دے دے۔ کیونکہ اب وہ اس طرح کے ناجائز تعلقات کی زندگی سے تنگ آ چکی تھی —— اُسی کی خاطر اُس نے اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ دیا تھا جو کسی دفتر میں ایک معمولی کلرک تھا۔ وہ اُس کے ادبی و آرٹسٹک ذوق کو تو کیا بڑھاتا، اُس کے لئے دو وقت کی اچھی روٹی کا انتظام بھی نہیں کر پاتا تھا۔ دامودر گپتا کو ایک مالدار تاجر اور آرٹ کا سرپرست سمجھ کر اُس نے اُس کے آگے سپر ڈال دی تھی۔ اگرچہ وہ عمر میں اُس سے کافی بڑا تھا۔ اُس کی بیوی موجود تھی جس سے اُس کے کئی بچے تھے۔ سب سے بڑے دو لڑکے اُس کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو چکے تھے۔

ریتو پنڈت کے ساتھ دامودر گپتا کے معاشقے کا علم اُس کے گھر والوں کو بھی تھا۔ لیکن گھر بھر پر اُس کا اس قدر دبدبہ تھا کہ کوئی اُسے روک نہیں سکتا تھا۔ لیکن اُس کی بیوی اُسے اتنی کھلی چھٹی ہرگز نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اُس پر ایک سوت لا کر بٹھا دے۔

اپنی اس مجبوری کے بارے میں دامودر گپتا نے ریتو پنڈت کو بتا دیا تھا۔ لیکن اُسے اس بات کا بھی یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ اُس سے شدید محبت کرتا ہے ــــ ڈراما آرٹس کے میدان میں وہ اُسے آسمان تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھے گا۔ ریتو پنڈت کو اُس کی ہر بات پر اعتبار تھا اور اُسے پورا احساس تھا کہ وہ واقعی اُس پر جان چھڑکتا ہے۔ اُس کی ہر ایک خواہش پوری کر دیتا ہے۔ کسی بات سے کبھی انکار نہیں کرتا۔ اُسی کی بدولت وہ لکھنؤ کے ایک بہت بڑے طبقے میں ایک اعلیٰ درجے کی آرٹسٹ کے طور پر شہرت حاصل کر چکی تھی۔ لیکن اسی طبقے کے بعض لوگ اُسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے ــــ اسی لئے وہ اُس سے اب شادی کر لینے کے لئے ضد پکڑ لیتی تھی۔

ایک دن جب دامودر گپتا کلب سے واپسی پر اُسے اُس کے گھر پر چھوڑنے کے لئے لے جا رہا تھا تو ریتو پنڈت نے ضد پکڑ لی کہ آج تو اُسی کے گھر جائے گی اپنے گھر ہرگز نہیں ــــ دامودر گپتا نے اُسے لاکھ سمجھایا مگر وہ باز نہ آئی۔ اُس کی کار میں سے باہر نکلنے سے ہی انکار کر دیا۔ دامودر گپتا سٹ پٹا کر رہ گیا ــــ اُس نے مجبور ہو کر کہا ــــ "اچھا تم میرے ساتھ چلو مگر گھر کے اندر مت آنا۔ گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہنا۔ میں اپنی بیوی کو سمجھا بجھا کر گھر سے باہر لے آؤں گا تاکہ وہ خود ہی تمہارا سواگت کر کے تمہیں اندر لے جائے"

وہ کئی گھنٹوں تک گاڑی کے شیشے چڑھائے اندر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ سرد رات کا سناٹا گہرا ہوتا رہا ــــ سڑک پر ساری آمد و رفت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ دامودر ابھی تک اپنی بیوی کو لے کر باہر نہیں نکلا تھا ــــ جس کی اب کوئی اُمید بھی اُسے نہیں رہ گئی تھی ــــ وہ اپنی بڑھیا کے پاس پلنگ پر لیٹا خراٹے لے رہا ہو گا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ ریتو کار میں سے باہر آ کر اُس کا دروازہ ہرگز نہیں کھٹکھٹائے گی۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ اُس نے اُسے جتنی دولت اور شہرت دے رکھی تھی اُس کے بدلے میں وہ اُس کی عزت پر کوئی دھبہ نہیں لگنے دے گی۔

ریتو پنڈت کو ایسی ہر بات کا احساس تھا۔ وہ واقعی اُس کی ساکھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ گاڑی کے اندر بھی رات کے اس سناٹے میں کب تک پڑی پڑی انتظار کرتی رہے گی۔ وہ کھڑکی کھول کر باہر بھی نہیں جھانک سکتی تھی کہ کوئی دیکھ لے گا۔ تو کیا کہے گا؟ وہ گاڑی چھوڑ کر اکیلے اپنے گھر بھی نہیں جا سکتی تھی کہ رات کی تنہائی میں ایک جوان عورت کا راستے میں چلنا اور بھی خطرناک تھا۔ وہ سہمی ہوئی، دبکی ہوئی کار کی پچھلی سیٹ پر لیٹی چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ اسٹیج کی ایک نامور آرٹسٹ جس کی اخباروں میں تصویریں چھپتی تھیں اُس کی اداکاری کے بارے میں کالم لکھے جاتے تھے، کیسی مجبوری کے عالم میں اس طرح پڑی ہوئی تھی!

رات کو تین بجے کے قریب دامودر گپت بڑی خاموشی سے گھر سے باہر آیا —— کار کا دروازہ کھول کر اندر آبیٹھا اور بہت دھیرے دھیرے ڈرائیو کرتا ہوا گاڑی کو شہر سے باہر لے گیا —— گومتی کے کنارے لا، مارٹینئر کالج کے وسیع گراؤنڈ پر اُس نے گاڑی روک لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا —— اور کہا ——

" ریتو اب اُٹھ بیٹھو ! بہت سو چکیں۔ مجھے معاف کر دینا ہیں، بیوی کو راضی کر کے تمہارے پاس نہیں لا سکا —— اُسے ہائی بلڈ پریشر تھا۔ بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے آج اُس سے کچھ کہنا سُننا مناسب نہ سمجھا —— پھر کسی اور روز سہی —— چلو لان پر بیٹھتے ہیں۔ یہاں سے صبح ہونے کا نظارا دیکھیں گے۔ "

لیکن کوئی جواب نہ پا کر حیرت سے پیچھے دیکھا —— وہاں سیٹ پر صرف شال پڑی تھی - ریتو وہاں نہیں تھی۔

اگلے روز وہ ریتو سے ملنے کے لئے گیا تو اس نے اپنی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ اور سبھی حیران ہوا —— وہ اُس کے ساتھ کلب میں گئی تو وہاں بھی لوگوں نے اُس کی مانگ میں بھرا ہوا سیندور دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا —— لیکن اُس نے سب سے دامودر گپتا کے سامنے کہہ دیا، اُس نے اُن کے ساتھ شادی کر لی ہے —— دامودر گپتا سے نہ اقرار کرتے بنی نہ ہی انکار۔ وہ سمجھ گیا، ریتو پنڈت اب بغاوت پر اُتر آئی ہے۔

ریتو نے خود کو اب ریتو گپتا کہنا شروع کر دیا اور کلب میں ایک شاندار دعوت دینے کا بھی اعلان کر دیا —— دعوت کے روز دامودر گپتا غائب رہا —— لیکن دعوت میں اُس کے جاننے والے سارے لوگ موجود تھے جن کا استقبال ریتو گپتا اکیلے ہی کرتی رہی۔

چھ ماہ کے بعد اُس نے اسپتال میں ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اُس نے اسپتال کے رجسٹر میں بچے کے باپ کا نام دامودر گپتا ہی لکھوایا۔ اس سے ان دونوں کے درمیان سخت ناچاقی پیدا ہو گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ اُن کے تعلقات پھر معمول پر آ گئے۔ دامودر پھر اُسے لئے لئے پھرنے لگا تھا —— اُن کا بچہ ایک یتیم خانے میں پرورش پاتا رہا۔

اب وہ بمبئی سے اپنے ساتھ شولاپورکر کو لے آئی تو دامودر گپتا نے ایک گہرا اطمینان محسوس کیا —— اُس نے کلب میں اعلان کر دیا کہ وہ ان دونوں کی شادی کے اخراجات برداشت کرے گا۔ بلکہ اس بیاہ میں کنیادان بھی وہی کرے گا۔ یعنی اب وہ ایک عاشق کے بجائے باپ کے فرائض انجام دے گا۔

دامودر گپتا کئی دنوں سے کلب سے غائب تھا۔ ریتو اور شولاپورکر بھی دکھائی نہیں دیے ——— ایرا مدھوک شام کو بلا ناغہ آتی رہی۔ وہاں اُس کے جاننے والوں کی کمی نہیں تھی ——— اندر ملہوترا بھی کبھی کبھی آنکلتا تھا۔ اُن کے درمیان کبھی ہیلو، ہوتی کبھی بس اُن کی نظر ہی مل کر رہ جاتی تھی۔ ایک عام سی نظر ——— جس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ایک رات کو وہ کلب سے باہر نکلا تو اُس کے پیچھے پیچھے ایرا مدھوک بھی چلی آئی۔ لپک کر اُس کے قریب ہو گئی اور بولی ——— "سر! آپ جا رہے ہیں؟"

اُس نے ایرا کی طرف حیرت سے دیکھا ——— اس طرح کا سوال اُس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا ——— اپنی اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا ——— "اب جاؤں گا ہی! آٹھ بج رہے ہیں۔"

"آپ سے کچھ ——— گپتا جی کے بارے میں پوچھنا تھا ——— "وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

"دامودر گپتا کے بارے میں؟"

"جی۔"

"اُس کے بارے میں تو تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو ——— "اُس کے لہجے میں اچانک طنز کی آمیزش ہو گئی۔ اگرچہ اُس کے اس قدر اچانک ذکر سے اُس کا ماتھا بھی ٹھنک گیا تھا۔

ایرا مدھوک کچھ لمحوں تک خاموش کھڑی رہ گئی تو اُس نے پوچھا

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے گپتا کے بارے میں؟"

"جی، سر!" اُس نے سر جھکا کر کہا۔

اِندر نے اسکوٹر کا انجن بند کر دیا۔
"ہاں، بولو ـــــ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ اپنی پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے ڈالے بولا۔
وہ کچھ لمحوں تک پھر خاموش رہ گئی۔ جیسے کچھ کہنا اُس کے لئے اچانک مشکل ہو گیا ہو۔
"ارے بھئی کچھ بتاؤ تو! آخر بات کیا ہے؟" وہ کچھ غصّے سے بولا۔
"سر، میں اُسی کی وجہ سے ایک مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ آپ سے صلاح لینا چاہتی تھی۔"
اندر نے اور زیادہ حیرت سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آسکا تو کہا ـــــ "وہ آجکل کہیں باہر گیا ہوا ہے شاید! دکھائی نہیں دیا بہت دنوں سے!"
"سر، وہ میری ہی وجہ سے کہیں غائب ہو گیا ہے۔ ویسے تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ریتو اور رشولا پور کر کو مدھیہ پردیش کے ایک ڈراما گروپ سے ملانے کے لئے اندور جائے گا ـــــ وہ لوگ تو شملہ میں ہیں ان دنوں ـــــ اخبار میں ایسا چھپا ہے ـــــ لیکن گپتا جی ان کے ساتھ نہیں ہوں گے مجھے پورا وشواس ہے۔"
"پھر؟" اندر نے سگریٹ سُلگائی ـــــ "اگر وہ کہیں غائب بھی ہو گیا ہے تو تم سے مطلب؟"
"میں اُسی کی وجہ سے!" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ پھر الفاظ جمع کر کے بولی ـــــ
"ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے، میں جلد ہی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی!"
اِندر کئی منٹ تک گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا کھڑا رہ گیا۔ وہ جانتا تھا اپرا ایک نہ ایک دن ایسی مصیبت میں ضرور پھنس جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسی نادان ثابت ہو گی کہ کچھ احتیاطی تدابیر بھی نہیں کرے گی۔
"جب تم جانتی تھیں، لڑکیوں کے لئے یہ مصیبت ہوتی ہے تو تم نے بچنے کے اُپائے کیوں نہ کئے؟ تم تو پڑھی لکھی ہو، سمجھدار ہو!"
"سر، پھر بھی یہ سب کچھ ہو گیا۔" یہ کہتے کہتے اُس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔
"کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں کرتیں؟"
"اکیلی کس کے پاس جاؤں؟ اُنہی کو میری مدد کرنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ تو یہ خبر سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے!"
"وہ ڈرتا ہے نا! پہلے بھی اس طرح کا ایک واقعہ بھگت چکا ہے۔ ریتو پنڈت کے ساتھ ـــــ" اِندر کا لہجہ درشت ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"تم اُس کے گھر کیوں نہیں پہنچ جاتیں؟ اُس کی بیوی کو جا کر بتا دو۔!"
"کون اعتبار کرے گا وہاں؟ اور پھر کیوں شرن دیں گے مجھے! کھڑے کھڑے ہی نکال دیں گے!"

اندر کی سمجھ میں فوراً کچھ نہیں آسکا۔

وہ روتی ہوئی بولی —— "اب تو میرے لئے مرجانے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا ہے ——"

اندر کسی ایسے ڈاکٹر کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن اُس نے سن رکھا تھا ایسے کچھ کلنک کھلے ہوئے ہیں جو کافی بڑی رقم لے کر کنواری لڑکیوں کے ابارشن، کرا دیتے ہیں۔

کلب کے بند ہو جانے پر بہت سے لوگ اپنی اپنی گاڑیاں نکال رہے تھے۔ ایرا مدھوک کے وہاں اس طرح کھڑے کھڑے، رو رو کر باتیں کرنے سے کوئی چوکنا ہو کر اُن کے پاس ضرور آسکتا تھا۔ اس کے رونے کا سبب پوچھنے کے لئے۔ وہاں قریب قریب سب ہی لوگ ان دونوں کو پہچانتے تھے۔

اُس نے جلدی سے کہا —— "اچھا اچھا، اب چپ ہو جاؤ۔ میں کسی سے پوچھوں گا۔ لیکن تمہارے پاس فیس دینے کے لئے کچھ ہے؟"

ایرا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے —— "سر، کتنی لگے گی فیس؟ دو سو روپے تو میرے پاس ہیں۔"

اِنّی نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا —— یہ تو بہت کم ہیں۔ تم میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ایک جگہ جا کر پوچھتا ہوں۔"

وہ اُسے اپنے پیچھے بٹھا کر مین روڈ پر لے آیا۔ اُس کے دل میں اچانک ہمدردی پیدا ہو گئی تھی —— اس لڑکی کا رشتہ اُس کے دوست سریندر کپور کے ساتھ ہو گیا ہوتا تو آج وہ اُسی کے بچّے کی ماں بن گئی ہوتی۔ لیکن اُس کے غلط روّیے کی وجہ سے اس لڑکی کی زندگی تباہ ہو گئی ہے۔

وہ اُسے ہیوٹ روڈ پر لے گیا —— وہاں اُس نے ایک دو بار گزرتے ہوئے ایک لیڈی ڈاکٹر کا سائن بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا۔ اُس نے ایک دو چکر لگا کر وہ جگہ ڈھونڈ لی —— اندر گیا تو اُسے ایک بھرے بھرے جسم والی سانولی لیکن باوقار خاتون ایک میز کے سامنے بیٹھی نظر آئی جس کے پاس ایک دھان پان قسم کا شخص بیٹھا تھا۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ اندر اور ایرا کو دیکھتے ہی اُنہوں نے ہنسنا بند کر دیا۔ اُنہیں خالی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا گیا۔

اندر اور ایرا مدھوک کچھ لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے۔ وہ اُس آدمی کی موجودگی

میں کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر اُن کی جھجک کا سبب سمجھ کر بولی ——— "یہ میرے پتی ہیں۔"

لیکن اُس کا شوہر فوراً اُٹھ کر باہر چلا گیا ——— ساتھ والے کیبن میں سے کسی نوزائیدہ بچّے کے رونے کی آواز آنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر اُن دونوں کی طرف گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔

آخر اندر نے الفاظ جمع کر کے کہا ——— "ڈاکٹر صاحب، انہیں ذرا دیکھ لیجئے۔"

ڈاکٹر اُسے اسکرین کے پیچھے لے گئی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد واپس آگئی ——— اپرا کو اندر ہی چھوڑ کر ——— اور بولی

"ابھی بہت زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔ تین مہینے اُوپر کچھ دن ——— اور پوزیشن بالکل ٹھیک ہے ——— ڈلیوری کہاں کرائیے گا؟ یہیں آتے رہیے گا تو دیکھ لیا کروں۔"

اُس نے کچھ دوائیں لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں لے لیا۔

اندر تھوڑا کچھ پس و پیش کے ساتھ بولا ——— "ڈاکٹر صاحب، کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ یہ پریشانی ہی ٹل جائے!"

لیڈی ڈاکٹر کچھ لکھتے لکھتے رُک گئی۔ اُس نے اِندر کی طرف گھور کر دیکھا۔ بولی ——— "ہم ایسے کیس ہاتھ میں نہیں لیتے۔"

لیکن اِندر اُس کے انکار سے بددل نہیں ہوا۔ اُس نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر گِنے۔ اور پھر اُس کے سامنے میز پر رکھ بولا۔

"فی الحال یہ تین سو ہیں۔ آپ مہربانی کر کے ان کی پریشانی دُور کر دیجئے۔"

نوٹ دیکھ کر ڈاکٹر کا چہرہ کچھ نرم پڑ گیا۔ بولی ——— "وہ تو خیر ٹھیک ہے ——— میں بھی سمجھتی ہوں آپ کہتے ہیں تو ایسا کر دوں گی۔ لیکن یہ بہت کم ہیں ——— اتنا تو ہم نارمل ڈلیوری کے لئے بھی نہیں لیتے ہیں۔"

"اچھا ——— آپ جیسا فرمائیں گی ویسا ہی کر دیا جائے گا ——— میں ابھی جا کر گھر سے اور لے آتا ہوں۔"

"ہاں ——— سات سو اور لے کر آئیے گا۔ لیکن یہ آپ کی کون ہیں؟"

اِندر نے گھبرا کر اُس کی آنکھوں میں سیدھے دیکھا ——— وہ بھی اُسی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"ڈاکٹر صاحب، یہ میری کوئی نہیں ہیں ——— بس ہمدردی کے طور پر ساتھ چلا آیا ہوں۔"

ڈاکٹر ایک معنی خیز تبسم دکھا کر بولی۔

"مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی ہو، بیوی ہو یا گرل فرینڈ۔ رشتہ تو بتانا ہی پڑے گا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب، اس سے فرق ہی کیا پڑ جائے گا۔ آپ کو تو اپنے کیس سے مطلب ہونا چاہیئے۔"

جی نہیں، بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ جب کوئی انکوائری ہو جاتی ہے۔ ہم تو اس قسم کے کیس لیتے ہی نہیں، آپ کو بتایا نا! آپ کو پریشان دیکھ کر ہی میں راضی ہو گئی۔ کیونکہ آپ مجھے ایک شریف انسان نظر آئے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اُسے فوراً باہر کا راستہ دکھا دیا ہوتا!"

اندر سمجھ گیا۔ یہاں ہر ایک کیس کی فیس الگ الگ ہو گی۔ بیٹی کی کچھ، بہن کی کچھ اور گرل فرینڈ کی بھی بالکل الگ۔ اور یہاں سارے رشتے بھی بتانے پڑتے ہیں۔ یہ رشتہ ہی فیس بڑھانے کا ضامن بن جاتا ہے ——— وہ کرسی سے اُٹھ کر اسکرین کے پیچھے گیا۔ اپرا ابھی تک ایگزامینیشن ٹیبل پر لیٹی ہوئی تھی۔ خالی خالی آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھی۔ اُسے اپنے قریب کھڑا دیکھ کر اُس نے سر گھمایا اور آنکھوں کے اُسی سونے پن سے اندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے لیڈی ڈاکٹر اور اُس کے درمیان ہونے والی گفتگو سُن لی تھی۔ اُسے پورا احساس تھا کہ اُس نے اپنے باس کو ایک بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ لیکن اُس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔ اس لئے وہ اُس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

اندر بھی اُس سے کیا کہتا۔ یہی سوچا، جب یہاں تک آ گیا ہوں تو تھوڑا اور آگے بڑھ جانے میں کیا ہرج ہے! ایک بار اُس کی پریشانی دُور ہو جائے پھر وہ راستے پر آ جائے گی۔

وہ وہاں سے ہٹنے لگا تو اپرا مدھوک نے کہا۔

"میرے پرس میں سے دو سو روپے لے لیجئے۔ آپ کافی بوجھ اُٹھا رہے ہیں۔"

لیکن اندر نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور ڈاکٹر کے پاس لوٹ آیا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں کاغذات تیار تھے ——— "آپ ان پر دستخط کرتے جایئے۔ جب آپ اپنے پیشنٹ کو واپس لے جائیں گے تو میں آپ کے سامنے انہیں پھاڑ دوں گی۔"

اندر نے دیکھا، کاغذات میں اپرا کے ساتھ اُس کا رشتہ بطور خاوند لکھا گیا تھا۔ لیکن اُس نے کسی قسم کے خدشے کو اپنے آپ ہی مسترد کرتے ہوئے سوچا ——— ان کاغذات کی قانونی اہمیت بس تھوڑی دیر کے لئے ہے۔ اُس نے چپ چاپ دستخط کر دیے اور گھر چلا گیا۔

جب وہ گھر سے روپے لے کر لوٹا تو ڈاکٹر اپنا کام کر چکی تھی۔ اور اُسے اپرا کے پاس جانے کے لئے کہا۔

اپرا آنکھیں بند کئے آپریشن ٹیبل پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور وہ بے حد کمزور اور سہمی ہوئی سی تھی۔ لیکن اُس کے اندر سے گناہ آلود خون بہہ جانے سے اُس کے چہرے پر ایک طمانیت بھی جھلک رہی تھی۔ اُس نے اندر کی چاپ سُن کر بھی آنکھیں نہیں

کھولیں۔

"ڈاکٹر کہہ رہی ہے، ہمیں یہاں سے دس بیس منٹ کے اندر چلے جانا چاہیئے۔"

ایرا نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ تم اب کہاں جاؤ گی؟"

ایرا پھر بھی خاموش رہی۔

"تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

"وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" ایرا مدھوک نے آنکھیں بند کئے کئے دھیمے سے جواب دیا۔

"کیوں؟ تمہارے ممی ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟"

"وہ ایک ہفتہ پہلے میری حالت دیکھ کر سر پیٹتے ہوئے کہیں چلے گئے تھے۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی ڈھلک پڑے۔

اندر ڈاکٹر کے پاس جا کر بولا ——— "میں ٹیکسی بلانے کے لئے آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں!"

"کر لیجے مگر ٹیکسی والے کو ہمارے کلنک کا پتہ مت بتائیے گا۔ اُسے یہاں سے ذرا فاصلے پر پریس پر آنے کے لئے کہیئے گا۔"

۱۴
چودہ

رات کے تین بجے کے قریب وہ ایرا کو اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کچھ دوائیں ساتھ کر دی تھیں۔ باقی کے لئے ایک پرچہ لکھ کر دیدیا تھا۔ اُس نے ایک دوا گرم دُودھ کے ساتھ پلینے کی ہدایت کی تھی۔

اِندر نے خود ہی اُسے دودھ گرم کر کے پلایا اور دوا بھی دیدی۔ اُس کے بعد وہ گہری نیند سو گئی۔ وہ رات بھر اُس کے پاس بیٹھا اُس کی سانسوں کے اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ سوچتا بھی رہا۔ پنکی جے پور نہ گئی ہوتی تو وہ اُسی کو یہاں لے آتا۔ ایرا کی تیمار داری کے لئے اُس کی یہاں موجودگی بے حد ضروری تھی۔ اُسے یقین تھا وہ انکار نہ کرتی۔ اُسے ہمدرد نرسنگ کی سخت ضرورت تھی۔ وہ یہ کام بخوبی انجام دے سکتی تھی۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم چار چھ گھنٹے تو اُس کے ساتھ ضرور رہ جاتی۔

ایرا مدھوک صبح آٹھ بجے تک خوب گہری نیند سوتی رہی —— اِندؔ شب بھر کی بیداری کے باوجود صبح جلد ہی نہا دھو کر دفتر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنے اور ایرا کے لئے خود ہی ناشتہ بنا لیا تھا۔ ایرا کو اُس نے بڑے پیار سے جگایا۔

ایرا کی آنکھیں کھلیں تو اُس نے اِندؔ کو اپنے اوپر جُھکا ہوا پایا۔ مُسکراتے ہوئے لیکن اس سے وہ قطعاً حیران نہیں ہوئی —— اُسے یہ دیکھ کر بھی تعجب نہیں ہوا کہ وہ اپنے باس کے گھر میں تھی۔ لیکن ابھی وہ اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ اِندؔ نے —— لیٹے لیٹے ہی اُس کا منہ دُھلا دیا۔ اپنے ہاتھوں —— تولئے سے پونچھ بھی دیا اور اُس کے بالوں میں ذرا ذرا کنگھی بھی پھیر دی —— پھر اُسے ناشتہ کرایا۔ دوا کھلائی اور اُس سے کہا،

"میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جاؤں گا —— تمہاری دوا لے آنی ہے۔ پہلے سوچا تھا

پنکی کو بھی بُلالوں گا۔ لیکن اب سوچتا ہوں کسی ایکسپرٹ نرس کو چند روز کیلئے لے آنا زیادہ مناسب ہو گا۔ وہ تمہاری زیادہ اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے گی۔

"سر! آپ کہیں نہیں جائیے۔ پلیز! کسی کو بُلانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے آپ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ چند ہی روز میں۔ پھر اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

اس سے زیادہ وہ نہ بول سکی۔ اُس کی جانب شکر گذار آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ —— پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اِتی نے مسکرا کر خود ہی اُس کے آنسو پونچھ ڈالے —— اور کہا ——

"گھبراؤ مت۔ تم یہاں پوری طرح محفوظ ہو۔"

ایک ہمدرد مرد کے گھر میں پہنچ کر عورت ہمیشہ محفوظ ہو جاتی ہے —— اگر مرد اُس کی حفاظت کا واقعی ذمہ لے رہا ہو تو! اور اُس کے ساتھ پوری ہمدردی بھی جتا رہا ہو۔

ایرا مدھوک کو یقین ہو گیا۔ اِتی نے جو کچھ کہا ہے وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے۔ یہی سوچ کر تو اُس نے گذشتہ رات کو اُس سے اپنی بپتا کہہ سُنائی تھی۔ اُس کی اِتی سے ملاقات نہیں ہوئی ہوتی تو اب تک وہ گومتی کی لہروں میں سما چکی ہوتی۔

اِتی نے اُس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا —— "میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ بس تھوڑی سی دیر کے لئے میرا آفس جانا ضروری ہے —— واپسی پر تمہاری دوا بھی لیتا آؤں گا۔"

"سر! میری چھٹی کی درخواست بھی لیتے جائیے۔"

اُس نے خود ہی ایرا مدھوک کی طرف سے درخواست لکھ کر اُس سے دستخط کرا لیے اور اُسے خود ہی وہیں منظور کر لیا۔ اور پھر باہر چلا گیا۔

اِندر کے آفس چلے جانے کے بعد ایرا کو پھر نیند نہیں آ سکی۔ وہ تکیوں کے سہارے پلنگ پر لیٹی لیٹی بے مقصد ہی اِدھر اُدھر تاکتی رہی۔ کمرے میں نظر آنے والی ہر ایک شے کی طرف۔ ایک تو وہی پلنگ تھا جس پر وہ دراز تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر ایک مرد کے کام آنے والی کئی چیزیں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ تیل، پاؤڈر، شیونگ برش، سیفٹی بلیڈ، اور کئی طرح کی کریمیں۔ انہی کے درمیان ایک فریم شدہ پورٹریٹ پنکی کا بھی رکھا ہوا تھا۔ پنکی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ بڑی ہی دلنشیں اور اُس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ ایسی چمک جس میں محبت ہی محبت تھی۔ بے لوث، بے ریا اور دیکھنے والے کو دل گرفتہ کر دینے والی۔

اُدھر کھڑکیوں پر قیمتی ٹیپسٹری کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹے سے ریک میں کچھ آفس کی کچھ دوسری کتابیں اور میگزین سجے ہوئے تھے۔ ایک بڑا سا وارڈروب تھا، دیوار کے اندر بنا ہوا۔ اس کے ادھ کھلے دروازے میں سے اِتی کی بُشرٹیں، قمیضیں، پتلونیں، کوٹ، ٹائیاں وغیرہ لٹکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ نیچے کے حصے میں اُس کے کئی بوٹ، چپلیں اور سینڈل رکھے ہوئے تھے۔

اُس نے سوچا، یہ گھر کس قدر مردانہ ہے! یہاں کی ہر ایک چیز ایک خوبصورت و وجیہ مرد سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں صرف ایک عورت کی کمی ہے جس کی آمد متوقع ہے۔

پنکی کا ایک لائف سائز پورٹریٹ اِنّی کے پلنگ کے سامنے دیوار کے پاس ایک ٹرالی پر رکھے ہوئے ٹی وی کے اوپر سجا ہوا ہے۔ دائیں طرف ایک میز پر ٹائپ رائیٹر رکھا ہے۔

پھر اچانک اُسے دیوار پر لٹکی ہوئی دو پینٹینگز بھی دکھائی دے گئیں۔ وہ انہیں کتنی دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی۔ دونوں تصاویر کے نچلے کناروں پر پنکی کے دستخط بنے ہوئے تھے۔ آرٹسٹ کے دستخط اُس نے اپنی چھٹی حس سے پہچان لئے —— علالت کے باوجود اپرامدھوک کی یہ حس اچانک تیز ہو گئی تھی۔ اُس کے بدن میں طاقت بھر گئی تھی۔

وہ بستر سے اُٹھ کر بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باتھ روم میں گئی۔ اُسے چکّر سا آنے لگا تو اُس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ گرتے گرتے سنبھل گئی۔ باتھ روم میں بھی رکھی ہوئی ساری چیز ایک مرد کی تھیں۔ دانت صاف کرنے کے بُرش اور کریمیں۔ اور تولیہ اسٹینڈ پر لٹکے ہوئے تولیے اور انڈر ویئر اور بنیانیں۔ وہاں بھی ایک پینٹنگ لٹکی ہوئی تھی۔ دو اور پینٹینگز کاریڈور میں بھی آویزاں تھیں جو باتھ روم اور بیڈ روم کے درمیان تھا —— اس گھر میں تنہا رہنے والا مرد ایک لڑکی سے کتنی شدید محبت کرتا ہے!

اسی گھر میں ایک ڈرائنگ روم بھی تھا۔ لیکن اُدھر جانے کی وہ ہمت نہیں کر سکی۔ اُسے تھکن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ واپس آ کر وہ پھر پلنگ پر لیٹ گئی۔ یہ پلنگ اِنّی کا تھا۔ اُسی نے اُسے یہاں لا کر لٹا دیا تھا۔ اس پلنگ میں سے اُسے اِنّی کی ہی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟ اِنّی اُسے یہاں کیوں لے آیا ہے؟ دامودر گپتا نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ پھر سو گئی۔

پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک سوتی رہی —— ! اِنّی کی آہٹ سُن کر وہ جاگی —— وہ اُس کے لئے دوائیں، پھل اور بسکٹ وغیرہ لے کر آیا تھا —— لیکن اُس کے ساتھ کوئی نرس نہیں آئی تھی۔ پنکی بھی نہیں —— اُن کی یہاں ضرورت ہی کیا تھی! وہ شام تک چلنے پھرنے کے قابل ضرور ہو جائے گی۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ اُسے یہاں سے اپنے گھر ہی جانا چاہیئے۔ اُس فلیٹ پر ہرگز نہیں جو اس کے لئے دامودر گپتا نے لے رکھا تھا۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی رہ سکتی ہے۔ جب تک ممی ڈیڈی لوٹ کر نہیں آجاتے —— اُسے صحت مند دیکھ کر وہ اُسے معاف کر دیں گے۔ اب تو وہ اُن کے سامنے یہ جھوٹ بھی بول سکتی ہے کہ اُسے درحقیقت کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بس ایک وہم سا ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی کنواری ہے!

اِنّی نے اُسے ایک ہفتہ تک واپس نہیں جانے دیا —— دن میں تو وہ دفتر چلا جاتا تھا۔ اُس کے بعد سارا وقت وہ اسی کے ساتھ گذارتا تھا —— اُسے طرح طرح کے ٹانک اور

اپھل وغیرہ کھلا کر اس کی صحت بحال کر دی۔ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اُسے اُداس نہ ہونے دیا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اور اُس کے لئے بھی کھانا بناتا تھا۔ اُس کے ساتھ تاش کھیلتا تھا۔ اُسے خوش رکھنے کے لئے مزیدار قسم کے لطیفے سناتا تھا —— اپرا کو یوں محسوس ہونے لگا وہ برسوں سے اُس کے ساتھ رہ رہی ہے —— اور اسی طرح رہتی رہے گی۔ لیکن ایک دن اچانک اِنّی دفتر سے لوٹا تو بولا۔

"پنکی سیمنار سے واپس آگئی ہے۔ وہ اپنے پروفیسر کے ساتھ جے پور گئی ہوئی تھی —— آج اُس کا فون آیا تھا —— آج شام کو وہ کسی بھی وقت یہاں آسکتی ہے۔" وہ کچھ پریشان بھی نظر آرہا تھا۔ یہ سُن کر اپرا دھوک وہاں سے فوراً چلی گئی —— یہاں پڑے رہنے کا اُسے کوئی حق نہیں تھا۔

۱۵
پندرہ

ایرامل ہوک کے چلے جانے کے کچھ ہی دیر بعد پنکی وہاں پہنچ گئی۔ تین بڑے بڑے تھیلے اُٹھائے ہوئے اور چہرے پر بے پناہ خوشی اور چمک لئے ہوئے۔ اِئی نے اُسے اُس کے ہاتھوں میں تھیلوں سمیت بڑی بے تابی سے اپنے ساتھ لپٹا لیا تو اُس نے چیخ کر کہا ——

"ہٹو ہٹو! پہلے مجھے سامان تو رکھ لینے دو —— اُفوہ! سب کچھ ٹوٹ جائے گا۔ بکھر جائے گا ابھی!"

اِئی نے پھر بھی اُسے نہیں چھوڑا تو اُس نے اُس کے کاندھے پر کاٹ لیا —— اُس کے دانتوں کی چبھن سے گھبرا کر اِئی پیچھے ہٹ گیا —— اپنے کندھے کو سہلاتے ہوئے اُس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا —— "کتنی خونخوار ہو تم؟ پھر کبھی کاٹا تو تمہارے دانت ہی اکھاڑ دوں گا۔ سمجھیں!"

"ہاں ہاں سمجھ گئی۔ تم تو جیسے بہت سیدھے ہو!" وہ اُس کی طرف بڑے پیار سے ترچھی نظر سے دیکھتی ہوئی بولی —— "ہاں! نہیں تو"!

"لیکن یہ سب کیا اُٹھائے پھرتی ہو؟"

"تمہارے تحفے ہیں —— خالی ہاتھ آتی تو تم مجھے گھر میں گھسنے دیتے؟"

پنکی نے ایک حسین ادا سے روٹھا سا منہ بنا کر کہا —— اِئی بولا

"تم یہ سب ذرا باہر رکھ پھر سے اندر آؤ تو بھلا! دیکھنا میں تمہیں کتنے پیار سے ملتا ہوں"
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ پنکی نے اُسے روک دیا۔

"بس بس! ذرا فاصلے پر ہی رہیے مہربانی کر کے —— یہ دیکھئے میں تمہارے لئے کیا کیا لے کر آئی ہوں۔"

اُس نے ایک تھیلے میں سے —— بڑی خوبصورتی سے پیک کیا ہوا ایک ڈبہ نکالا۔ اُسے

کھول کر ایک بڑے سائیز کا تانبے کا بنا ہوا نٹ راج نکالا۔ جسے دیکھتے ہی اِنّی نٹ راج کے اُس عظیم رقص کی نقل میں ناچنے کا پوز بنا کر کھڑا ہو گیا جو ساری کائنات کو فنا کر دینے کے لئے شوجی نے اختیار کیا تھا۔

"آج تو میں بھی تانڈو نرت کروں گا۔"

"ہاں لیکن ساری سرشٹی کو تباہ کر دینے کے لئے نہیں بلکہ ایک نیا سنسار تخلیق کرنے کے لئے"

"وہی تو!" اُس نے نٹ راج کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک چھوٹی سی میز پر سجا دیا۔

پنکی نے دوسرے تھیلے میں سے بہت سی کتابیں نکالیں۔

"یہ دیکھئے —— راجستھان کی صدیوں کی تاریخ اور راجستھان کے لوک ناچ اور گیت اور یہ میرا بائی کی مکمل شاعری اور ان کے حالات زندگی"

"تم تو پورا راجستھان اُٹھا لائی ہو میرے لئے!" اِنّی نے ایک ایک کتاب کو ہاتھ میں لے کر چوما۔

وہ ہنس پڑی۔ ایک چیز اور بھی ہے —— شاید وہ بھی تمہیں پسند آئے!" اُس نے تیسرے لفافے میں سے ایک اور ڈبہ نکالا —— اور اُس میں سے سفید دھات کا بنا ہوا ایک گھوڑا نکالا جو اگلے پاؤں اُٹھا کر پچھلے دونوں پاؤں پر بالکل الف ہو گیا تھا۔

اِنّی اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ بولا۔ "یہ تو مہارانا پرتاپ کا چیتک ہے!"

"کچھ بھی کہہ لو۔ لیکن ہے ہے تمہاری طرح بالکل بے قابو سا! جیسے ابھی کسی پر کود پڑے گا۔"

"تو میں اس طرح بے قابو ہو جاتا ہوں؟"

اِنّی نے سچ مچ چھلانگ لگا کر اُسے بستر پر جا گرایا۔

پنکی نے اُس کے بوجھ تلے سے نکلنے کے لئے پوری مدافعت کی۔ اُس کے سینے پر زور زور سے مکیاں ماریں —— اِدھر اُدھر پلٹنے کی کوشش کی پھر مجبور ہو کر بولی —— "ہٹو نہیں تو پھر کاٹ لوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔"!

اِنّی کو جیسے کاٹے جانے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ خاص طور پر عورت کے کاٹے جانے سے۔ جلدی سے الگ ہو گیا۔ پنکی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹنے لگی۔ اِنّی پیٹھ کے بل اُس کے پاس لیٹا ہوا اُس کے جسم کے دلآویز خطوط کو سحر زدہ سا ہو کر دیکھتا رہا —— اُسے پنکی کے تیز دانتوں کا خوف نہیں ہوتا تو وہ بازو بڑھا کر اُسے اپنے اوپر گرا لیتا —— اُس نے کہا۔

"پنکی، کئی روز کے بعد ملی ہو —— آج تو جی بھر کے پیار کر لینے دو!"

"نہیں!" اُس نے سختی سے انکار کر دیا۔ لیکن پھر فوراً ہی نرم ہو کر بولی —— "تم ہی ہمیشہ مجھ سے پیار کرتے ہو —— آج میں تمہیں پیار کروں گی —— اپنے گڈے کو!" وہ ہنس پڑی۔ "لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھے بالکل نہیں چھوؤ گے —— بالکل اسٹیچو بنے پڑے رہو گے۔"

اِتی نے جذبات سے مغلوب ہو کر رضامندی میں سر ہلا دیا۔ اور چاروں شانے چت سا ہو کر پڑا رہا ـــــ پنکی اُس پر جھک گئی۔ اُس نے اُس کے ماتھے پر، اُس کی آنکھوں پر اور ہونٹوں پر اور گھنے بالوں سے بھری ہوئی چھاتی پر بار بار بوسے دیئے۔ پھر خود ہی اُس کے بازو اُٹھا کر اپنی گردن میں حمائل کر دیئے ـــــ اور جذبات سے گلوگیر مگر شاکی لہجے میں بولی ـــــ

"تم تو بالکل بے جان ہو کر لیٹ گئے ہو۔ میں نے یہ تھوڑے ہی کہا تھا!"

اِتی کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں کس کر بولا ـــــ "شدت سے پیار کرنا مردوں کا کام ہوتا ہے۔ عورتوں کا نہیں ـــــ انہیں تو صرف بچے کھلانا آتا ہے۔"

پنکی نے اُس کی ناک کی نوک کو اپنی جلیبھ نکال کر چھوا اور بولی ـــــ میرے بغیر تمہارا وقت کیسے کٹا؟ میرا تو پل پل بہت بے چینی میں گذرا۔"

"بہت اچھا کٹا ـــــ بالکل پتہ ہی نہیں چلا ـــــ دراصل اپرا مدھوک کے ساتھ ایک واقعہ ہو گیا تھا ـــــ"

اُس کے بعد اُس نے پنکی کو سارا قصّہ سنا دیا۔ اپرا کے ابارشن کا، اپنے گھر سے آکر ہفتہ بھر یہاں تیمارداری کرتے رہنے کا ـــــ جیسے سنتے ہی پنکی بھڑک کر اُس سے الگ ہو گئی۔ فرش پر کھڑی ہو کر غصّے سے بولی

"میرے پیچھے تم اس چڑیل کے ساتھ راس رچتے رہے؟ اُسے اپنے گھر میں لے آئے ہفتہ بھر تک اُسے یہاں رکھا؟ میں پوچھتی ہوں کیوں؟ اس بات کا تمہیں کیا حق تھا؟"

وہ جلدی جلدی اپنے بال اور کپڑے درست کرتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

"پنکی، میں نے ایک انسانی جذبے کے تحت اُس کی تیمارداری کی۔ اُسے اُس وقت میری ہی ضرورت تھی۔ تم یہاں ہوتیں تو تمہیں بھی یہ سب کرنا پڑتا۔ تم جانتی ہو ہماری وجہ سے اُس کی زندگی میں انتشار آیا ہے۔"

"ہم نے اُس کی زندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے۔ چاہے مرے یا کچھ بھی ہو جائے اُس کو!" یہ کہتے کہتے وہ رو بھی پڑی۔

اِتی کو پنکی کے رویے سے سخت صدمہ پہنچا ـــــ وہ عورت ہو کر ایک عورت کے دُکھ کو کیوں نہیں سمجھتی ہے؟ شاید اُسے اُس کی محبت پر پورا اعتماد نہیں ہے۔ اسی لئے اُس کے اندر حسد کا جذبہ زیادہ ہے۔

وہ بستر سے اُٹھ کر اُس کے پاس گیا ـــــ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا ـــــ میرے دل میں اگر کوئی اور بات ہوتی تو میں تمہیں بتاتا ہی کیوں؟ میں بڑی آسانی سے اس واقعے کو تم سے چھپا سکتا تھا۔ کیا نہیں؟ میں نے اُس سے صرف ہمدردی کا اظہار کیا۔ جتنا بھی کر سکتا تھا۔

لیکن میرے دل میں صرف تم ہی بسی ہوئی ہو۔ میری سانسوں میں میرے دل و دماغ پر! میں تمہارے بغیر کیونکر زندہ رہ سکتا ہوں، یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو!"

یہ کہہ کر اُس نے پنکی کو گلے سے لگا لیا۔ لیکن وہ اُس سے فوراً ہی الگ ہوتی ہوئی بولی

"میں اب جاؤں گی —— بہت دیر ہو چکی ہے۔"

اِنی بے بسی کی مورتی بنا اُس کو گھورتا رہا —— وہ اُسے روک نہیں سکتا تھا —— روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اُسے تھوڑا سا اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ پنکی نے اُس کی بات دھیان سے سُنی تھی۔ مزید بحث نہیں کی تھی۔ اُس نے اسکوٹر کی چابی اٹھا کر کہا

"چلو تمہیں چھوڑ آتا ہوں —— لیکن اقرار کرو کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔"!

"اب چلو بھی!" وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔

"تم میرے لئے اتنے اچھے تحفے جو لے کر آئی ہو انہیں اپنے ہاتھوں کب آ کر سجاؤ گی؟"

پنکی اُسے جواب دیے بغیر ہی باہر نکل گئی۔

سولہ ۱۶

اِنّی بہت خوش تھا کہ دامودر گپتا نے اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ایک نیک کام انجام دے دیا تھا۔ اُس نے اپنے خاص خاص دوستوں کی موجودگی میں ریتو کا بیاہ بیکنٹھ شولا پورکر کے ساتھ کرا دیا۔ اُس تقریب میں اِنّی بھی مدعو تھا۔ دامودر نے ریتو کے لئے تھوڑا سا جہیز بھی ساتھ کر دیا تھا۔ اُس کے کپڑوں اور زیورات پر دس ہزار کے قریب خرچ کئے تھے۔

جس وقت ریتو اور شولا پورکر پھولوں سے سجی ہوئی کار میں ہنی مون منانے کے لئے جے پور کے لئے روانہ ہوئے دامودر کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ریتو بھی روتی ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے وہ سچ مچ اپنے ماں باپ کے گھر سے وداع کرائی گئی ہو۔ اُس کی گود میں ایک سال کا وہ بچہ بھی تھا جسے وہ دامودر گپتا کی اولاد بتاتی رہی تھی۔ اُسے اب شولا پورکر نے بخوشی اپنا لیا تھا۔ اُس کے اس اقدام سے ہر شخص متاثر نظر آ رہا تھا۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

اِنّی نے سوچا، اِس موقعہ پر سکی بھی اُس کے ساتھ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ ان لوگوں کے رویوں کو دیکھتی اور تجزیہ کرتی۔ جو لوگ بعض معاملات میں بے حد کور ذوق یا تجارتی ذہنیت کے واقع ہوئے تھے، رشوت خور اور بے ایمان تھے اور نمائش پسند بھی۔ وہی ان لمحوں میں عام سطح سے کتنے بلند ہو گئے تھے — یہاں کیچڑ میں کنول کھلنے کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، یہاں اندھیرے کی کوکھ سے روشنی کی کسی کرن کے پھوٹنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ یہاں بس رویوں کی ایک تکرار ہے اور ان کا تضاد بھی۔ لوگ اتنے بُرے ہو کر بھی اچھا کام کر سکتے ہیں اور اچھے ہو کر بُرے بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اپنے نام و نمود کے لئے وہ ایسی ساری حرکتیں کر سکتے ہیں جو انہیں پست سطح سے وابستہ کر دیتی ہیں۔ لمحوں کی اہمیت یہاں دیکھی جا سکتی

ہے ۔ان کے تضاد کو سمجھنے اور پہچاننے کے لئے یہاں بہت کچھ مل جاتا ہے۔
ریتو اور شولاپورکر کے چلے جانے کے بعد وہاں جتنے لوگ باقی رہ گئے تھے وہ بے حد اُداس نظر آرہے تھے۔ اپنی اپنی اُداسی کو دُور کرنے کے لئے وہ پھر کلب کے اندر چلے گئے۔ جہاں تاش اور بلیرڈ کی میزیں اور بار کے کاؤنٹر اُن کے منتظر تھے۔۔۔۔ اِنّی بھی اندر چلا گیا۔
وہاں اُس نے ایرا مدھوک کو پہلے سے موجود پایا۔ وہ کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھی ہنس رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سُلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ ابارشن کے بعد اُس نے جو چھٹی لی تھی، اُسے اُس نے اور بڑھوا لیا تھا۔ اِنّی کو دیکھتے ہی وہ اُس سے ملنے کے لئے اُٹھ ہی رہی تھی کہ اس سے پہلے دامودر گپتا اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔
اِنّی نے اُس کی طرف خشمناک نظروں سے دیکھا مگر دامودر گپتا اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا۔ انتہائی ندامت کی کیفیت چہرے پر لئے کہتا رہا۔۔۔۔
"آپ مجھے سو جوتے مار لیجئے ملہوترا صاحب! میں اُف تک نہیں کروں گا۔ میں اسی سزا کا حقدار ہوں لیکن آپ نے وہ کام کر دکھایا ہے جو کوئی دیوتا ہی کر سکتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ بس اب مجھے معاف کر دیجئے۔۔۔۔"
دامودر گپتا کی طرف کتنے لوگ دیکھ رہے تھے۔ اُس کی خوشامد بھری باتیں سُن رہے تھے۔ وہ اُن سب کی نظروں میں ایک گرا ہوا انسان تھا لیکن وہ اُس کے اس کارنامے کے بھی معترف تھے جو اُس نے اپنی برسوں کی رکھیل کی شولاپورکر کے ساتھ شادی کرا کے سرانجام دیا تھا۔ اُس سے تو اِنّی بھی متاثر ہوا تھا۔ اُس نے اس وقت دامودر سے کچھ بھی نہ کہا اور بلیرڈ کی میز کی طرف بڑھ گیا۔
ایرا مدھوک بھی اُس کے ساتھ بے رخی سے پیش نہیں آئی تھی۔ بلکہ اُسے اِنّی سے معافی مانگتے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
آج کلب میں دامودر گپتا کی طرف سے سب لوگوں کو شراب اور کولڈ ڈرنکس مفت پلائے جا رہے تھے۔ اُس نے کلب کے منیجر سے کہہ دیا تھا۔۔۔۔ "آج کوئی جتنی بھی پینا چاہے اُس کا سارا خرچ میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں بہت اُداس بھی ہوں۔ آج میری زندگی کا یہ بہت بڑا دن ہے۔"
اِنّی کے دل میں اُس کے لئے اچانک ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ اُس سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اور اُس نے طے کر لیا تھا کہ اب اُس کے ساتھ کبھی ہمکلام نہیں ہو گا۔
اِنّی نے بلیرڈ کی اسٹک پر چاک ملتے ہوئے آنکھوں کے گوشے سے دیکھ لیا تھا کہ دامودر پھر ایرا کے پاس جا بیٹھا تھا اور ایرا مدھوک نے اُس کے بلا اجازت آ بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

۱۷ سترہ

ایک رات اچانک اِنّی کے فلیٹ کی کال بیل بجی۔ وہ اس وقت گہری نیند سویا ہوا تھا —— گرم گرم بستر میں سے نکل کر آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر پہنچا تو وہاں ایرا کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا —— وہ شراب پیئے ہوئے تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑوں کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

وہ اِنّی کے پاؤں پر گر کر رونے لگی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے —— پہلے بھی میری خاطر آپ نے بہت پریشانی اُٹھائی ہے۔ آپ کے سہارے کی مجھے پھر ضرورت آپڑی ہے!"

اِنّی نے اُسے اندر آنے سے نہیں روکا۔ رات کے سنّاٹے میں اُس کے زور زور سے رونے کی آواز اغل بغل کے فلیٹوں میں بھی جا سکتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں جاتے ہی ایرا مدھوک ایک صوفے پر گر پڑی۔ اُس کی ساڑی کا پلّو قالین پر گھسٹتا ہوا سا آیا تھا۔ اُس کے بلاؤز کی اُوپر کی دو ہُکیں کھلی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے اُس کی بھری بھری چھاتیوں کے گداز اُبھار نمایاں ہو گئے تھے۔ اِنّی نے اُس کی ساڑی کا پلّو اُٹھا کر اُس کے بدن پر ڈال دیا —— اور سگریٹ سُلگا کر سوچنے لگا۔ اس لڑکی کی اس وقت کونسی مدد کرے! اُس کا نشہ اُتر جائے تو وہ اُسے اُس کے گھر چھوڑ آئے۔

ایرا نے بڑی بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کر اِنّی کے ہاتھ سے سُلگتی ہوئی سگریٹ لے لی اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبا کر بولی —— "یہاں مجھے دامودر چھوڑ گیا ہے —— اُسی نے مجبور کیا کہ میں آپ ہی کے پاس جاؤں۔ آپ کی نیکی پر اُسے بہت بھروسا ہے۔ مجھے بھی —— ہم سب کو آپ کی نیکی پر پورا بھروسا ہے۔"

اِپّی نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ لمحوں تک تو وہ بول ہی نہیں سکا۔ اُس نے اپرا کو ایسی حالت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کم سے کم شراب پیئے ہوئے تو نہیں۔ اب وہ باقاعدگی سے آفس جانے لگی تھی۔ اپنا کام ٹھیک ٹھاک ہی کر دیتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا وہ اُس واقعے کے بعد بالکل نارمل ہو جائے گی۔ سمجھدار بھی ــــ انسان دھوکا کھا کر ہی راستے پر آتا ہے۔ دامودر گپتا کے ساتھ تو اُسے تعلقات رکھنے ہی نہیں چاہیئے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ اپنا توازن پھر کھو بیٹھی ہے۔ اگرچہ اُس نے اپرا کو دامودر سے دُور دُور رہنے کے لئے کبھی تلقین نہیں کی تھی۔ دو مہینے پہلے جب وہ اُس کے یہاں ایک ہفتہ تک رہتی رہی تھی۔ تب بھی اُس نے اُسے کوئی تنبیہہ نہیں کی تھی۔ اب بھی وہ اس سے کچھ نہیں کہنا چاہتا ہے۔ اپنے بارے میں اُسے خود فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے۔

وہ سگریٹ سلگا کر اُس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اپرا اپنے آپ ہی اُسے بتانے لگی۔

"سر، جب دامودر کو معلوم ہو گیا، میں گھر میں اکیلی رہتی ہوں تو اُس نے رات برات آنا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے منع بھی کیا لیکن وہ کتنا ضدی ہے اور کتنا بڑا چاپلوس! آپ تو جانتے ہی ہیں سر! میں اُس کے سامنے پھر ہار گئی۔ آج صبح صبح میری ممی ڈیڈی اچانک واپس آ گئے۔ اگرچہ وہ واپس جا چکا تھا۔ لیکن گھر کی حالت تو بڑی خراب تھی۔ ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ میرے اپنے اندر جو گناہ کا احساس تھا اُسی کی وجہ سے اپنے ماں باپ کے ساتھ میرے لئے آنکھ ملانا مشکل ہو گیا۔ وہ بھی سب سمجھ گئے۔ اگرچہ اُنہوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ کوئی بات ہی نہیں کی میرے ساتھ ــــ لیکن اُن کی یہ خاموشی میرے لئے جیسے ایک پھانسی بن گئی۔ بالکل ناقابل برداشت ــــ آپ سمجھ سکتے ہیں نا سر! جب ماں باپ گہری خاموشی اختیار کر لیں۔ اپنی اولاد سے کوئی جواب ہی طلب نہ کریں تو وہاں رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، وہ پھر کہیں چل دیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی جان ہی دے دیں! "جبکہ مرنا تو مجھے ہی چاہیئے۔"

وہ اچانک دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"میں چاہتی ہوں، وہ سب کچھ بھول جائیں، جتنا کچھ ہو چکا ہے تو میرے لئے بھی جینا آسان ہو جائے۔ مجھے اُن کے پیار کی ضرورت ہے۔ ان کی کھوئی ہوئی محبت کی اُن کی گود میں بیتا ہوا میرا بچپن کتنا سہاونا تھا! وہ مجھے کتنے پیار سے اپّی کہہ کر بلایا کرتے تھے ــــ! اب تو وہ مجھے دیکھنا تک نہیں چاہتے ــــ جان بوجھ کر سر گھما لیتے ہیں ــــ جیسے قصوروار میں نہیں، وہ ہی ہوں! کتنا عجیب لگتا ہے یہ! اسی لئے میں آج آفس سے نکل کر گھر نہیں گئی۔ کلب جا کر آپ سے ملنا چاہتی تھی ــــ لیکن آج آپ وہاں نہیں گئے ــــ وہاں

مجھے دامودر مل گیا ـــــ میں اُسی کے سامنے اپنا دکھڑا کہہ بیٹھی۔ وہ میرا من بہلانے کے لئے گومتی کے ساحل پر لے گیا۔ وہاں جاکر میرا جی واقعی کچھ دیر کے لئے ہلکا ہو گیا۔ گومتی ندی کو بہتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا، اس میں کود جاؤں ـــــ اس کی لہروں میں سما جاؤں ـــــ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آ گئی۔ آج بھی میں اسی کیفیت میں تھی لیکن دامودر اُسے کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرے گا کہ میں کیا سوچتی رہتی ہوں۔ جب میں نے اُس سے کہا، تم مجھے یہیں چھوڑ کر اب چلے جاؤ تو وہ مجھے اپنی گاڑی میں زبردستی لاد کر یہاں لے آیا ـــــ آپ کے فلیٹ کے سامنے اتار کر چل دیا۔“

یہ کہہ کر اِبرا صوفے سے اُٹھی اور اِنی کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر رونے لگی۔

”پتہ نہیں کیوں، میں پلٹ پلٹ کر یہیں آ جاتی ہوں۔ ! یہاں سے جانے کے بعد عہد کرتی ہوں پھر کبھی نہیں آؤں گی ـــــ آپ کو اور تکلیف نہیں دوں گی ـــــ لیکن کچھ عرصہ بعد پھر بھول جاتی ہوں۔ میں اپنے آپ نہیں آنا چاہتی تو کوئی دوسرا مجھے لا کر یہاں چھوڑ جاتا ہے !“

اِنی نے اُسے ڈرائنگ روم میں بچھے ہوئے قالین پر سونے کی اجازت دیدی۔ اُسے ایک کمبل بھی لا کر دیدیا اور اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔

اِبرا رات بھر سسکتی رہی۔ اُس کی سسکیاں وہ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے سُنتا رہا۔ لیکن اُس نے اُسے مزید دلاسا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اُسے رونے دیا جائے۔ آنسو بہہ جانے سے انسان کے اندر کا میل بھی دُھل جاتا ہے۔

وہ خود بھی رات بھر نہیں سو سکا۔ بستر پر نیم دراز ہو کر سگریٹ پھونکتا رہا۔ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ایک بات اُس کے لئے سوہانِ روح بن گئی تھی۔ یہ لڑکی اُس کے لئے ذمّہ داری کیوں بن رہی ہے؟ وہ اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے اور کتنی دُور تک جا سکتا ہے؟ اُس کے دل میں اِبرا کے لئے نرم گوشہ کیوں بنا ہوا ہے جبکہ وہ اُسے پسند بھی نہیں کرتا ہے!

اٹھارہ (۱۸)

اگلے روز ایرا ناشتہ کر کے اِنّی کے جانے سے پہلے ہی دفتر چلی گئی۔ وہ اِنّی کے لئے بھی ناشتہ بنا کر ٹیبل پر رکھ گئی تھی۔

اِنّی جب آفس پہنچا تو وہ اپنے کیبن میں بیٹھی ٹائپ کر رہی تھی۔ اُس نے اِنّی کو آتا دیکھ کر سر نہیں اُٹھایا۔ اِنّی نے ایک خدشہ اچانک محسوس کیا، کہ کسی روز یہ راز فاش ہو ہی جائے گا۔ سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ایرا اُس کے گھر میں بے کھٹکے چلی آتی ہے۔ وہ اُسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کرتا ہے۔ پنکی کو جب اُس نے ایرا کے اپنے یہاں ایک ہفتے تک ٹھہرانے کی بات بتائی تھی وہ کس قدر بھڑک اُٹھی تھی۔ اُس نے اُسے بڑی مشکل سے سنایا تھا اور یہ احساس کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اُس نے ایرا مدھوک کے ساتھ ساری ہمدردی ایک انسانی نقطۂ نظر سے کی تھی۔ وہ پنکی کی محبت کو ایرا مدھوک پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ پنکی ہی اُس کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اگر یہ بات پنکی بھی سمجھ جائے تو اُسے سارا سکون واپس مل سکتا ہے۔ اُس کے دل میں بھی ایرا مدھوک کے لئے تھوڑی سی ہمدردی ضرور پیدا ہو جانی چاہیئے۔ کیا وہ واقعی یہ احساس کر سکتی ہے؟

وہ ایک ضروری فائیل کے سلسلے میں ایرا کو ڈکٹیشن دے رہا تھا کہ چپڑاسی نے تازہ ڈاک لا کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس میں ایک خط سُریندر کپور کا بھی تھا۔ پنکی کے بڑے بھائی کا۔ اُس نے لکھا تھا ——

"میں دو ہفتوں کے لئے نینی تال آیا ہوا ہوں۔ اپنی منگیتر کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ہم دن بھر خوب گھومتے ہیں۔ تم لوگ بھی آ جاؤ تو مزہ آ جائے۔ تم اور پنکی —— میں پنکی کو الگ سے بھی خط لکھ رہا ہوں —— مجھے پورا یقین ہے ممی ڈیڈی اُسے تمہارے ساتھ آنے کی اجازت دے دیں گے۔

تم دونوں ہمارے ہی ساتھ رہو گے ــــ بہت بڑا گھر ہے ــــ یار، یہ خط دیکھتے ہی چل دو ــــ تمہاری وجہ سے ہماری چھٹیاں اور بھی خوشگوار ہو جائیں گی ــــ دیشی اور میں اتوار کی صبح کو تم دونوں کو ریسیو کرنے کے لئے موٹر لے کر کاٹھ گودام پہنچ جائیں گے۔ اسٹیشن پر۔ دیکھو بیٹا، مایوس مت کرنا۔ ورنہ تمہاری شادی میں کوئی ایسا رخنہ ڈال دوں گا کہ پھر میرے ہاتھ پیر جوڑتے نظر آؤ گے۔

اچھا سنو! میں جانتا ہوں تم میری بہن سے بے پناہ محبت کرتے ہو۔ اس محبت کو آزادی کی فضا میں پروان چڑھانے کا تمہیں ایک سنہرا موقعہ دے رہا ہوں۔

سمجھے! بس آہی جاؤ۔"

خط پڑھ کر اِتی نے اپنے اندر ایک نئی ترنگ محسوس کی۔ وہ یک بیک خوش ہو اُٹھا۔ اُس کی اس کیفیت کو ایرا نے بھی دیکھا جو اُس کے سامنے بیٹھی ڈکٹیشن کے پورا ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایرا کی طرف دیکھ کر اِتی کے دل میں یہ خیال اُبھرا۔ آج سریندر کپور کے ساتھ نینی تال والے ٹھیکیدار کی بیٹی دیشی کے بجائے ایرا بھی تو ہو سکتی تھی! اُس کی ذرا سی مداخلت سے یہ لڑکی کتنی دور جا پڑی ہے! اب تو وہ سریندر کے قریب کبھی نہیں پہنچ سکتی۔

اُس کا جی چاہا پنکی کے علاوہ وہ ایرا مدھوک کو بھی ساتھ لے جائے۔ لیکن یہ بالکل ناممکن تھا۔ اگرچہ کوئی بھی بات بالکل ناممکن کبھی نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ واقعی نہ ہو سکنے والی بات تھی۔ پنکی اس بات کی اجازت کبھی نہیں دے سکتی تھی۔ اُس نے اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کی۔

اُسے اچانک اس قدر کھویا کھویا دیکھ کر ایرا مدھوک نے پوچھا۔

"سر! خیریت تو ہے نا!"

اِتی اُسے کچھ نہ بتا سکا۔ بس اتنا کہہ دیا ــــ "ہاں سب ٹھیک ہے۔ مجھے ایک ہفتے کے لئے چھٹی پر جانا ہوگا۔ سریندر نے بلایا ہے۔"

سریندر کا نام سُن کر ایرا نے سر جھکا لیا۔

اِتی نے جلدی جلدی ڈکٹیشن ختم کر دی۔ اپنی چھٹی کی درخواست بھی اُسے لکھوا دی ــــ جب تک وہ اس درخواست کو ٹائپ کر کے لے آئی، اِتی انٹرکوم پر اپنے باس سے منظوری لے چکا تھا۔

وہ اُسی وقت پنکی سے جا کر مل لینا چاہتا تھا۔ انہیں اُسی روز روانہ ہونا تھا۔ رات کی گاڑی سے ــــ کل صبح سریندر اور دیشی کاٹھ گودام ایکسپریس پر اُن کے منتظر ہوں گے۔ اُسے گاڑی میں

ریزرویشن بھی کرانا ہوگا۔

ابھی وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ اُسے کیبن کے شیشوں میں۔ بنکی آتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ کندھوں اور پیٹھ پر بال بکھرائے، لال رنگ کا ٹاپ اور جینز پہنے ہوئے اور کاندھے سے ایک بیگ لٹکائے ہوئے ـــــ اُس نے اِدھر اُدھر کے کیبن کی طرف نگاہ بھی نہ اُٹھائی۔ جیسے اُسے جان بوجھ کر نظرانداز کر دینا چاہتی ہو۔ لیکن اِنّی کے کیبن میں وہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔

"آج تو بھگوان سے کچھ اور مانگ لیا ہوتا تو وہ بھی مل جاتا۔ میں تمہارے ہی پاس آ رہا تھا!"

"بھگوان سے اور بھی کچھ مانگنے کے لئے رہ گیا ہے ابھی!" وہ بڑی شوخی سے اُس کی میز کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے بیگ میں سے ایک خط نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

اِنّی نے بھی ایک خط اُس کی طرف بڑھا دیا تو دونوں کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔

"تو پھر کیا خیال ہے؟" بنکی نے پوچھا۔

"جو تمہارا خیال ہے وہی میرا بھی!" اِنّی کا جواب تھا۔ مسرور اور قطعی ـــــ

"پہلے چل کر ریزرویشن کروا لیں۔"

"میرے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا۔"

"مجھے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔"

"میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"وہ مسکرا دی۔

"گھر سے اجازت مل گئی؟"

"نہیں کیسے ملتی! میں بھوک ہڑتال نہ کر دیتی!"

"کچھ معاملوں میں تم بڑی ضدی ہو!"

"خاص کر تمہارے معاملے میں ـــــ

"وہ دونوں جلدی سے

باہر نکل

گئے۔

۱۹ اُنیس

نینی تال کا سفر اِنّی اور پنکی کیلئے بے حد خوشگوار ثابت ہوا۔ میدانوں کی گرمی سے نجات پانے کے لئے جتنے لوگ پہاڑوں کا رُخ کرتے ہیں ان کے چہروں پر اپنے آپ خوشگواری آجاتی ہے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو برسات ہو چکی تھی۔ ہر چیز دُھلی ہوئی، نکھری ہوئی اور پاک و صاف تھی۔ پہاڑ، پیڑ، پودے، مکان اور سڑکیں۔ جھیل کے چاروں طرف لوگ جوق در جوق دلکش لباسوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ ہنی مون منانے کے لئے آنے والے جوڑوں کی تعداد زیادہ تھی۔

پنکی اور اِنّی اور دلیشی اور سریندر کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن دونوں جوڑے اس طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے پھرتے تھے جیسے وہ بھی ہنی مون منانے کے لئے آئے ہوں۔ انہوں نے نینی تال اور اس کے قرب و جوار کے سارے قابل دید مقامات کبھی پیدل کبھی گھوڑوں پر سوار ہو کر دیکھے —— ساتوں جھیلیں جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں اور اونچے اونچے پہاڑوں کے طویل سلسلے۔ چائنا پیک جس پر جا کر پورا ہمالیائی سلسلہ دیکھا جا سکتا تھا۔ دور دراز کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں دیکھ کر پنکی تو حیران رہ گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا، اُسے ابھی وہاں بھی پہنچنا ہے۔ کسی بھی روز! آج نہیں تو کل —— اُس نے اِنّی کے کندھے پر سر رکھ کر کہا

"مجھے ایسا لگتا ہے وہ چوٹیاں میرا انتظار کر رہی ہیں؟"

اِنّی نے اُس کی طرف تعجب سے دیکھا —— بولا —— صرف تمہارا کیوں؟ میں بھی تو ساتھ چلوں گا تمہارے!"

"میں تمہارے بغیر بھی وہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے۔ آؤ گے نا؟"

اِنّی کو اور زیادہ سسپنس میں نہ رکھنے کے لئے وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔

تمہارے بغیر کہیں جانے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی ۔"

پنکی نے اپنے بھائی کی منگیتر دیشی کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ پہاڑی نقوش والی لمبی اور دُبلی سی لڑکی تھی وہ ۔ بہت ہی آزاد خیال اور مہمان نواز بھی۔ سریندر بھی اُسی ذہنی سانچے میں ڈھلا ہوا نوجوان تھا ۔ اُس نے پنکی اور اِتی کے درمیان کبھی دیوار بننے کی کوشش نہیں کی ۔ اُس نے اپنی بہن اور اپنے دوست کو ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب ہونے کے مواقع دیے۔ جس طرح کے موقعوں کا وہ خود متلاشی تھا ۔ وہ دوسروں کے سامنے دیشی کو دبوچ لینے اور اُسے پیار کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتا تھا ۔ اُس نے اِتی کی بھی اس سلسلے میں ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ۔ یہ دیکھ کر پنکی کو بڑی حیرت ہوتی ۔ اُس نے اِتی کے کان میں کہا

"صدیوں پہلے کرشن نے اُس کی بہن سبھدرا کو اغوا کر لینے کے لئے ارجن کی مدد کی تھی ۔ ایک لمبی مدت کے بعد میں نے یہ بھائی دیکھا ہے جو تمہیں کیسے کیسے نہیں اُکساتا رہتا ہے !"

ایک جنگل میں وہ چاروں ٹیپ کی دُھن پر ناچ رہے تھے ۔ اِتی نے ناچتے ناچتے اچانک اُسے پکڑ کر سر سے اوپر اُٹھا لینا چاہا تو وہ اس کے ہاتھوں پر سے کود گئی اور بھاگ نکلی ۔ اِتی اُسے پکڑنے کے لئے پیچھے پیچھے بھاگا تو پنکی کو ہنسی کے فواروں کے بیچ اپنے بھائی کی آواز سنائی دی۔

"اِتی اُسے پکڑ لو ۔ تمہاری ہرنی کہیں جانے نہ پائے ۔"

وہ گھنے جنگل میں اچھلتی ہوئی بھاگتی چلی جا رہی تھی ۔ اِتی ایک ماہر شکاری کی طرح اُس کے تعاقب میں بھاگا چلا آ رہا تھا ۔ میلوں تک گھنے پیڑوں کے درمیان پہاڑی راستوں پر اس طرح بھاگنا اُسے اچھا لگ رہا تھا ۔ اُس نے خود کو سچ مچ ایک ہرنی تصوّر کر لیا ۔ اور یہ طے کر لیا وہ اپنے شکاری کے ہاتھ نہیں آئے گی چاہے کچھ بھی ہو ۔ وہ اُسے تھکا تھکا کر گرا دے گی ۔ لیکن اِتی اُس سے بھی چالاک نکلا ۔ ایک اور راستے سے ہو کر اُسے جا دبوچا ۔ دونوں گھاس پر گر پڑے ۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر ۔ وہ اِتی کی مضبوط بانہوں کی گرفت میں پسپا ہو چکی تھی ۔ بالکل بے بس ۔ وہ ایک بھوکے جانور کی طرح اُس کی بوٹی بوٹی نوچ لینے کے درپے تھا ۔ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر پنکی نے مزاحمت ترک کر دی ۔ لیکن اُسے بڑے پیار سے، پچکار پچکار کر سمجھانے لگی۔

"ابھی صبر سے کام لو میرے گڈے ! میں تمہاری ہی تو ہوں ۔ کہیں بھاگی تھوڑے ہی جا رہی ہوں۔"

نینی تال سے لوٹتے وقت اِنّی اور پنکی دونوں بہت خوش تھے۔ پوری طرح مطمئن بھی وہ ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضرورت کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اُن کی آئندہ زندگی بے حد خوشگوار گذرے گی۔

اِنّی خود کو بہت بدلا بدلا محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے کچھ ہفتوں میں وہ لکھنؤ میں سخت بوریت کا شکار ہوتا رہا تھا۔ کیونکہ پنکی اُس سے ہر روز نہیں مل پاتی تھی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ کلب میں مل کر اُس کا وقت خوشی خوشی کٹ تو جاتا تھا لیکن اُسے ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ یہ خریدی ہوئی خوشی ہے اور وقتی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ اُس کا ذہنی رشتہ استوار نہیں ہوتا ہے۔ اُس کے چہرے پر جو مسکراہٹ چھلک اُٹھتی ہے اُس کے نیچے تھرتھراہٹ نہیں ہوتی ہے۔ وہ بڑی شدّت سے چاہنے لگا تھا، پنکی اب اُس سے دُور نہ رہا کرے۔ اُسے پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ مکمل نہ کرنا ہوتا تو وہ اُس کے ساتھ شادی کر چکا ہوتا۔

پنکی نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اب اُسے ہر روز ملا کرے گی۔ چاہے اُس کے آفس میں تھوڑی سی دیر کے لئے ہی سہی!

نینی تال سے وہ سریندر کپور کے سسر مکندی لال شاہ کی گاڑی سے لکھنؤ واپس آ رہے تھے۔ مکندی لال شاہ کو ایک ضروری کام سے لکھنؤ میں وزیر جنگلات سے ملاقات کرنی تھی۔ اگلے روز اُسے سریندر کے والد سے اگر سریندر اور اپنی بیٹی دیشی کی شادی کے سلسلے میں انتظامات طے کرنے تھے۔

سریندر راستے میں پنت نگر اُتر گیا۔ جہاں وہ ایگریکلچرل یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ اِنّی

اور پنکی کو اُس نے لکھنؤ پہنچا دیا۔ اِتی کے فلیٹ کے سامنے ـــــ اُس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ یہ پنکی کی تجویز تھی کہ وہ کچھ دیر اُس کے فلیٹ میں رہ کر کھانا بنائے گی۔ دونوں مل کر کھانا کھائیں گے۔ اُس کے بعد اِتی اُسے اُس کے گھر پہنچا دے گا۔

وہ اپنے فلیٹ پر پہنچنے کے لئے سیڑھیاں چڑھے تو انہیں وہاں بہت سے لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جس روز اِتی نینی تال کے لئے روانہ ہوا تھا ایرا مدھوک وہیں تھی۔ اُس نے کہا تھا دامودر گپتا اُس کے لئے ایک الگ مکان کا بندوبست کر رہا ہے۔ مکان ملتے ہی وہ اُسی میں منتقل ہو جائے گی۔ لیکن وہ ابھی تک اُسی کے فلیٹ میں مقیم تھی۔ اُس کے ساتھ دامودر گپتا کے علاوہ کئی اور لوگ بھی تھے۔ مرد اور عورتیں۔ وہی سب، جو ہر روز کلب میں نظر آتے تھے۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کوئی بلیو فلم دیکھ رہے تھے۔ اور وہ شراب بھی پیئے ہوئے تھے۔ اس پروگرام کا اہتمام دامودر گپتا ہی نے کیا تھا۔

انہوں نے اِتی کے لئے دروازہ کھولا تو وہ سب کے سب اُسے نیم عریاں نظر آئے۔ عورتیں تو بھاگ کر دوسرے کمرے میں جا چھپیں۔ لیکن مرد بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے اُس کے سامنے ہی اپنے کپڑے درست کرنے لگے۔

پنکی یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ ان لوگوں کے بیچ میں ایرا مدھوک کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ الٹے قدموں گھر لوٹ گئی۔ اِتی کے لئے اُسے روکنا ناممکن تھا۔ وہ خود بے حد پریشان تھا۔ ایرا نے اُسے ایک اور سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ اُسے ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن اس کے لئے وہی دامودر گپتا ہی ذمّہ دار تھا۔ وہی اُسے غلط راستے پر ڈالتا جا رہا تھا۔ وہی ایرا کی کمزوری بھی بن گیا تھا۔

اُس روز اِتی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور دامودر کو گریبان سے پکڑلیا۔

”اُلو کے پٹھے! تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے!“

اِتی نے اُسے کے منہ پر ایک زوردار تھپّڑ بھی جڑ دیا۔ اُس کے دل میں دامودر کے خلاف ایک عرصہ سے دبی ہوئی نفرت یک بیک اُبھر آئی۔ دوسرے لوگ تو اُسے اس قدر غضب ناک ہوتا دیکھ کر جلدی جلدی کھسک گئے۔ دامودر بھی وہاں سے جانے لگا تو اِتی نے ایرا مدھوک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اسے یہاں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟ لے جاؤ اسے بھی اپنے ساتھ!“

یہ سن کر گپتا بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولا ـــــ ملہوترا صاحب، یہ آپ ہی کے پاس رہے گی۔ پہلے بھی تو آکر رہ جاتی ہے!“

یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ ایرا وہیں کھڑی رہی۔ منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر سسکتی ہوئی ـــــ اِتی کا جی چاہا اُسے دھکّا دے کر گھر سے نکال دے۔ لے جا کر سڑک پر پھینک

دے ۔اب اُس کا یہی ایک علاج رہ گیا ہے ۔اب وہ اس کی زیادہ ہمدردی کے لائق نہیں رہ گئی ہے ۔اُس نے خوب سمجھ لیا ہے ۔اچھی طرح دیکھ لیا ہے ۔وہ اُس کی حد سے بڑھی ہوئی ہمدردی کو اس کی کمزوری سمجھنے لگی ہے ۔اسی لئے بار بار اُس کے پاس لوٹ آتی ہے ۔یہ اُس کی محض مکاری ہے ۔

وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا اُسے طیش بھری آنکھوں سے دیکھتا رہا ۔ایرا نے سسکنا بند کر دیا تھا ۔لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے ۔وہ بھی خاموش کھڑی اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی ۔اُس کی آنکھوں میں حد درجہ تأسف اور ندامت کی کیفیت بھی تھا ۔

لیکن اب اینی اُس کی بے بسی سے متاثر ہونے کے لئے تیار نہیں ۔جو کچھ وہ سوچ چکا تھا اُس کا عملی اظہار بھی کر دینا چاہتا تھا ۔اُس کی حرکتوں سے اُس کے اندر جو بیزاری پیدا ہو چکی تھی اُسے ایرا کو بھی جان لینا چاہیئے تھا ۔

لیکن وہ اُس سے کچھ کہے بغیر صوفے پر بیٹھ گیا ۔اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا ۔ایرا دھوک نے باہر جانے کے لئے قدم بڑھائے ۔لیکن دروازے تک پہنچ کر رُک گئی ۔دروازے کا ایک پٹ کھول کر جھانکا ۔باہر گھپ اندھیرا تھا ۔گہرا سناٹا تھا ۔دُور دور تک ایک بھی نفس آتا یا جاتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا ۔

اُس نے دروازہ بند کر دیا ۔اور واپس آگئی ۔اینی کے سامنے ایک صوفے پر سے ایک کشن اُٹھایا اور فرش پر بچھے قالین پر رکھ دیا ۔پھر اُس پر ماتھا رکھ کر اوندھی لیٹ گئی ۔دونوں بازوؤں میں مُنہ چھپا کر ۔

اینی نے اپنا تمام تر غصہ ،ساری نفرت بڑی مشکل سے دبا کر اُس کی طرف دیکھا ۔اُس کے آس پاس دیواروں کے ساتھ ساتھ ،صوفوں کے نیچے بھی کئی بوتلیں اور گلاس خالی پڑے تھے ۔اُسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا ۔اُس لڑکی نے میرے گھر کو کس بیدردی سے استعمال کیا ہے ۔! اُسے گھر کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہیں ہے !

وہ وہاں سے اُٹھا تو اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے اُس نے ایک بوتل کو بے اختیار زور سے ٹھوکر ماردی ۔خالی بوتل بجتی اور لڑھکتی ہوئی کمرے کے اندر ادھر اُدھر میزوں اور کُرسیوں سے ٹکراتی پھری ۔جس کی آواز سُن کر ایرا نے لمحہ بھر کے لئے حیرت سے سر اُٹھا کر دیکھا ۔جب بوتل ساکت ہو گئی تو اُس نے اپنا مُنہ پھر کشن میں ڈبو لیا ۔۔۔

۲۱
اکیس

صبح رانی کی آنکھ کھلی تو اپرا اُس سے پہلے جاگ اُٹھی تھی۔ نہا دھو کر کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ رانی آج آفس جانے سے پہلے پنکی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ کل رات کے واقعے کے بعد اُس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ اُسے بتانا چاہتا تھا کہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں ہے وہ اپرا کے سامنے بالکل بے بس ہوتا جا رہا ہے ـــــ وہ اُسے بچا لے۔ نہیں تو وہ اپنی جان دے دے گا۔

اپرا نے اُس کے سامنے چائے لا کر رکھی تو وہ کوئی توجہ دیئے بغیر ہی باہر نکل گیا۔ سیدھا پنکی کے گھر جا پہنچا ـــــ اُس کے ممی ڈیڈی حسبِ معمول اُس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ وہاں اُن کا سمدھی مکندی لال شاہ بھی موجود تھا۔ اُن کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اسی تاریخ میں وہ اپنی بیٹی پنکی اور رانی کی بھی شادی کیوں نہ کر دیں۔ یہ ایک پنتھ دو کاج کے مترادف ہو گا۔ پنکی کے والدین کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا اگر پنکی اور رانی دونوں رضامند ہوں تو۔ لیکن وہ تقریب نینی تال کے بجائے لکھنؤ میں چاہتے تھے۔ مکندی لال شاہ کو اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے اس بارے میں رانی کی رائے جاننا چاہی تو وہ پنکی سے بات کرنے کیلئے چل دیا۔

پنکی اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ کچن میں کھڑی ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ وہ وہاں دبے پاؤں گیا تھا۔ اُس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے کام کرتے ہوئے کئی لمحوں تک دیکھتا رہا۔ اُس نے اپنے بال سر کے اوپر سمیٹ رکھے تھے۔ ایک خوب صورت گولا بنا کر اُس سے اُس کی سفید گوری گردن کی لمبائی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ پر نٹڈ میکسی میں سے اس کے جوان جسم کی ساری گولائیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ کل تک یہ سارا جسم اُس کی باہوں میں تھا۔ گذشتہ

سارا ہفتہ اُسی کے قبضے میں رہا تھا۔ اُس کا اب بھی بے اختیار جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں میں بھر لے۔ لیکن اُس نے اِدھر اُدھر چور نظروں سے دیکھا۔ کوئی آ نہ جائے وہاں!
وہ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ پنکی نے اچانک سر گھما لیا۔ اُسے وہاں کھڑا پا کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ پھر اُسے نظر انداز کر کے اپنے کام میں جُٹ گئی۔ اُس نے پنکی کی آنکھوں کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ وہ ابھی تک برہم تھی۔

"مجھے کچھ کہنے کا موقعہ دو گی؟ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں تمہیں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے — تم تو جانتی ہو میں صرف تم ہی کو پیار کرتا ہوں۔"

پنکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک برتن میں جلدی جلدی انڈے پھوڑنے لگی۔ اِنّی نے اُس کے ہاتھ سے برتن لے لیا۔ "لاؤ، میں کر دوں کچھ مدد۔"

"رہنے دو!" اُس نے اِنّی کے ہاتھ سے برتن لے لینا چاہا اور غصے سے بولی،
"نہیں چاہیے مجھے تمہاری مدد!"

لیکن وہ برتن اُٹھا کر وہاں سے ذرا دور ہٹ گیا۔ کھڑکی میں رکھ کر انڈے پھینٹنے لگا۔ اور بولا،
"میں سمجھتا تھا، تم وہیں رہ کر میرے ساتھ جھگڑا کرو گی! مجھ سے جواب مانگو گی کہ میرے گھر میں ایسا ہنگامہ کیوں ہوا؟ تمہیں تو چاہیے تھا اُن لوگوں کو دھکے مار مار کر باہر نکالتیں۔ لیکن تم خود ہی بھاگ نکلیں!"

"اُس وقت میں تم ہی سے ڈر گئی تھی۔ اچانک میری اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ اب سوچتی ہوں، تمہارے ساتھ شادی کرکے بعد میں مجھے پچھتانا نہ پڑ جائے!"

"اگر میں تمہیں یقین دلاؤں کہ ایسا نہیں ہوگا، تو!"

"تم پہلے بھی کئی بار یقین دلا چکے ہو!"

"لیکن مجھے بالکل معلوم نہیں تھا وہاں کیا ہو رہا ہے!"

"میں پوچھتی ہوں وہ لڑکی تمہارے گھر تک پہنچی کیسے؟ اُسے تمہارے فلیٹ کی چابی کہاں سے مل گئی؟"

اِنّی نے سوچا، اب اُسے ساری بات بتا ہی دے۔ جو کچھ ہوتا رہا ہے اُسے بھی معلوم ہو جانا چاہیئے — لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"تم جانتی ہو، مجھے اُس لڑکی سے کیوں ہمدردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں —"

"جو کچھ تم سمجھتے ہو وہ میں بھی اچھی جانتی ہوں۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر بولی — "مجھے اس لڑکی کے ساتھ تمہاری ہمدردی کا احساس شروع میں ہو گیا تھا۔ وہ سب کچھ اب تمہاری زبان سے بھی سن رہی ہوں۔ اب اور کہنے کو باقی رہ ہی کیا گیا ہے؟"

"پوری بات تو سنو میری!"

"جو تماشا میں نے کل رات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، کیا وہ تمہارے گھر میں ہونا چاہیئے تھا؟"

"یہی تو میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ اُس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ

میرے پیچھے یہ سب ہو رہا ہے! مجھ پر یقین کرو!"
آئی ایم سوری! میں ایسا نہیں کر سکتی۔ تمہارے بارے میں بھی ابھی سے کوئی فیصلہ کر لوں تو اچھا ہو گا۔"
"کونسا فیصلہ؟" اِتی کے بہت اندر سے جیسے ایک کراہ سی نکلی جسے صرف وہی سُن سکتا تھا۔
"کہ تمہارے ساتھ شادی نہ کروں!"
"پنکی!!! تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟ پھر کبھی ایسی بات زبان پر مت لانا۔ تمہیں معلوم ہے تمہارے بغیر میں ایک پل نہیں رہ سکتا!"
"یہ سب تمہارا دکھاوا ہے۔ مجھے بیوقوف بنانے کے لئے ہے"
"نہیں نہیں، پنکی نہیں! میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔" اُسے محسوس ہوا اُس کے اندر کوئی چیز اچانک ٹوٹ گئی ہے۔
"مجھے ایسا لگتا ہے میں تم سے نفرت کرنے لگی ہوں! کل ساری رات میں سو نہیں پائی!"
"میری بھی تو یہی حالت تھی۔"
اچانک وہاں پنکی کی ممی آ گئی۔ بولتی ہوئی۔
"ارے! تم لوگوں میں کس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے؟ وہاں تو تمہارے بیاہ کی چرچا ہو رہی ہے۔ چلو چلو۔"
"یہ کہہ کر وہ الماری میں سے کراکری نکالنے لگی۔ اِتی اور پنکی ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پنکی اچانک اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر رو پڑی"
"نہیں ممی! پلیز! ابھی میری شادی کی کوئی بات نہیں کیجئے۔" "میں ایسا نہیں کر سکتی"
"یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟" اُس کی ممی حیران ہو کر اپنی بیٹی کا منہ تکنے لگی۔ "تیرا سر تو نہیں پھر گیا!"
"نہیں ممی، پلیز! میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔ میں اب اُس کے ساتھ شادی نہیں کرونگی۔ اسے ٹال جایئے کسی طرح! میں آپ کو سب بتادوں گی بعد میں۔"
اُس کی ممی ٹھٹکی سی رہ گئی۔ جیسے اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا ہو! پھر جلدی ہی اسے برتن اٹھا کر لے جاتی ہوئی بولی۔
"اِتی تم ہی سمجھاؤ اِسے! دونوں جلدی سے باہر آ جاؤ۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔"
پنکی نے اُس کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے، اُس کی ساڑھی کا پلو پکڑ کر کہا —— "وہاں کسی سے میری شادی کی بات مت کیجئے گا۔ میں بتائے دیتی ہوں۔"
اُس کی ممی ان سُنی کر کے چل دی۔ اِتی بھی اُس کے پیچھے پیچھے جانے لگا تو اُس نے بھی اُس نے کہہ دیا ——
"تم بھی سُن لو . . . میرا آخری فیصلہ ہے۔ میرے بارے میں پھر کبھی مت سوچنا!"
اِتی نے اُس کی طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ جبکہ پنکی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

اس سے پہلے اُس نے پنکی کا یہ رُوپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ضدی ضرور تھی کسی بات پر اڑ جاتی تو اُسے پورا کر کے ہی رہتی تھی۔ لیکن پیار دُلار سے مان بھی جاتی تھی۔ غصے میں بھی وہ بے حد دلکش نظر آ رہی تھی۔ اُس نے خواہش کی، اب وہ اچانک مُسکرا دے۔ بھاگ کر اُس کے سینے کے ساتھ آ لگے۔ اُس کے بار بار رُوٹھنے کے اور خود سپردگی کے سارے انداز اِنّی کو یاد تھے۔ لیکن اس بار اُس کی شعلہ بار آنکھوں سے اُس کا ایک ہی ارادہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جو فیصلہ کر چکی تھی۔ اُسے بدلنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

اِنّی کے ہاتھ میں جو پلیٹیں تھیں وہ اُس نے کچن ہی میں رکھ دیں۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر اُن لوگوں سے کہا ——— "میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اسی وقت جانا ہے۔ فوراً۔ میرے آفس میں کچھ بہت ضروری کام ہے۔"

اُنہیں کچھ پوچھنے کا موقعہ دیے بغیر وہ باہر نکل آیا۔ اپنی اسکوٹر اسٹارٹ کرتے وقت اُس نے ایک بار اوپر دیکھا۔ پنکی کی کھڑکی بند تھی۔ اسی میں سے وہ اکثر جھانکتی تھی۔ اُسے ہاتھ ہلا کر وداع کرتی تھی۔ کبھی کبھی بڑی شوخی سے جیبھ نکال کر یا اُسے ٹھینگا دکھا کر چڑا دیتی تھی۔

اُسے ایسا محسوس ہوا، اب شاید وہ یہاں کبھی نہیں آ سکے گا۔ اپرا مدھوک اُسے ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی ہے۔ وہ اپنی سب سے قیمتی شے سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے لئے وہ خود بھی ذمّہ دار ہے!

۲۲ بائیس

آفس پہنچ کر راٹی نے اپرا مدھوک کی طرف بالکل نہیں دیکھا۔ سیدھا اپنے کیبن کے اندر چلا گیا۔ جس ریلوے افسر کے ساتھ اُسے آج ریلوے یارڈ میں جانا تھا اُس کے ساتھ اُس نے فوراً فون پر رابطہ قائم کیا۔ وہ اُس کا منتظر تھا۔

"میں بس پانچ منٹ میں آفس سے نکل رہا ہوں۔"

اسٹاف کار اُس نے پہلے سے بلوا رکھی تھی۔ پہلے وہ حضرت گنج گیا۔ وہاں سے اسسٹنٹ اوپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ کو ساتھ لیا اور ریلوے یارڈ کی طرف چل دیا۔ وہاں مختلف ریلوے لائنوں پر گیہوں، چاول و دیگر اجناس سے لدے ہوئے پانچ سو ویگن موجود تھے۔ ان سے سارا یارڈ ہی پٹ گیا تھا۔ اب صرف وہی لائنیں سواری گاڑیوں کے آنے اور جانے کے لئے خالی رہ گئی تھیں۔ اُن مال کے ڈبّوں کو خالی کرانے کے لئے مال گودام کے کسی بھی شیڈ یا سائیڈنگ میں جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ اس میں کچھ تکنیکی دشواریاں حائل تھیں۔ جو ریلوے کی بڑی مال گودام اور فوڈ کارپوریشن کی سائیڈنگ سے ملی ہوئی تھی، اُس پر ایک انجن کے پٹری سے اُتر جانے سے سارا راستہ ہی بند ہو گیا تھا۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ اناج کی گاڑیوں کے علاوہ وہاں سیمنٹ، کوئلہ، فولاد اور دیگر سامان سے بھی لدے ہوئے کئی ویگن اُسی ہفتے لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ جن سے سارا یارڈ پٹ گیا تھا۔ ایک تیسرا سبب بھی تھا۔ ایک مذہبی سیاسی پارٹی کے کارکنوں نے اپنے سیاسی اغراض کے لئے ٹرانسپورٹ والوں سے بھاری چندے زبردستی وصول کرنے کی کوشش کی تھی جن میں اکثریت سکھوں کی تھی۔ جوشیلے سیاسی کارکنوں نے چندہ نہیں دینے کی صورت میں اُن کے ٹرک جلا دینے کی دھمکی دے دی تھی۔ اس پر ہزاروں ٹرک ڈرائیوروں نے ہڑتال کر دی تھی جو روزانہ مال گودام اور فوڈ کارپوریشن کی سائیڈنگ سے اناج کی بوریاں اُتار اُتار کر گوداموں میں پہنچاتے تھے۔

ریلوے اتھارٹی نے اسٹیشنوں کو ایک فوری ہدایت جاری کر کے دوسرے شہروں سے

لکھنؤ کے لئے مزید اناج کی بکنگ اور مال گاڑیوں کی روانگی پر روک لگا دی تھی۔ پھر بھی جو ویگن پہلے سے بُک کئے جا چکے تھے اور انہیں لکھنؤ کی جانب روانہ کیا جا چکا تھا انہیں تو کہیں نہ کہیں اُتارا جانا ضروری تھا۔ اناج سے بھرے ہوئے ویگن ہر ممکن طریقے سے مختلف شیڈوں میں لگوانے کے لئے اِندر ملہوترا نے ریل کے محکمے سے خصوصی درخواست کی تھی۔ اس مقصد کے لئے ریلوے کے محکمے نے اسی کام کے لئے ایک اعلیٰ افسر متعین کر دیا تھا۔ وہاں دونوں محکموں کے کئی انسپکٹر موجود تھے جو یارڈ کے عملے کے آگے پیچھے مارے مارے گھوم رہے تھے۔

بیشمار ریلوے لائنوں پر سے گذر کر اور مال گاڑی کے ڈبوں سے رگڑ کھا کھا کر اِنّی کے بوٹ گرد آلود ہو گئے تھے اور اُس کے کپڑوں پر کہیں روغن کے کہیں تیل کے دھبّے لگ گئے تھے۔ ریلوے کے افسر سردار کرپال سنگھ کی بھی ویسی ہی حالت بنی ہوئی تھی لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ دونوں ایک ڈیڑھ کلومیٹر تک مہر بند ڈبوں کی لمبی لمبی قطاروں کے درمیان گھومتے پھرے۔ جہاں جہاں اناج کے ویگن رکے ہوئے تھے۔ اُن کا معائنہ کیا۔ پھر چیف یارڈ ماسٹر کے تین منزلہ کیبن پر جا کر شنٹنگ آپریشن کو بھی دیکھا۔ ایک انجن مال گاڑیوں کو کھینچتا ہوا دوسری لائن پر لے جانے کے لئے بہت دُور تک چلا گیا تھا۔ یارڈ ماسٹر خود مائیک کو ہاتھ میں لئے یارڈ میں مختلف کھمبوں سے لگے لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے کانٹا بدلنے والے اور جھنڈی دکھانے والے عملے کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہاں سے میلوں تک پھیلا ہوا یارڈ، شیڈوں پر پڑی ہوئی ٹین کی چھتیں اور اسٹیشن کی عمارت کی لال لال بُرجیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر ایک پٹڑی پر مال گاڑی کے لال رنگ کے ڈبّے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ بچّوں کے کھلونوں کی طرح۔ بعض بغیر چھت کے یعنی کھلے ہوئے ویگنوں میں جنہیں آدھے یا فلیٹ بھی کہتے تھے اسٹیل کے بھاری بھاری گرڈر، چادریں، بڑی بڑی مشینیں اور لمبے لمبے پائپ بھی لدے ہوئے تھے۔ بعض مشینیں بڑے بڑے لکڑی کے کریٹوں میں بند تھیں۔ کسی کسی فلیٹ پر ٹریکٹر اور ملٹری کے چھوٹے ٹرک بھی لدے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جس جگہ انجن پٹڑی سے اُتر گیا تھا وہاں اُسے اُٹھا کر پھر سے پٹڑی پر رکھنے کے لئے ایک بہت ہی بھاری کرین زور زور سے جیسے اپنے دانت کٹکٹا رہا تھا ـــــ کٹ کٹ کٹ!!!

مضبوط فولادی گراریوں کی اس مسلسل کٹکٹاہٹ کو اِنّی نے اپنی ہڈیوں تک میں سرایت کرتا ہوا محسوس کیا اور اچانک اُسے یاد آیا، اُس نے صبح سے ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ چائے کی ایک پیالی تک اُس کے حلق سے نیچے نہیں اُتری ہے۔ بھوک، پیاس اور تھکن سے وہ بالکل نڈھال ہو چکا ہے۔

اُس نے سردار کرپال سنگھ سے پوچھا ـــــ "جب آپ کے اسٹاف کو چائے کی طلب محسوس ہوتی ہے تو وہ کہاں سے منگواتے ہیں؟"

ریلوے افسر سمجھ گیا۔ اُس کا مدعا کیا ہے۔ وہ خود بھی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی

داڑھی مونچھوں پر گرد کے ذرّے اٹکے ہوئے تھے۔ اس نے یارڈ ماسٹر کی طرف دیکھا جو اُن کے قریب ہی کھڑا تھا اور اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔

اُس نے کہا ـــــــ "چائے لانے کے لئے آدمی بھیجا جا چکا ہے۔ ٹی اسٹال یہاں سے آدھا میل دُور موتو یہ میں ہے ـــــــ آتا ہوگا۔"

اِتّی نے اُسی جانب دیکھا جدھر موتو یہ محلہ تھا۔ اُسے دُور سے گرد و غبار کا ایک بگولہ رقص کرتا ہوا سا دکھائی دیا۔ ویگنوں کے فولادی جسموں کے ساتھ ٹکراتا، بکھرتا اور پہیوں کے نیچے نیچے سرک کر نکلتا ہوا سا۔ جب وہ یکسر بکھر گیا تو اُسے ایک پورٹر آتا ہوا نظر آیا۔ جس نے اپنی پگڑی سے سر اور چہرے کا آدھا حصّہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس کی ناک اور آنکھیں ہی کپڑے سے باہر تھیں۔ وہ دھوپ اور لُو سے اسی طرح خود کو بچاتا ہوا چل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں چائے کی ایک المونیم کی کیتلی اور کچھ پکائی ہوئی مٹّی کے کُلّھڑ تھے۔

اُس آدمی نے وہاں تک پہنچنے میں مزید پانچ منٹ لئے۔ کیبن کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور سب کو گرم گرم چائے پیش کی۔

جب وہ چائے پی چکے تو ایک ٹریفک انسپکٹر نے یہ تجویز رکھی کہ لکھنؤ کے شمال میں چار اسٹیشن ایسے ہیں جہاں سائیڈنگ کی سہولیات موجود ہیں۔ عالم نگر، کاکوری، ملیح آباد اور ردلادر نگر۔ وہاں ویگن کھڑے کرنے کے لئے جگہ بھی خالی ہے۔ اناج کی ساری گاڑیوں کو وہیں بھیج کر خالی کرایا جاسکتا ہے۔ وہاں سے فوڈ کارپوریشن والے سارا اناج ٹرکوں سے اٹھالے جانے کے لئے خود اپنا انتظام کرلیں۔

تجویز معقول تھی۔ کرپال سنگھ نے فون پر اپنے محکمے سے رابطہ قائم کیا اور پھر چیف یارڈ ماسٹر اور چاروں اسٹیشنوں کے اسٹیشن ماسٹروں کو ہدایات دیدیں۔ اِتّی نے اپنے ریجنل منیجر فاروقی سے بات کی اور ٹرک ڈرائیوروں کو پولیس فورس کے ساتھ وہاں بھجوانے کے لئے درخواست کی۔ فاروقی اس سلسلے میں پہلے ہی پولیس کے افسروں سے گفت و شنید کر رہا تھا ـــــــ بہرحال ایک حل نکل آیا تو اندر نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ غیر ضروری گاڑیوں کو الگ پٹری پر ڈال کر شمال میں چار قریبی اسٹیشنوں کو روانہ کرنے کے لئے چار لوکو، تیار کر دیئے گئے تھے لیکن اس میں چار گھنٹے لگ گئے۔ اُدھر کی جانب آنے والی سواری اور ایکسپریس مال گاڑیوں کے اوقات کے درمیانی وقفوں میں اب "فوڈ گرین اسپشل" گاڑیوں کو بھجوایا جاسکتا تھا۔ اب کل سے شہر میں اناج کی کمی کا خطرہ بالکل ٹل گیا تھا۔

وہاں سے وہ شام کو چھ بجے اپنے آفس واپس آیا۔ وہاں سوائے ایک چپراسی کے اور کوئی نہیں تھا ـــــــ اپنے کیبن میں جاکر وہ اپنی کرسی پر گر سا پڑا۔ اُس کا بدن تھکن

سے چور چور ہو رہا تھا۔ چپراسی کو بھیج کر اُس نے ایک ریستوراں سے کچھ ہلکا پھلکا کھانا منگوایا۔ گرد اور پسینے سے اُس کے کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ دفتر ہی میں منہ ہاتھ دھو کر وہ تازہ دم ہو گیا۔ اُس نے دہلی آفس کے بڑے افسروں کو اپنی دن بھر کی کارگذاری کی رپورٹ دی اور کامیابی کی خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہیں اطلاع دینا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ انہی افسروں نے وہاں سے فون کر کر کے فاروقی اور اُس کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ اُس نے فاروقی کو بھی اُس کے گھر فون کر کے مطلع کیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اُسے شاباش دی۔

اُس نے پنکی کو بھی یاد کیا۔ اگرچہ اب اُس کا تصور اتنا راحت بخش نہیں تھا۔ پہلے اُسے جب بھی یاد کرتا تھا تو اُس کے بدن میں نئی جان آجاتی تھی۔ آج شاید اُس کی طرف سے مایوس ہو جانے کی وجہ سے ہی اُس نے اتنی سخت محنت کی تھی۔ وہ اُسے دن بھر یاد ڈ میں بھٹکتا ہوا دیکھ سکتی تو اُسے وہ اُس کی اذیت پسندی ہی کا نام دیتی۔ اپنے آپ کو سزا دینے کا نام اور اپنا سارا غصہ بھی بھول جاتی۔ آگے بڑھ کر اُس کا پسینہ پونچھتی۔ "اتنا زیادہ کام کرنے کے لئے اُسے ڈانٹ پلاتی۔ وہ اُس کے ہاتھوں کا نرم نرم لمس پا کر اپنی ساری تھکن بھول جاتا۔ اُس نے سوچا، اس وقت اُسے سچ مچ پنکی کی ضرورت ہے! وہ اُس کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اُسے یہاں ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ اسی دم!

اُسے بلانے کے لئے اُس نے ایک فون نمبر یاد کیا۔ جو پنکی کے ایک پڑوسی کا تھا۔ وہ لوگ پنکی کو فوراً بلا دیتے تھے۔ اُنہوں نے اُس وقت بھی ویسا ہی کیا۔ پنکی کی آواز سننے کا انتظار اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کیا۔ لیکن وہ ابھی تک برہم تھی۔ اپنی بات پر پوری طرح قائم!

"میں تمہارے ساتھ اب کبھی بات نہیں کروں گی۔ پھر کبھی اس نمبر پر مجھے فون نہ کرنا۔ اس وقت میں سر کے پاس جا رہی تھی۔ مجھے اپنا تھیسس جلد سے جلد مکمل کرنا ہے۔"

اسی بیچ میں چپڑاسی ناشتہ لے کر آگیا۔ جسے اُس نے جلدی جلدی زہر مار کیا۔ پھر سریندر کو ایک طویل خط لکھا ۔۔۔ اُسے اُن سارے حالات سے آگاہ کر دیا جو اُس پر گذر چکے تھے۔ اپرا مدھوک کے لئے اُس کے دل میں جو ہمدردی تھی اُس کو بھی اُس نے نہیں چھپایا۔ اس لئے کہ اُسے اپنے دوست پر پورا اعتماد تھا۔ وہ اُسے کبھی غلط نہیں سمجھے گا۔ اُس کی مدد کرنے کے لئے وہ فوراً لکھنؤ چلا آئے گا۔

خط پوسٹ کرنے کے لئے وہ "جی پی او" چل دیا۔ وہیں سے وہ اپنی قیامگاہ کی طرف نکل گیا۔ گھر جا کر وہ فوراً سو جانا چاہتا تھا۔ اُسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ راج بھون کے سامنے والی سڑک پر ٹریفک قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بارش کا ایک چھینٹا پڑ چکا تھا۔ بھیگی ہوئی سڑک سے ایک عجیب سی مہک اُٹھ رہی تھی۔ لیکن وہ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہرگز نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیسی تھی!

۲۳ تئیس

اِنّی اپنے فلیٹ پر پہنچا تو دیکھا، ایرا مدھوک ابھی تک وہیں تھی۔ وہ باتھ روم سے اُس کی میلی شرٹیں اور پتلونیں دھو کر باہر نکلی تھی۔ وہ انہیں برامدے میں آر پار ٹنگے ہوئے تار پر لٹکانے کے لئے بڑھ گئی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی اِنّی کو طیش آ گیا۔ آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھوں سے کپڑے چھین لئے اور چلّا کر بولا۔

"یہ سب تم نے کیوں کیا؟ ایسا کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

ایرا خاموش کھڑی اُسے گھورتی رہی۔ اُسے فوراً کوئی جواب نہیں دے سکی۔ لیکن اُس نے اِنّی کے ہاتھوں سے کپڑے لے لینے کی کوشش ضرور کی۔

اِنّی کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔ بولا،

"میں نے کہا نا، یہ سب تم مت کیا کرو۔"

یہ سن کر ایرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ کپڑوں کو فرش پر پٹخ کر اندر چلا گیا۔ جاتے ہی پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایرا کپڑے لٹکا کر کچن میں چلی گئی۔ کھانا تیار کرنے کے لئے۔

اِنّی کچن سے آنے والی آوازوں کو سن رہا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ سوچتا رہا، اس لڑکی سے کیونکر پیچھا چھڑائے۔ اُس کے ساتھ اُس کا کونسا رشتہ ہے؟ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے کوئی نہیں لگتے۔ اُس نے ایرا کی طرف کبھی ویسی نظر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح عیاش مرد دوسری عورتوں کی طرف دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ایسا دل بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کئے ہوئے تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک پرچھائیں کی مانند چلتی ہوئی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دروازے کی چوکھٹ پر ہی رُک کر دھیرے سے بولی۔

"سر کھانا میز پر لگا دیا ہے۔"

وہ اس طرح سہمی ہوئی تھی کہ شاید اِتّی اب بھی غصّے سے اُس سے جواب طلب کرے گا

"یہ سب تم نے کیوں کیا؟ اس کا تمہیں کیا حق تھا؟"

وہ کئی لمحوں تک اُس کے جواب کی منتظر رہی۔ لیکن اِتّی نے اُسے جھڑکا نہ ہی کوئی جواب دیا۔ وہ خاصی لیس و پیش کے بعد چپکے سے اُٹھا اور کپڑے بدلنے کے لئے باتھ روم میں چلا گیا —— منہ ہاتھ دھوکر کُرتا پاجامہ پہنا اور ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔

دونوں بڑی خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ ایرا نے کھانا بہت لذیذ بنایا تھا۔ اچھے کھانے کی لذّت سے سرشار ہوکر اُس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی۔ لیکن اُس نے پھر بھی اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ ایرا نے بھی نہیں پوچھا —— سر آپ کو کھانا پسند آیا؟ اگرچہ وہ چاہتی تھی وہ تعریف کے دو بول اُس کے لئے ضرور کہہ دے۔ ٹیبل پر اُن دونوں کے کھانا چبانے کی ہلکی ہلکی آوازیں آیا۔ برتنوں کے اچانک ایک دوسرے سے ٹکرا جانے سے ایک سریلی کھنک سی پیدا ہوتی رہی۔

ایرا نے دیکھا، اُس کے چہرے پر اب خاصی نرمی پیدا ہوگئی ہے۔ اُس کی نظروں میں ایک قسم کی معذرت خواہی بھی موجود ہے۔ لیکن پھر بھی اُس کی ہمت نہ پڑی کہ کچھ کہہ سکے۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ بولا

"آئی ایم ساری! میں آج بہت تھکا ہوا تھا۔ بہت زیادہ پریشان بھی۔ تم جانتی ہو، میں پنکی سے کتنی محبت کرتا ہوں! تمہاری وجہ سے وہ مجھ سے خفا ہوگئی ہے۔ اُس نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

ایرا اُس کی باتیں بڑے غور سے سُنتی رہی۔ اُس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ لیکن اُس نے اپنے آنسو گرنے نہیں دیے —— اُس نے اُسے کوئی جواب بھی نہ دیا۔ جب وہ ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھا تو اُس نے بھی برتن سمیٹے اور انہیں دھونے کے لئے سنک پر لے گئی۔

ایرا کے لئے اِتّی کے دل میں اچانک ایک عجیب سا کرب پیدا ہوگیا۔ اُس کے لئے اُس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں کی تاب لانا مشکل ہوگیا۔ وہ جب بھی —— ایسی خاموشی، بے بسی اور مظلومیت سے اُس کی طرف دیکھتی تھی تو اُس کے اندر بے پناہ ترس پیدا ہوجاتا تھا۔ وہ پوری شدّت سے محسوس کرنے لگتا کہ اُسے میری ضرورت ہے۔ اُس کی محرومی کو صرف میں سمجھ سکتا ہوں اور اُسے برداشت کرنے کا میں عادی بھی ہوتا جا رہا ہوں۔

وہ اُس کے پیچھے پیچھے کچن میں چلا گیا۔ اُس کے ساتھ کھڑا ہو کر برتن دھونے میں اُس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ سارے برتن دھوئے جا چکے تو ایرا ڈرائنگ میں جا بیٹھی۔ ایک میگزین اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ اِنّی بھی سگریٹ ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ سگریٹ سُلگا کر ڈبیا اُس کی طرف بڑھا دی۔ ایرا نے بڑی حیرت سے اُس کی طرف دیکھا اور سگریٹ قبول کر لی۔ اِنّی نے ہی اُس کی سگریٹ سُلگائی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور پنکی کی جے پور سے لائی ہوئی کتاب پڑھنے لگا۔ جس کے پہلے صفحے پر پنکی نے اپنے پین سے جلدی جلدی یہ سطریں گھسیٹ دی تھیں۔

"اپنے اور صرف اپنے اِنّی کے لئے۔"

چوبیس ۲۴

اسرا مدھوک نے اچانک کلب جانا چھوڑ دیا تھا۔ دفتر سے لوٹ کر وہ اِنّی کے گھر چلی جاتی تھی۔ جہاں وہ اپنے آپ ہی مقیم ہو گئی تھی۔ اِنّی نے اُسے منع نہیں کیا تھا۔ اگرچہ وہ اُس کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اِنّی کی کلب میں حاضریاں اب بڑھ گئی تھیں۔ دفتر سے نکل کر سیدھے وہیں پہنچ جاتا تھا۔ وہاں اُسے وہی سب لوگ ملتے تھے جن میں سے کچھ کو وہ پسند کرتا تھا کچھ کو نہیں۔ دامودر گپتا اُس کے سخت ناپسندیدہ لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔

ایک روز اُسے وہاں ریتو دکھائی دے گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا پتی بیکُنٹھ شولاپورکر بھی تھا۔ ریتو پہلے سے زیادہ اسمارٹ نظر آئی۔ اُس نے اپنا وزن کچھ کم کر لیا تھا۔ وہ خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔ جب تک وہ دامودر گپتا کے ساتھ ناجائز طور پر وابستہ رہی ہمیشہ ذہنی اذیت میں مبتلا نظر آئی۔ اب وہ ایک باعزت بیوی تھی۔ لوگوں نے اُس کے بارے میں باتیں بنانا چھوڑ دیا تھا۔ شہری زندگی نئی قدروں کو قبول کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لیتی۔ اس میں اُس کے تقاضوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ جو آج بُرا ہے وہ کل اچھا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ سماج کے کچھ لوگ اپنی رائے بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تو کچھ لوگ اس پر اصرار نہیں بھی کرتے ہیں۔ یہ سب نہ ہو تب بھی انسان اپنی ایک انفرادی زندگی بسر کرنے کا پورا حوصلہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی راہ تلاش کر لیتا ہے، وہ چاہے کتنی ہی دشوار کیوں نہ ہو۔

شولاپورکر اگرچہ ریتو سے عمر میں کچھ سال چھوٹا تھا لیکن وہ اُس کے ساتھ سجتا تھا۔ اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ یہ جوڑی دراصل ادب اور آرٹ کا سنگم تھی۔ ایک ہی ذہنی سطح کے دو انسان آپس میں مل گئے تھے۔ اُن کے لئے عمروں کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

اِنّی اُن دونوں سے بڑی خوش دلی سے ملا۔ دونوں کے لئے بیئر منگائی۔ اُن کے ساتھ اُن کے نئے ڈرامے کے پروجیکٹ کے بارے میں باتیں کیں جسے وہ ٹی وی کے لئے تیار کر رہے تھے۔

اچانک رینو نے اُس سے ایرا مدھوک کے بارے میں دریافت کیا۔

"ملہوترا صاحب، آج کل ایرا کہاں ہے؟ بہت دنوں سے نظر نہیں آئی۔"

اِنّی کو اندازہ تھا کہ اُسے معلوم ہے کہ ایرا کہاں ہے۔ اُس نے کوئی واضح جواب دینے کے بجائے صرف کندھے اُچکا دیئے۔

"اچھا سنیئے، آپ اُس کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

وہ اس قسم کے موضوع پر کوئی بات ہی سُننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن کوئی سخت جواب دے کر اُس کے جذبات کو مجروح بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا رینو کے دل میں اپنے جیسی دھکّے کھائی ہوئی ایرا مدھوک کے لئے ایک سچّی ہمدردی موجود تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایرا جنگل جیسی زندگی میں بے سہارا بھٹکتی پھرے۔ اُس نے اُس کی نیک نیتی کو تسلیم تو کیا مگر دل ہی دل میں۔ اور اپنے چہرے پر کوئی تاثر بھی نہیں اُبھرنے دیا۔

اُسی وقت دامودر گپتا اپنے ہاتھ میں گلاس اُٹھائے وہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے رینو کی تجویز سُن لی تھی۔ اُس نے آتے ہی اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ملہوترا جی، اگر آپ ایرا کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیں تو اس کا سارا خرچہ میں برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

یہ سُنتے ہی اِنّی کو غصّہ آ گیا۔ چلّا کر بولا۔

تم کوئی خدائی فوجدار ہو! ایسی ساری لڑکیوں کی شادی کرانے کا تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے جنہیں تم ایکسپلائٹ کرتے رہتے ہو؟"

اُس کی چلّاہٹ سُن کر بہت سے لوگ اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن اِنّی کی پھٹکار سُن کر بھی دامودر کے چہرے پر کھسیاہٹ نہیں اُبھری۔ بلکہ وہ بڑی ڈھٹائی سے کھڑا مسکرا رہا تھا اور لوگوں کی طرف بڑے فخریہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اِنّی کے لئے اس ماحول میں مزید رُکنا مشکل ہو گیا۔ وہ جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔

اپنے فلیٹ پر جانے کے بجائے وہ بے اختیار پنکی کے گھر کی طرف چل دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ وہاں جا کر اُس سے کیا کہے گا! پنکی نے تو اپنی طرف سے قطعی فیصلہ سُنا دیا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ اب کوئی بھی بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس بات کا اُسے پورا یقین تھا۔ پھر بھی وہ اُس کے گھر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کیا اُس پر اپنی بے بسی ظاہر کرنے کے لئے جو اُس کے چہرے پر نمایاں رہنے لگی تھی! یا اُس کے ماں باپ سے

ملنے کے لئے ـــــ؟ انہیں محض سلام کرنے کے لئے، جو کہ اُس کا فرض بنتا تھا۔
اُسے یہی بات زیادہ اچھی لگی۔ مدلل بھی۔ پنکی کے ممی ڈیڈی کے ساتھ تو اُس کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

جب وہ اُن کے فلیٹ پر پہنچا تو دونوں تنہا تھے۔ سریندر نے انہیں رنگین فوٹوؤں کا ایک پیکٹ بھیجا تھا، پنکی اور اس کی نینی تال کی سیاحت کے بارے میں۔ وہ بہت خوش ہو کر ایک ایک فوٹو دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کو دکھا دکھا کر ہنس رہے تھے۔

اِنّی کو دیکھ کر دینا ناتھ کپور نے گمبھیر تا مگر بڑی خوشدلی سے کہا۔
"آؤ آؤ اِنّی! بڑے اچھے موقعے پر آئے ہو۔ یہ دیکھو تم لوگوں کے کتنے اچھے اچھے فوٹو آئے ہیں۔ ابھی ابھی ایک آدمی یہ پیکٹ دے کر گیا ہے۔"

مسز کپور نے کئی فوٹوؤں میں سے ایک فوٹو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا ـــــ "بیٹا یہ تم دونوں کی فوٹو تو بہت بڑھیا آئی ہے!"

اِنّی نے دیکھا، یہ وہی تصویر تھی جب وہ بھیم تال کی طرف کے ایک جنگل میں پنکی کے پیچھے پیچھے بھاگا چلا جا رہا تھا اور پنکی ایک ہرنی کی طرح چھلانگیں لگاتی ہوئی اُس کی پکڑ میں نہیں آ رہی تھی۔ سریندر کی منگیتر دیشی نے اس لمحے کو کیمرے کے لینز میں قید کرنے میں بڑی فنکاری دکھائی تھی۔ اُس نے پنکی کی ممی کے ہاتھ سے تصاویر کا سارا پیکٹ لے لیا اور بڑے دُکھی من سے ایک ایک فوٹو دیکھنے لگا۔ اُن چاروں کے کئی الگ الگ کلوز آپ تھے۔ کئی گروپ بھی اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے، کھانے کی میز پر، پورے ہل ٹاپ کا ویو، گھوڑوں کی سواری اور جھیل میں بوٹنگ کرتے ہوئے! ایک فوٹو میں دیشی سریندر کی گردن میں پیچھے سے باہیں ڈال کر کھڑی تھی۔ اُسے یہ فوٹو دیکھ کر یاد آیا، دیشی نے پنکی سے بھی کہا تھا کہ وہ بھی اپنے محبوب کے گلے میں اسی طرح باہیں ڈال کر کھڑی ہو جائے۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اُسی فوٹو کی تلاش کرنے لگا۔ وہ فوٹو اس پیکٹ میں موجود تھی۔ وہ پنکی کی آنکھوں میں اپنے لئے پیار کی بے پناہ چمک دیکھ کر بھول سا گیا کہ وہ کہاں ہے؟ پنکی کی ممی اُسے تصویر دیکھنے میں محو دیکھ کر اُٹھ گئی یہ کہتے ہوئے۔
"پنکی کو اس وقت تک آجانا چاہیئے تھا ـــــ! صبح سے اپنے پروفیسر کے پاس گئی ہوئی ہے۔"

اُس نے کھڑکی میں سے جھانکا اور پھر پلٹ کر بولی ـــــ "کھانا کھا کر جانا اِنّی! آج بہت دنوں کے بعد آئے ہو۔"

"نہیں ممی اب میں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے سارے فوٹو لفافے میں پھر سے ڈالکر میز پر رکھ دیئے۔

دینا ناتھ کپور کرسی کے ساتھ پیٹھ لگائے پائپ پی رہے تھے۔ وہ جس انداز سے

جلدی جلدی کش لے کر دھواں اُگلتے تھے اُس سے اُن کی اندرونی بے چینی کا پتہ چلتا تھا۔
اِتی کو جانے کے لئے اُٹھتا دیکھ کر بولے —— "اچھا ہوتا آج ہم سب کھانے کی ٹیبل پر جمع ہوتے اور کچھ باتیں بھی کر لیتے!"

اِتی کو معلوم نہیں تھا پنکی نے اُن سے اُس کے بارے میں کیا کیا کہا تھا! ہو سکتا ہے اُس نے ایرا مدھوک کا بھی ذکر کیا ہو! اُسی کی برہمی کا سب سے بڑا کارن ایرا مدھوک ہی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسا کارن بھی نہیں تھا کہ اُسے دُور نہ کیا جا سکتا ہو! اس میں دونوں کی باہمی سمجھداری کی ضرورت تھی۔ لیکن پنکی سنجیدگی سے اس مسئلے پر کچھ کہنے سُننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ پتہ نہیں، ان فوٹوؤں کے بارے میں اُس کا کیا ردّعمل تھا! شاید اُس نے ابھی یہ فوٹو دیکھے ہی نہیں تھے۔ دیکھے ہوتے تو اُس نے انہیں فوراً ایک طرف پھینک دیا ہوتا یا پھاڑ ہی دیا ہوتا! وہ اُس کے سبھاؤ سے واقف تھا۔ غصّے میں وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اُسے اس وقت بھی پنکی کا سامنا کرتے ہوئے کچھ جھجک سی محسوس ہوئی۔ اگرچہ وہاں وہ اُسی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے اختیار چلا آیا تھا۔ اب اُسی کی نظروں سے بچنے کے لئے جلدی سے واپس چلا جانا چاہتا تھا۔

اُس نے جاتے جاتے کہا —— "پھر کسی دن آ جاؤں گا"!

اُن کے فلیٹ سے نیچے اترتے وقت وہ اُن سیڑھیوں پر رُک سا گیا جہاں بیٹھ کر اُنہوں نے کئی بار اندھیرے میں ایک دوسرے کو پیار کیا تھا۔

اس نے سڑک پر آ کر اسکوٹر اسٹارٹ کرتے وقت بھی اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاید پنکی آ رہی ہو۔ اُسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رُکے گی اور جلدی جلدی اُوپر چلی جائے گی۔ یا وہ خود اُسے دیکھ کر جلدی سے روانہ ہو جائے گا۔ اُس کے ساتھ کوئی بات کئے بغیر ہی! پھر اُسے اس طرح کی حماقت بھری باتیں سوچنے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی اور وہ جلدی سے چل دیا۔

وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو اُس کے دل پر پہاڑ سا بوجھ تھا۔ آج وہ پہلی بار پنکی کے گھر سے پنکی سے ملے بغیر واپس آ گیا تھا۔ اُس کی واپسی کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کے دل کے اندر کہیں پر احساسِ ندامت بھی تھا۔ پشیمانی کی کیفیت بھی —— اُس نے ایسا کر کے پنکی کے ماں باپ کو بھی چوٹ پہنچائی تھی۔ اُن کی نظروں میں اپنی وقعت کم کر لی تھی۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ پنکی کے رویّے میں بھلے ہی کوئی تبدیلی نہیں نظر آتی اُسے انتظار کرنا چاہیئے تھا۔

یہاں ایرا اُس کی منتظر تھی۔ وہ کھانا بنا چکی تھی۔ وقت کاٹنے کے لئے اُس کے پریس شدہ کپڑوں کو آئرن سے پریس کر رہی تھی۔ اُس نے گھر کی ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر چمکا اور سجا رکھا تھا۔
اِتی کو اُس کی خدمت گذاری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُس کے لئے اُس نے ایرا سے کبھی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ اُسے منع بھی کیا تھا تب بھی وہ باز نہیں آتی تھی۔ جو اچھا سمجھتی تھی اپنے

آپ کر دیتی تھی۔ اُس کی ایسی لگن دیکھ کر اُس کا دل پسیج جاتا تھا۔ ایسا کام تو گھر کی خادمائیں کرتی ہیں یا پھر بیوی۔ جس لڑکی کے ساتھ اُس کا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ اُسے وہ اپنی خدمت کا حق کیوں دے؟ کہیں ایسا تو نہیں، اس طرح خدمت کر کر کے وہ دھیرے دھیرے اُس کے دل پر قبضہ کر لینے کا خواب دیکھ رہی ہو! لیکن وہ اُسے اس طرح بالکل نہیں چاہتا ہے۔ اُسے اس نظر سے بھی نہیں دیکھتا ہے۔ وہ ایک جوان عورت ضرور ہے۔ اُس کے گھر میں بھی رہتی ہے۔ لیکن یہ تو حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ایسا ہو رہا ہے۔ اپنے آپ ہو رہا ہے اور وہ اُسے بالکل جانے کے لئے بھی نہیں کہہ سکتا۔

اِتی نے اُس کے ہاتھ سے پریس لے لی۔ وہ خود ہی اپنے کپڑے پریس کرنے لگا۔ جو کپڑے پریس ہو چکے تھے۔ اُنہیں ایرا ہینگروں میں ڈال کر وارڈروب میں لٹکا آئی۔ پھر اُس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ دونوں میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ایرا نے آج حسب معمول بہت اچھا کھانا بنایا تھا۔ چکن کے تکّے اُس نے اسقدر لذیذ بنائے تھے کہ وہ اپنی ساری پریشانی بھول گیا۔ ایرا مدھوک اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اُسے کھانا پسند آیا کہ نہیں۔ ایسی ہر عورت کی طرح جو اپنے مرد کے لئے بڑی محنت سے کھانا بناتی ہے اور اُس کی طرف خاموش داد طلب نظروں سے بھی دیکھتی رہتی ہے۔

اِتی نے ایک دوبارہ اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا جن میں ستائش ضرور تھی۔ لیکن اُس نے تعریف نہیں کی تو بھی ایرا کو مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ آج سارا کھانا ختم ہو گیا تھا۔

جب اِتی کھانا کھا کر ٹہلنے کے لئے باہر نکلا تو ایرا بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ ایسا اُس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اِتی نہ تو حیران ہوا نہ ہی اُس نے اُسے منع کیا۔ وہ دو رویہ پیڑوں سے بھری ہوئی سڑک کے ایک فٹ پاتھ پر دُور تک خاموشی سے چلتے چلے گئے۔ پھر اُسی طرح خاموشی سے واپس بھی آ گئے۔ راستے میں کسی نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ اِتی نے ایک بار بھی اُس کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ لیکن وہ اُس کی موجودگی سے غافل نہیں تھا۔ لیکن وہ بڑی حیرت سے دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ یہ دو سال کا عرصہ کتنی جلدی بیت گیا ہے۔ اُسے اُس کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ اور وہ من ہی من میں بہت دُکھی ہو رہا تھا۔

وہ کپڑے بدل کر اپنے بستر پر لیٹنے کے لئے بیٹھا تو ایرا ڈرائنگ روم میں جا کر سونے سے پہلے اُسی کمرے میں آ گئی۔ اُس کے قریب میز پہ رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اُٹھا کر بولی ــــــ

"سر، ایک سگریٹ لے لوں؟"

اِتی نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی طرف نگاہ بھی نہ اُٹھائی۔ ایرا نے سگریٹ لے کر اپنے ہونٹوں میں دبا لی۔ وہیں کھڑے کھڑے اسے سلگایا اور "سر تھینک یو" کہہ کر چلی گئی۔ اِتی نے

اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اُس کی فگر بہت ہی متناسب تھی۔ پُرکشش بھی۔ چوڑے کندھے اور
بھرے بھرے کولہے۔ اور اُن کے درمیان پتلی، نازک سی کمر۔ اُس کے بال بھی خاصے دلکش
تھے۔ انہیں وہ باقاعدگی سے شیمپو سے دھوتی اور سُکھاتی تھی۔ اُس نے اُسے ایسا کرتے
ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ سریندر کی منگیتر دیشی اور اپرا میں بس اُنیس بیس ہی کا فرق تھا۔
اپرا کا چہرہ ذرا سا اور دلکش ہوتا تو دیشی کی جگہ لے چکی ہوتی۔

اُس نے پنکی کا بھی تصوّر کیا۔ وہ اُسے سب سے زیادہ حسین اور دلکش نظر آئی۔ دنیا
کی ہر عورت سے۔ اُس کے رویوں میں بھی ایک عجیب سا جادو تھا۔ کبھی شوخ و شنگ، کبھی تیز و
طرار، کبھی ہنستی ہوئی اور کبھی کبھی سنجیدہ۔ بے حد سنجیدہ! وہ کوئی ضد پکڑ لیتی اور بحث کرنے
پر اُتر آتی تو اور زیادہ خوبصورت نظر آنے لگتی تھی۔ اُسے منانے کے لئے بڑے صبر
کی ضرورت تھی۔ وہ ایسی لڑکیوں میں سے تھی جو ضرورت سے زیادہ خوشامد پسند ہوتی ہیں۔
وہ اُس کی خوشامد کر سکتا تھا اور اُس کی برہمی دُور کرنے کے لئے ایک عمر صرف کر سکتا تھا۔
پھر اچانک اُس نے سوچنا بند کر دیا۔ اُٹھ کر دروازہ بند کیا۔ لائٹ آف کی اور سو گیا۔

۲۵
پچیس

پنکی قریباً دو گھنٹے سے اپنے پروفیسر گرجا شنکر باجپائی کے گھر پہ ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اُس کے گائیڈ اُسے یہ کتاب پڑھنے کے لئے دے کر خود ایک ضروری کام سے یونیورسٹی چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ اُسے کچھ نوٹس بھی لکھوا گئے تھے جو قدیم ہندوستانی موسیقی کے ثقافتی تصورات کو سمجھنے میں مدد دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ موسیقی کی تاریخ پر دو کتابیں یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں جن میں سے ایک تو او۔ سی۔ گنگولی کی ہے۔ جس میں انہوں نے راگوں اور راگنیوں پر طویل بحث کی ہے۔ یہ ۱۹۳۵ء میں چھپی تھی۔ دوسری کتاب بھی اسی موضوع پر لکھی گئی ہے جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

پروفیسر باجپئی کے پاس رشید کی تصنیف "راگنی کے تصور کا ارتقا" اُردو زبان میں تھی۔ پنکی اُردو نہیں جانتی تھی جبکہ پروفیسر باجپئی اُردو، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ تھوڑی بہت شُدھ بُدھ اُنہیں پالی زبان اور اُس دور کی اپ بھرنش زبانوں کی بھی تھی۔ پنکی کو یہ سوچ کر افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے اُردو زبان کیوں نہیں پڑھی۔ ریسرچ اسکالر کو کئی زبانیں آتی ہوں تو اُس کے کام میں جان پڑ جاتی ہے۔ وہ پورے وثوق سے ماہرین کے حوالے دے سکتا ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے اُردو کتاب کے صفحات کو دیکھتی اور چھوتی رہی اور اس طرح محسوس کرتی رہی جیسے اُن چھپے ہوئے الفاظ کے پیچھے صدیوں پُرانے حقائق اُس کا لمس پاکر ہی بیدار ہو جائیں گے اور اُس پر منکشف ہونے لگیں گے۔ جو زبانیں وہ جانتی تھی انگریزی اور ہندی —— اُن کے بارے میں اُس کا تجربہ یہی تھا۔ علم سے بھرا ہوا ہر لفظ ایک شخصیت ہوتا ہے۔ انسانی شخصیت اور لفظ کی شخصیت میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اُس نے اپنے پروفیسر کی

شخصیت میں بھی علم کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دیکھا تھا۔ یا وہ خود علم کا ایک ایسا پہاڑ تھا جس کے قریب ہوتے ہی اُس پر ایک ہیبت اور جادو سا اثر انداز ہونے لگتا تھا۔ اُس پہاڑ کے اندر کئی گپھائیں تھیں جو اپنے آپ وا ہوتی چلی جاتی تھیں۔

پنکی نے اُن نوٹس کو پھر پڑھنا شروع کیا جو پروفیسر باجپائی اُسے لکھا گئے تھے۔

"ازمنۂ وسطیٰ کے لوگوں کے خیالات نے اکثر اساطیری تصوّرات کا سہارا لیا ہے۔ موسیقی کے ضمن میں کہا جاتا ہے کہ شِو جی کے پانچ مُنہ تھے اور ہر مُنہ سے ایک ایک راگ برآمد ہوا۔ چھٹا راگ اُن کی بیوی کے مُنہ سے برآمد ہوا۔ یہ تصوّر راگ اور راگنیوں کے رشتوں پر خاتم سلیمانی بن گیا۔ جونہی بوتل کے منہ سے اُس خاتم سلیمانی کو ہٹایا جاتا ہے تو اس میں سے ایک جن برآمد ہوتا ہے جو بوتل پانے والے ماہی گیر کو نابود کرنے پر تل جاتا ہے ہندوستانی لوگ روایتوں میں ایسی ہی خاتم سلیمانی والی کئی بوتلیں ہیں جن کے منہ ایسی ہی اساطیری مُہروں سے بند ہیں۔ جب کسی فکر کا نظام آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اُس کی بکھری ہوئی غیر مربوط روایات اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں —— رامائن، مہابھارت، برہا دیش، پنچ تنتر اور سنگیت مکرند، . . . سے پہلے شاید یہ حادثہ پیش آیا ہو۔

ہندوستانی ثقافت کی یہ عجیب سرشت ہے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو جانے والی روایات کو بلیغ کہانیوں، کہاوتوں، اعداد اور سوال و جواب کے طور پر جیسے موسیقی کی ابتداء کے بارے میں شِو اور نارد کے درمیان میں ملتے ہیں۔ محفوظ کرنے کا فن جانتی ہے۔ یہ ہُنر صرف ہند و عالموں کو آتا ہے۔ غالباً راگ راگنیوں کے بارے میں بہترین کتاب "سنگیت مکرند" ہے۔ اس میں کئی جگہوں پر سہو کا سرزد ہونا یا اغلاط کا در آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تنقیص کے کئی مراحل سے گذری ہے۔ جس کی ذمّہ داری کاتبوں کے سر ہے۔ اس پردہ غیر ذمّہ دارانہ روایات ہیں جو مقتدر اور معتبر اشخاص کے درمیان گفت گو پر مبنی ہیں۔ اور سب سے آخر میں لیکن چودھویں صدی کے بعد راگوں اور راگنیوں کے وہ شاعرانہ اور پُراسرار خاکے ہیں۔ جن پر نظر ڈالتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اصل خیال تو زیریں میں چلا

گیا اور شاعروں نے ہر چیز جو اُن کے ہاتھ آئی تصورات کی آگ میں
ڈال کر اس کو بھڑکائے رکھا۔ مصوروں نے راگوں اور راگنیوں کی
مختلف تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ ہندو صوفیوں نے راگوں اور
راگنیوں کو الوہی مناصب پر فائز کر کے اُن کی شان میں غنائی تالیفات
تیار کرنا شروع کر دیں۔ یہ چیزیں آج بھی ہندوستان کے غنائی ادب
اور مصوری کے عجائبات میں شمار ہوتی ہیں لیکن یہ صرف نظروں کو بھانے
اور دل خوش کرنے والی تخیل آرائی یا قرطاس پر خیالی صورت
آرائی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُن کی غنائی اہمیت منفرد ہے۔"

پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سن کر پنکی دروازے پر چلی گئی۔ پروفیسر باجپئی مسکراتے اور معذرت کرتے ہوئے آئے۔ اُس کے پاس آتے ہی انہوں نے اُس کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا، یہ کہتے ہوئے "گرونا، مجھے معاف کر دینا۔ مجھے لوٹنے میں واقعی بہت دیر ہو گئی۔ لیکن تمہارے لئے لائبریری سے اتنی ساری کتابیں ڈھونڈ کر لے آیا ہوں۔"

اُن کے دوسرے بغل میں پانچ موٹی موٹی پرانی کتابیں تھیں۔ جنہیں اُس نے فوراً دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لیا اور صوفے پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ ان میں تین کتابیں تو ایسی تھیں جن کی تلاش میں اُسے کلکتہ اور بمبئی بھی جانا پڑتا تو وہ ایسا ضرور کرتی۔ ان کا مطالعہ کئے بغیر وہ اپنی ریسرچ کو آگے بڑھا ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے پروفیسر باجپئی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے۔ سر اُٹھایا تو اُسے اُس نے اپنی پشت پر صوفے پر دونوں بازو ٹکا کر اُس پر جھکا ہوا پایا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی مہربان گمبھیر آواز میں بولے —— "کہو، کیسی لگیں یہ کتابیں؟"

وہ ہڑبڑا کر اُٹھنے لگی تو پروفیسر باجپائی نے اُس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اُسے بٹھا دیا —— میں جاننا چاہتا تھا، ہیں نا بڑے کام کی؟"

"سر، میں تو آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہوں۔ آپ نہ ہوتے تو میں اپنا کام کبھی شروع ہی نہیں کر پاتی!"

"بس بس! میرا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ بات اپنے من سے نکال دو۔ یہ تمہاری اپنی لیاقت ہے اور تمہارا اپنا تجسس کہ میں تمہارے لئے کتابیں اور حوالے تلاش کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ میری رہنمائی میں کتنے ذہین اور محنتی اسکالر اپنی اپنی ریسرچ مکمل کر چکے ہیں۔ لیکن تم اُن سب سے آگے ہو۔ صدیوں پہلے کی ہندوستانی سنسکرتی میں جھانکنا اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ بہت لمبا فاصلہ ہے جو سمے کے گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے جب تمہارا تھیسس مکمل ہو جائے گا تو علم و ادب کی دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ آنے

والے ریسرچرز تم ہی سے روشنی حاصل کرکے آگے بڑھیں گے۔"
یہ کہتے کہتے وہ اُس کے پاس صوفے پر آبیٹھا۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔
"بعض ذہین ریسرچ اسکالر آدھے پروفیسر تو ہوتے ہی ہیں۔ وہ اپنے گائیڈ سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ تمہارے بارے میں میری بھی رائے ہے۔"
پنکی اُس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پروفیسر باجپئی کی شخصیت کی کی ساری شفقت، نرمی، وجاہت اور ذہانت اور کشش اُن کی آنکھوں میں براجمان ہوگئی تھی۔ اُس نے اُس سے پہلے بھی کئی بار بعض لمحوں میں اسی طرح اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی طرف مسرور ہو کر دیکھا تھا۔ اُس کا ایسا لمس پا کر اُس نے خود کو پگھلتا ہوا سا محسوس کیا تھا۔ اُس کے لمس میں اُسے بے پناہ گرمی محسوس ہونے لگتی تھی۔ جیسے اُس کے اندر کوئی آگ جل رہی ہو جس کا اظہار وہ الفاظ سے نہیں بلکہ اُسے ذرا سا چھو کر ہی کر سکتا تھا یا اُس کی آنکھوں میں اُتر کر۔
پروفیسر باجپئی نے کبھی کبھی اچانک اُس کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا تھا تو پنکی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکی کہ وہ اُس کے بالوں کی نرمی کو اپنے اندر اُتار رہا ہے۔ کیونکہ اُس کا ہاتھ اُس کے سر پر کچھ زیادہ دیر تک ہی ٹکا رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی اُس نے اُس کے بالوں کو ہاتھ میں لے کر اُن کی تعریف بھی کر دی تھی۔ اس طرح کی تعریف سے وہ خوش ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے رُوکھا سا منہ بنا کر نظر انداز نہیں کیا تھا۔
اب جب پروفیسر باجپائی نے اُس کی مُٹھی کھول کر کہا، "لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں ذرا!"
تو اُس نے خوش ہو کر پوچھا —— "سر، آپ ہاتھ دیکھنا جانتے ہیں؟"
"تھوڑا تھوڑا۔" اُس نے اُس کے ہاتھ کی ریکھاؤں کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
پہلے اُس نے ایک ایک ریکھا پر —— اپنی مضبوط و گرم انگشت شہادت پھیری۔ پھر اپنے رومال سے ان ریکھاؤں میں بھری ہوئی خیالی میل کو پونچھا۔ اور پھر اُس کے ہاتھ پر اپنا بڑا سا ہاتھ پھیلا کر بولا —— "تمہاری انٹلکچوئل ریکھا بہت صاف ہے۔ تم جذباتی بھی بہت زیادہ ہو۔"
پنکی کا ہاتھ اُس نے کافی دیر تک نہیں چھوڑا لیکن اُس کی گرفت نرم تھی۔ جس سے شفقت اور محبت دونوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اُن لوگوں میں سے ہرگز نہیں تھا جو ضرورت مند اسٹوڈنٹس کو دبوچ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ واقعی محبت کا اظہار تھا تو بے حد شائستہ تھا اور اپنی حدود کے اندر رہی تھا۔
پنکی نے دھیرے سے اپنا ہاتھ کھینچ کر کہا —— "سر، آپ کے لئے کافی بنا لاؤں!"
"صرف میرے لئے کیوں؟ تم بھی تو میرا ساتھ دو گی؟"
وہ ہنس کر صوفے سے اُٹھ گئی۔

"میں بھی پی لوں گی، سر!"

کچن جاکر اُس نے پانی اُبلنے کے لئے گیس کے چولہے پر چڑھا دیا۔ یہاں کھڑے ہو کر اُس نے کتنی بار ان کے لئے کافی بنائی ہے۔ ناشتہ بھی۔ وہ جو کچھ بنا کر پیش کر دیتی ہے اُسے پروفیسر باجپئی خوشی خوشی قبول کر لیتے ہیں اور اس طرح مطمئن دکھائی دیتے ہیں جیسے اس طرح کے کاموں کی ذمہ داری صرف وہی سنبھال سکتی ہے۔

گذشتہ بیس برس سے وہ تنہا رہ رہے ہیں۔ جب سے ان کی بیوی کا انتقال ہوا ہے کوئی دوسری عورت ان کی زندگی میں نہیں آئی ہے۔ وہ سمجھتی تھی وہ اپنے تحقیقی اور تعلیمی کاموں میں اس قدر غرق رہتے ہیں کہ اُنہیں کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ یونیورسٹی میں بے حد مقبول و ہر دلعزیز ہیں۔ اُن کے حلقۂ احباب میں کئی مرد و عورتیں ہیں۔ یونیورسٹی اور سرکاری دفتروں کی سطحوں پر کئی ایسی تعلیم یافتہ عورتیں ہیں جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی خاصی بے تکلفی ہے لیکن ان کے بارے میں کبھی کوئی اسکینڈل سُننے میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے ابھی تک کوئی بھی انہیں ذہنی طور پر متاثر نہ کر سکا ہو۔ یا وہ اس قدر "ریزرو" رہتے ہوں کہ کسی کو ان کے قریب آنے کی ہمت ہی نہ ہو سکی ہو!

جب پنکی کچن میں ہوتی تھی تو کبھی کبھی پروفیسر باجپئی کوئی بات بتانے کے لئے چلے آتے تھے۔ کبھی کبھی یونہی جھانکنے کے لئے بھی۔ اُسے دیکھ کر مُسکرا دیتے تھے اور پھر لوٹ جاتے تھے۔ ساٹھ سال کا ایک باوقار اور عزت دار شخص کوئی ناشائستہ حرکت کرنے کی جرأت کیونکر کر سکتا ہے؟ اس کیلئے اپنے آپ کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ اتنا تو پنکی نے احساس کر لیا تھا کہ انہیں اب ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ جو کچھ وہ سمجھ سکی ہے وہ سراسر غلط نہیں ہے۔ لیکن پروفیسر باجپائی اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لا سکے گا۔ جب تک وہ خود اس کے لئے اُنہیں حوصلہ نہ دے۔

لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ بھلے ہی وہ اپنے منگیتر محبوب اِنّی سے سخت ناراض ہے اور اُس نے اِنّی سے اب کبھی نہ ملنے کا فیصلہ کر رکھا ہے لیکن وہ اتنی "چیپ" بھی ہرگز نہیں ہے کہ ایک مرد سے مایوس ہو کر وہ دوسرے مرد کی گود میں جاکر بیٹھ جائے۔

جب وہ کافی کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو پروفیسر باجپائی صوفے پر بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ واقعی سو گیا تھا یا سونے کا محض بہانہ —— کر رہا تھا کہ پنکی خود آکر اُسے جگا دے۔!

اُس نے کوئی آہٹ کئے بغیر کافی ایک تپائی پر رکھ دی۔ پروفیسر باجپائی کے سامنے خاموش کھڑی ہو گئی۔ کئی لمحوں تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی سچ مچ آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے بہت تھک کر لوٹا تھا۔ اُس کے چہرے پر ترشی ہوئی سفید داڑھی کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے

سر کے گھنے بال ابھی تک نہیں جھڑے تھے۔ وہ کُرتے پاجامے میں ہو یا شرٹ اور پینٹ میں، وہ ہر لباس میں دلکش نظر آتا ہے ایسا خوبصورت تو اس کا اپنا باپ بھی نہیں ہے!
پنکی اُس کی نیند میں خلل ڈالنے کے بجائے اُس کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ جب تک سونا چاہتا ہے سوتا رہے۔ وہ ایک کتاب اُٹھا کر بڑے اطمینان سے پڑھنے لگی۔

چھبیس
۲۶

اندر ملہوترا صبح اپنے آفس میں پہنچا تو اُسے اُس کے باس نے فوراً طلب کر لیا۔ اُس کا خیال تھا اُسے گذشتہ ہفتے کی اچھی کارگذاری کے لئے ایک توصیفی خط دیا جائے گا۔ جس کا وہ بجا طور پر حقدار تھا۔ اُس نے اناج سے سارے خالی گودام بھروا دیئے تھے۔ جس سے شہر کے بیوپاری بھی خوش ہو گئے تھے کیونکہ انہیں اب بلا تاخیر اناج سپلائی کیا جا رہا تھا۔ لیکن اُس کے باس فاروقی نے اُسے اپنے سامنے بٹھا کر اپرا مدھوک کے ساتھ اُس کے تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ اپرا مدھوک جو اُن کے آفس میں اسٹینو تھی آوارگی کی زندگی گذار رہی تھی۔ اور وہ اسی دفتر کے ایک افسر اندر ملہوترا کے فلیٹ میں مقیم تھی۔

اِندر نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ موقع ملنے پر اپنے باس کے ساتھ اس معاملے میں مشورہ حاصل کرے۔ آج اُس نے شروع سے لے کر اب تک کے سارے واقعات اُسے کہہ سنائے تو فاروقی صاحب متاثر تو یقیناً ہوئے اور انہوں نے یہ بھی کہا "یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں مجھے دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن اس سے آفس کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ اُس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لو یا اُسے اپنے یہاں سے ہٹا دو۔ ایک افسر کو یہ بات کسی طرح زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی ہی اسٹینو کو اپنے گھر میں ڈال لے۔"

اِندر اُسے یقین نہیں دلا سکا کہ اُس کا اپرا کے ساتھ جسمانی رشتہ نہیں ہے۔ اور "دو انسان ـــــ مرد اور عورت اس قسم کے تعلقات کے بغیر بھی ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"سر جیسے ہی اپرا مدھوک کی کہیں شادی ہو جائے گی۔ وہ اپنے آپ میرے

یہاں سے چلی جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر چلا آیا۔ اُس روز اُس نے اپرا مدھوک کو ایک بار بھی اپنے کیبن میں نہیں بُلایا۔ اُسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ جب وہ اُس کے پاس ڈکٹیشن لینے کے لئے آتی ہے یا وہ آفس میں داخل ہوتا ہے تو دفتر کے لوگوں کی نظریں دونوں کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا! فاروقی صاحب کی ہمدردانہ گفتگو بھی دراصل ایک قسم کا انتباہ تھا۔

اُس روز سہ پہر کے بعد اچانک چپراسی ایک ملاقاتی کا وِزٹنگ کارڈ لے آیا۔ کارڈ پر سریندر کپور کا چھپا ہوا نام دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ خوشی بھی ہوا کہ وہ اُس کے خط کے جواب میں خود چلا آیا تھا۔ اُس کے آنے سے اُس کی مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ وہ اپنی بہن پنکی کو راہ راست پر لا سکتا ہے۔

اُسے اِتی نے فوراً اندر بلوا لیا۔ اُسے گلے سے لگا کر کہا۔

"یار، بڑے وقت پر آئے ہو۔ مجھے اِس وقت تمہاری ہی ضرورت تھی۔ تم مجھے فوراً پنکی کے پاس لے چلو تو میں اُس سے معافی مانگ لوں گا۔ وہ کئی ہفتوں سے مجھے نہیں ملی ہے۔ اُس کے بغیر میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

لیکن سریندر کپور خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پُتی ہوئی تھی۔ وہ اِتی کے طرح جذباتی اور مسرور ہرگز نہیں نظر آ رہا تھا۔ اِتی اُسے اِس طرح خاموش پا کر حیرت میں پڑ گیا۔

سریندر نے اُسے بتایا، "میری بہن کتنی ضدی ہے، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اُس کی یہ عادت اُس کے بچپن سے ہی بنی ہوئی ہے۔ ہم سب کے لاڈ پیار نے اُسے ایسا بنا دیا ہے۔ اُس نے اپنی تعلیم کے بارے میں بھی کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ اپنے سبجکٹس کا انتخاب بھی وہ ہمیشہ خود کرتی رہی۔ اُسے ایک طرح 'سیلف میڈ' لڑکی کہا جا سکتا ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لئے پوری طرح آزاد اور خود مختار! تمہارا خط ملا تو میں نے اُسے لمبے لمبے دو خط لکھے۔ لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے ڈیڈی کو بھی لکھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا، وہ ہماری نہیں سنتی ہے۔ تب مجھے مجبوراً یہاں آنا پڑا۔ کل سے ہم گھر والے اُسے سمجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن اُس نے ہماری کوئی دلیل نہیں سُنی۔ وہ ایک عجیب اُلٹی کھوپڑی ہے۔ اُسے وشواس نہیں ہوا کہ تم اُس کے لئے ہمیشہ وفادار ہو گے۔ آج معلوم ہوا ہے کہ اُس نے کسی کو بتائے بغیر اپنی یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے اور پنکی کے رشتے کا ایک خوشگوار چیپٹر اچانک ختم ہو گیا۔"

"اوہ۔ ہاؤ ٹریجک!!" اِتی کو ایک دھکّا سا لگا۔ وہ بالکل بھونچکا بیٹھا رہ گیا۔ اگرچہ اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ پنکی اُسے تج کر ایک بوڑھے پروفیسر کے ساتھ شادی کر سکتی ہے جسے وہ مل چکا تھا۔ لیکن سریندر کا متاسف چہرہ دیکھ کر اُسے یقین کرنا ہی پڑا۔

سریندر کے چلے جانے کے بعد اُسے ریجنل منیجر کی ایک چھٹی ملی۔ اس نے فون پر دہلی

سے فوری حکم حاصل کر کے اُس کی ٹرانسفر احمد آباد کر دی تھی۔ اُسے کل ہی چارج دے کر یہاں سے چلے جانا ہوگا۔

اُس نے بے شدید تھکن کا احساس کیا۔ وہ بے حد مضمحل، دل شکستہ اور اُداس ہوگیا۔ اپنے فلیٹ پر جا کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اب کیا کرے! اُس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اُس کی اس شہر سے ٹرانسفر کر دی گئی ہے۔ اب وہ یہاں رہ کر کیا کرے گا؟ جس شہر میں اُس نے پتکی سے بے پناہ عشق کیا۔ مستقبل کے سنہرے خواب دیکھے۔ وہ سب اب ختم ہوگیا ہے تو وہ یہاں کیوں رہے؟

اپرا ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ جب وہ دفتر سے نکل رہا تھا تو وہ وہاں بیٹھی کام کر رہی تھی۔

اچانک اُس نے اپرا مدھوک کی چاپ سُنی۔ وہ اندر آ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ پھر وہاں سے نکل کر کچن میں گئی۔ چولہے پر گرم پانی چڑھا کر اُس نے اُس کے کمرے میں آ کر جھانکا اور پوچھا۔

"سر کافی بنا دوں؟"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی سائیڈ ٹیبل پر سگریٹ کی ڈبیا بھی اُٹھانی چاہی۔ معاً اِن کے لئے اُس کی موجودگی ناقابل برداشت ہوگئی۔ اُس نے اپرا کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اور بستر سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے اُس کے منہ پر دائیں بائیں بے تحاشہ کئی تھپڑ مارے اور پھر ہانپتے ہوئے چلایا ——

"دُور ہوجا میری نظروں سے!!"

اپرا مدھوک کے لئے یہ سب اسقدر اچانک تھا کہ وہ گھبرا گئی۔ کچھ سمجھ ہی نہ سکی کہ اُسے کیا ہوگیا ہے! وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اُس کی آواز اُس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اُس نے اپنا بچاؤ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی —— سیدھی کھڑی رہی۔ اُس کی طرف بڑی بڑی حیران آنکھوں سے ایک ٹک دیکھتی ہوئی۔

"تم آخر کیا چاہتی ہو؟ بتاؤ!"

وہ اُسی طرح ہانپتا رہا اور وہ خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ سیدھے اُس کی آنکھوں میں۔ وہ حیران بھی ہوئی، وہ اس قسم کی بات آج کیوں پوچھ رہا ہے۔ اور آج وہ بوکھلایا ہوا کیوں ہے؟

اُسے چپ سادھے دیکھ کر اِن کو اور زیادہ غصّہ آگیا۔ وہ چیخ کر بولا۔

"بولتی کیوں نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟"

اُس نے پھر بھی زبان نہیں کھولی تو اُس نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پکڑ کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اور پھر اچانک اُس کی ساڑی نوچ ڈالی۔ اُس کا بلاؤز پھاڑ دیا۔ وہ شرم کے مارے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ وہ اُس کے اوپر جھکا ہوا کہتا رہا —— "تم مجھ سے کیا چاہتی ہو، میں جانتا ہوں۔ لیکن میں —— لیکن میں تمہاری خواہش پوری نہیں کروں گا۔

تم اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ !"
یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ باہر نکل کر بالکونی کی ریلنگ پر کھڑا ہو گیا۔ حدِ نظر تک سڑکوں اور مکانوں کی بے شمار روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ لیکن اُن کے لئے اُس کے دل میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اُس کے لئے اس شہر کی ساری خوبصورتی بے کار ہو گئی تھی۔ وہ ہر طرف بڑی بےرحمی سے دیکھ رہا تھا۔ بے تعلقی سے

اُسے وہاں کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی۔ اُس نے اچانک اپرا کی چاپ سُنی۔ لیکن اُس نے اُس کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اُس کے پاس سے گذر کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔ اُسی کی وجہ سے وہ کتنی ساری خوشیوں سے محروم ہو گیا تھا۔

سیمانت پرکاشن
۹۲۴۔ کوچہ رو ہیلا۔ تراہا بیرام
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲